تخلیقاتِ پطرس

پطرس بخاری

ترتیب

محمد احسن فاروقی

پطرس بحیثیت مزاح نگار

لکھنؤ یونیورسٹی میں داخل ہوئے ایک مہینہ گزرا تھا۔ کہ ایک دن لائبریری میں مشفق وصی رضا نے میرے ہاتھ میں ڈکنس کی ایک ناول دیکھ کر کہا: "اگر سچ مچ ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ جانا چاہتے ہو تو مضامین پطرس پڑھو۔" میں سن کر چپ ہو رہا۔ میں یونیورسٹی میں انگریزی ادب کی علویت کا اور اردو ادب کی اتنی ہی پستی کا احساس لے کر داخل ہوا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ میں اگر صاحب ذوق تھا نہیں تو اس قدر بنتا ضرور تھا کہ اعلیٰ ترین تصانیف کے علاوہ ہر معمولی تصنیف سے نفرت کا اظہار کرنا فرض سمجھتا تھا۔ پھر اس وقت میری ایک اور بھی بڑی خاص رائے تھی۔ جو میرے جاننے والوں میں کچھ مقبول سی ہو چکی تھی۔ وہ یہ کہ جسمانی امراض بھی ادبی تاثرات سے دور کیے جا سکتے ہیں اور چونکہ پیٹ کی خرابی اس وقت ایک عام مرض تھا جس میں میں بھی مبتلا تھا۔ اس لئے اپنے نظریہ کی مثال میں یہ کہا کرتا تھا کہ پیٹ خراب ہو تو ڈکنس کی ناولیں پڑھو پیٹ ٹھیک ہو جائے گا۔ چنانچہ میرے ہاتھ میں ڈکنس کی ناول دیکھ کر وصی رضا نے یہی تصور کیا تھا کہ جیسے میں دوا کی شیشی لئے جا رہا ہوں اور جیسے لوگ انگریزی دوا کی شیشی ہاتھ میں دیکھ کر ڈاکٹر کا نام پوچھ کر اکثر کہتے ہیں "بھئی کیا ڈاکٹری دوا لئے پھرتے ہو حکیم کا علاج کراؤ۔ جلد فائدہ ہوگا۔" اسی طرح وصی رضا نے بھی ڈکنس کی بجائے پطرس کے علاج کا مشورہ دیا۔ مگر جیسے جدید لوگ حکیم کے علاج کا نام آتے ہی صاف ٹال دیتے ہیں اور مشورہ دینے والے کو نیچی نگاہ سے دیکھتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ ویسے ہی میں نے وصی رضا کو دیکھا اور اپنا رستہ لیا۔

پطرس نام عجیب تھا۔ کوئی عیسائی ہے؟ نہیں عیسائی عبرانی نام سے عربی نام پر اتر آنے کی ذات برداشت نہیں کر سکتا۔ کوئی لونڈا لاڈی ہوگا جس نے یہ تخلص رکھ لیا اور پھکڑ بازی کرتا ہوگا۔ وصی رضا اردو کے لکھنے والوں کو اچھالا کرتے تھے۔ بات یہ تھی کہ وہ اردو بہت زیادہ جانتے تھے مگر انگریزی میں تھے کورے اس لئے پطرس کو ڈکنس کی بجائے پیش کر کے ہم کو دھوکے میں ڈالنا چاہتے تھے۔

مگر کچھ ہی عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ پطرس کوئی لونڈا لاڈی نہیں جس استاد نے ہمیں انگریزی ہیومر کو سمجھنا سکھایا تھا، وہ اور پطرس کیمبرج میں ساتھی تھے۔ پطرس اصل میں پروفیسر بخاری تھے۔ جو ہندوستان کے سب سے بہتر تعلیمی ادارے یعنی گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی ادب پڑھاتے تھے فوراً ہمیں یقین آگیا کہ وہ ضرور جانتے ہوں گے کہ ہیومر کیا چیز ہے مگر ان کا ہیومرسٹ ہونا ابھی تک شبہ میں تھا۔

مگر جادو وہ ہے جو سر چڑھ کے بولے۔ جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ہم مانیں چاہے نہ مانیں وہ سر پہ چڑھ ہی بیٹھے گا اور پھر ہم کو اسے ماننا ہی پڑے گا۔ ایک جادو اقبال تھا "شکوہ" "جواب شکوہ" پڑھتے ہی ہمارے سر پر ایسا سوار ہوا کہ قیامت کے دن بھی سوار ہی نظر آئے گا دوسرا جادو پطرس، اس کے سر پہ سوار ہونے کا قصہ سنئے۔

کوئی نصاب کی کتاب تھی اس میں "کتے" نظر آیا کتے ہمارے لئے بھی عجیب ہی جانور تھے ہمیں ان سے اس قدر ڈر لگا کرتا تھا کہ جس گلی میں داخل ہوتے تو پہلے دیکھ لیتے کہ دُور دُور تک کوئی کتا تو نظر نہیں آ رہا ہے اور اگر نظر آتا تو اس گلی میں کبھی قدم آگے نہ بڑھاتے ہمارے دوست اس بات پہ ہمارا مذاق اڑایا کرتے۔ ہمارے بزرگ ڈانٹا کرتے۔ کتے سے ڈر ہمارے اندر فطری تھا۔

پھر ہم نے اسٹیونس کی کتاب "ٹراولیز ود اے ڈنکی" پڑھی اس نے ایک جگہ کتوں سے

خوف کا پُرلطف ذکر کیا ہے۔ ہمیں بڑی تقویت ہوئی کہ ایک تو ساتھی ملا۔

اس پس منظر کو ساتھ لئے ہوئے جب میری نظر "کتے" اور اس کے پیچھے پطرس پر پڑی۔ تو کیا بتائیں کیا ہوا۔ فوراً کتاب لے کر بیٹھ گیا اور پڑھنے لگا ——

پہلے ہی جملے نے جادو مارا۔ "علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا۔ سلوتریوں سے دریافت کیا۔ خود سر کھپاتے رہے۔ لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کتوں کا فائدہ کیا ہے" اچھل کر دل بول اٹھا۔ قسم استاد کی ہیومر یہ ہے۔ "کہیں کوئی غلط نہ سمجھ لے ہیومر جملوں اور فقروں کی چیز نہیں ہے یہ ایک نقطۂ نظر، مزاج کے حقائق سے تصادم زندگی میں ایک مخصوص کیفیت کے احساس کا نام ہے۔ اس جملے میں ہیومر نہیں۔ اس سے ہیومر شروع ہو رہا ہے یہ جملہ ایک نئی نظر ایک نئی ہستی ایک نئی ادا ایک نئے عالم خیال ایک نئی بے ڈھنگی دنیا کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ یہ کتوں کے ایک نئے عجائب خانے کا رستہ بتا رہا ہے۔

دیکھئے یہ نئے "کتے" آ گئے۔ "یہ کتے کیا کرتے ہیں؟" وفادار جانور؟ "واہ کیا وفاداری ہے کہ شام کے سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لئے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے۔" "لیجئے یہ کتوں کا مشاعرہ گرم ہے" کم بخت بعض تو دو غزلے اور سہ غزلے لکھ کر لائے ہیں" ہنگامہ گرم ہے پطرس آرڈر آرڈر پکار رہا ہے۔ کچھ اثر نہیں مجبور ہو کر کہتا ہے۔ "اب ان سے کوئی پوچھے کہ میاں تمہیں ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا تو دریا کے کنارے کھلی ہوا میں جاکر طبع آزمائی کرتے یہ گھروں کے درمیان آکر سوتوں کو ستانا کونسی شرافت ہے؟" دیکھئے اور "کتے"، قومیت کے دلدادہ کتے۔ پتلون کوٹ کو دیکھ کر بھونکنے لگ جاتے ہیں۔ کیسے قوم پرست ہیں!

انگریزوں کے کتے۔ ان کی شائستگی دیکھئے۔ ایک نازک اور پاکیزہ آواز میں بخ بخ کر رہے ہیں۔ چوکیداری کی چوکیداری موسیقی کی موسیقی۔ اور ہمارے کتے: "بے تالے کہیں کے نہ موقع دیکھتے ہیں نہ وقت پہچانتے ہیں گلے بازی کئے جاتے ہیں۔"

ظاہر ہے کہ پطرس سے ان کے تعلقات کشیدہ ہی رہے ہیں۔ مگر مسٹر پطرس۔ با اخلاق انسان ہیں۔ طبعی شرافت ان پر غالب آ ہی جاتی ہے۔ ہم انہیں بزدل ہرگز نہ سمجھیں گے۔ ہاں ان کے حال سے بے حال ہو جانے پر ہماری نظر ہے۔ آیۃ الکرسی کی جگہ دعائے قنوت پڑھنے لگے ہیں۔ رات کے وقت تھیٹر سے واپس آ رہے ہیں۔ "اتنے میں ایک موڑ پر جو مڑے تو سامنے ایک بکری بندھی تھی۔ ذرا تصور ملاحظہ ہو، آنکھوں نے اسے بھی کتا دیکھا۔ ایک تو کتا اور پھر بکری کی جسامت کا۔ گویا بہت ہی کتا۔" بہت ہی کتا۔ بہت ہی کتا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ "بس ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چھڑی کی گردش دھیمی ہوتے ہوتے ایک نہایت ہی نامعقول زاویے پر ہوا میں کہیں ٹھہر گئی۔ سیٹی کی موسیقی بھی تھرتھرا کر خاموش ہو گئی۔ لیکن کیا مجال جو ہماری تھوتھنی کی مخروطی شکل میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ گویا ایک بے آواز سے ابھی تک نکل رہی ہے۔" طب کا مسئلہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اگر سردی کے موسم میں بھی پسینہ آ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں بعد میں پھر سوکھ جاتا ہے۔ ہا ہا ہا ہا۔ اف۔ اف۔ ہم نے بھی کچھ ایسا ہی محسوس کیا محسوس کیا ہے مگر اب اس پر ہنستے ہنستے لوٹے جا رہے ہیں۔ پطرس سچ مچ ہیومرسٹ ہے۔ پیدائشی ہیومرسٹ ہے۔

مگر وہ طبعاً محتاط ہے ورنہ کسی کتے نے اسے کاٹ لیا ہوتا اور آج اس کا مرثیہ چھپ رہا ہوتا۔ مگر ...... "جب تک کتے موجود ہیں اور بھونکنے پر مصر ہیں سمجھ لیجئے کہ ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔" ...... بھونکنا عجیب چیز ہے اس کے اصول نرالے ہیں۔ متعدی مرض ہے۔ ہر سن کے کتے کو لاحق۔ "دو دو تین تین تولے کے کتے بھی بھونکنے سے باز نہیں آتے" "اور پھر بھونکتے ہیں چلتی موٹر کے سامنے آ کر گویا اسے روک ہی تو لیں گے۔" ...... بھونکنا عجیب چیز ہے۔ پطرس کے تمام قویٰ کو معطل کر دیتا ہے۔ لیجئے بھونکنے کا ایک اور منظر۔ پہلا منظر مشاعرہ ہو چکا۔ اب ایک پورا خفیہ مجلسہ باہر سڑک پر آ کر تبلیغ کا کام شروع کر رہا ہے۔ پطرس سڑک پر ہے۔ "آپ کیسے ہوش ٹھکانے رہ سکتے ہیں؟ ...... بہرصورت کتوں کی یہ پرلے درجے کی ناانصافی میرے نزدیک ہمیشہ قابلِ نفرین رہی ہے۔" ...... پطرس کو غصہ آ گیا۔ پوری مجلس کا یوں متفقہ د

متحدہ طور پر یعنیہ زوری کرنا ایک کمینہ حرکت ہے" یہ الفاظ اس کے منہ سے نکل ہی گئے۔ آخر وہ ہوتی ہے مگر کسی کتے کی دل شکنی اسے منظور نہیں ...... "یہ مضمون کسی عزیز و محترم کتے کی موجودگی میں باآوازِ بلند نہ پڑھا جائے۔"

خیر۔ ذلیل کتوں کو چھوڑیئے۔ خدا ترس کتے دیکھئے مسکینی و عجز ملاحظہ ہو۔ سڑک کے بیچ و بیچ غور و فکر کے لئے لیٹا ہوا ہے۔ گاڑی کے بگل کوئی اثر نہیں کرتے کسی نے چابک مارا تو ایک گز پرے جا لیٹا۔ بالکل ایسی چھچھوری چیزوں کے لئے رستہ چھوڑ دینا فقیری کی شان کے خلاف سمجھتا ہے ...... "رات کے وقت اپنی دم کو تا بحدِ امکان سڑک پر پھیلا کر رکھتا ہے۔ اس سے محض خدا کے برگزیدہ بندوں کی آزمائش مقصود ہوتی ہے" ..... اگر ان کی دم پر کسی نے پاؤں رکھ دیا تو راتوں خواب میں بے شمار کتے پاؤں سے لپٹے نظر آئے۔

پطرس کے دل میں ان سے انتقام لینے کی آگ ہے اگر خدا سے بھونکنے اور کاٹنے کی طاقت عطا کر دے تو سب کتوں کو کسولی پہنچا دے۔ کاٹنا اور بھونکنا ... یہی دو طاقتیں ہیں ..... "انگریزی میں ایک مثل ہے کہ بھونکتے ہوئے کتے کاٹا نہیں کرتے" "یہ بجا سہی لیکن کون جانتا ہے کہ ایک بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند کر دے اور کاٹنا شروع کر دے۔" واہ۔ واہ۔ کیا بات کہی ہے اس کے بعد مضمون کو آگے نہ بڑھانا چاہیئے۔

یہ سب کیا ہوا۔ ایک مخصوص۔ پنے پڑھانے والی ہستی دکھائی دی۔ اس نے اپنا تئیں دکھایا۔ واللہ کیا آدمی ہے۔ ہمیں جیسا۔ یہ بالکل ہمارا ساتھی ہمزاد اور اس نے کتنے دکھ تے عجیب حالات کے کتے ...... دیکھئے وہ دروازے پر گلی میں کتے بھونک رہے ہیں۔ آس۔ آس۔ یہ کیا ہوا۔ یہ سب پطرس کے کتے ہو گئے۔ جو کتا دکھائی دیتا ہے وہ پطرس کا کتا ہے۔ ہم پطرس ... وہ ہمارا ... ہے۔ یہ جادو ہے۔ ہمارا نقطۂ نظر ہی بدل گیا۔ اسے ہیومر کہتے ہیں۔ اردو کا کوئی ... اس لفظ کے معنی نہیں ادا کر سکتا۔

اب سنئے کہ اس مضمون کو پڑھ کر ہمارا کیا حال ہوا..... ہمارے اندر سب سے بڑی بیماری یہ ہے کہ ہم پر کتابوں کا جنون سوار ہوا کرتا ہے اس کی شدت کا اندازہ یوں کیجئے کہ اگر کسی رات کو کسی کتاب کا جنون ہم پر سوار ہو تو ہم بازار جاکر کتابوں کی دوکان کے تالے توڑ کر کتاب نکال کر گھر لے آئیں گے اور بعیراس کو ختم کئے دم نہ لیں گے..... تو بس صاحب مضامین پطرس کا جنون ہم پر سوار ہوا فوراً بازار پہنچے اور ایسی جلدی کتاب لے کر واپس آئے کہ معلوم ہوتا تھا کہ کتاب چرا کر بھاگے ہیں۔

اب پطرس میری نگاہ میں یکتا ہیومرسٹ ـ بلکہ وحدہٗ لاشریک ہیومرسٹ۔ اور پھر ایک ہی جلوے میں ہم سودائی ہو چکے تھے۔ کتابوں کا سودا بہت اچھی چیز ہے اوپر سودا ہوا اور ادھر وصل میسر ہو گیا اتنی آسانی کسی اور عشق میں نہیں ہوتی۔ غرض ہم اور پطرس من تو شدم تو من شدی ہو گئے۔

دیباچہ شروع کیا۔ یہ کتاب ہمیں کیسے ملی؟ ایک مضمون تو مفت ملا۔ اتنا پطرس پر احسان ہوا۔ ½ احسان پطرس پر۔ باقی کتاب ہم نے چرائی؟ جس بے نیابی کے ساتھ اس کو لے کر ہم گھر آئے تھے۔ وہ محکمہ پولیس کے لحاظ سے چوری کے زمرے میں آتی ہے۔ چوری اور بھاگنا [illegible] ہیں تو ہم نے اگر پوری چوری نہیں تو ½ چوری ضرور کی۔ ہمارا پ ذوق دار [illegible] ضرور ٹھہرا ہے۔ مگر یہ کتاب تو ہم خرید کر لائے ہیں۔ اس لئے ہمیں اپنی حماقت کو حق بجانب [illegible] کرنا ضروری ہے۔

ہماری حماقت حق بجانب ہے۔ ہم حماقت کو حق بجانب یعنی حقیقت [illegible] ملا جلا دیکھ کر ہی تو اس کتاب پر عاشق ہوئے اسی کو تو ہیومر کہا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک ہیومر کی سب سے بہتر تعریف اتفاقاً ایک بڑے ہیومرسٹ کے قلم سے نکل گئی۔ یہ ہیومرسٹ تھیکرے ہے اور اس نے اپنی کتاب "انگلش ہیومرسٹز" میں سوفٹ " SWIFT " پر لکھتے لکھتے یہ فقرہ چھوڑ دیا۔

TRUTH TOPSY - TURVY; AT ONCE TRUE AND ABSURD

یہ بات وہی ہے حماقت کو حق بجانب ثابت کرنا، حق بجانب کو حماقت ثابت کرنا۔ پطرس پر اتفاق سے وہی کچھ کہہ گیا جو تھیکرے اتفاق ہی سے کہہ گیا۔ ہمیں یقین ہے کہ کوئی سچا مصنف

خود نہیں لکھا کرتا۔ قلم تو اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے مگر چلاتی اس کو کوئی روحانی چیز ہے اور یہ روحانی چیز اپنی موج خرام سے ایسے گل کتر جاتی ہے جن کا احساس مصنف کے شعور کو بھی بعد میں ہی شاید کبھی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہیومر کی روح جب پطرس کا قلم چلا رہی تھی تو اس نے حقیقت کو حق بجانب ثابت کرنے والا فقرہ کہہ دیا۔ یہ روح ہے۔ یونانی اصنام میں موس MOMUS کہتے ہیں یہی کرتی ہے۔ حقیقت اور حماقت کو اس طرح گڈ مڈ کرتی چلی جاتی ہے کہ نہ حقیقت کھلے اور نہ حماقت ثابت ہو۔ یہ روح ہمارے جھکڑ نگاروں سے کبھی چھو کر نہیں گزری ان کی حماقتوں کو پڑھیے ہنسی کی ایک لہر دوڑے گی۔ مگر ذرا غور کیجئے تو ان کی حماقت حماقت ہی رہ جائے گی۔ بالکل ناممکن، غلط بات۔ من گھڑت۔ لونڈوں کو ہنسانے کے لئے ٹھیک ہے۔ اس پر ہنستا بدمذاقی ہے مگر پطرس تو موس سے ہم کنار ہے اس کے خامے کی آواز نوائے موس ہے۔

اب بتایئے کہ پطرس کیا ہے؟ اتہ پتہ مل گیا۔ اس گھر کے کتے دیکھے اس کو کتے بناتے دیکھا۔ اسے خود ہنستے دیکھا اس کا دیباچہ پڑھا اب اس پہیلی کو بوجھنے میں کیا کسر ہے۔ ایک بات سمجھ میں آئی۔ یہ کہ پطرس جو کچھ بھی ہے مگر ہے دیکھنے کی چیز اور برتنے کی چیز شیکسپیئر کا پک PUCK اس کے کان میں کہہ رہا ہے اس کی روح کے کان میں کہہ رہا ہے O LORD WHAT FOOLS THESE MORTALS BE! اور اس کا قلم چل رہا ہے وہ مارٹل ہے اس کے چاروں طرف سب مارٹلز ہیں وہ فول ہے اور اس کے چاروں طرف سب فول ہیں۔ یہی دنیا ابھرتی آ رہی ہے۔

"ہاسٹل میں پڑھنا"، وہ طالب علم ہے اس کا مقصد حیات یہ ہے کہ ہاسٹل میں پڑھے اس کے گھر والوں کو دیکھئے۔ کھاتے پیتے مسلمان لوگ ہیں لڑکے کو تعلیم دلاتے ہیں مگر تعلیم کے مقصد اور تعلیمی اداروں کے حالات سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ صاحبزادے کے لئے تعلیم گاہ تفریح گاہ کے ہم معنے ہے۔ سب سے زیادہ تفریح ہاسٹل ہی میں رہ کر ہو سکتی ہے۔

اس لئے اس کی کوشش ہے کہ کوئی سال ایسا آجائے کہ ہوسٹل میں داخل ہوسکے اس لئے متواتر فیل ہی ہوتے رہنے میں ان کو دلچسپی ہے اور ہراں کے سرپرستوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ ہاسٹل کوئی بری جگہ ہے والدین کی نگاہ میں ہاسٹل کو علم و اخلاق کا اعلےٰ ترین مرکز ثابت کرنے کی کوششیں برابر مضحکہ خیز ہو ہو کر رہ جاتی ہیں۔ وہ جس جس طرح فیل ہوا ہے وہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ایسے بالکل ایسے کتنے لڑکے ہمارے ذہن میں ہیں ان سب کا وہ ذو اضعاف اقل مشترک ہے وہ ہمارے مشاہدے کی زبردست مضحکہ خیز حقیقت ہے۔

"سویرے جو کل آنکھ میری کھلی" وہی طالب علم ہے پڑھنے سے اس کی دلچسپی کا حال دیکھئے پڑھنا امتحان کے لئے ہے تیاری کے لئے سویرے اٹھنا ہے۔ لالہ جی اس کے پڑوسی مضحک حد تک مستعد اور منہمک ہیں۔ اس کو صبح جگانے کے سین اور اس کے جاگ کر سو جانے کے حالات وغیرہ کس طالب علم نے نہیں دیکھے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر طالب علم میں کچھ نہ کچھ ایسی باتیں ضرور ہوتی ہیں پطرس اس میں فرد ہے۔

ہماری مضحک تعلیمی جدوجہد کی تصویر پوری ہوگئی۔ پطرس نے اپنے تئیں الٹ پلٹ کر اور اپنے چاروں طرف کی دنیا کو الٹ پلٹ کر سب کچھ دکھا دیا اور خوب خوب ہنسایا۔

لیجئے خانگی زندگی کے حالات دیکھئے "اردو کی آخری کتاب" ماں کی مصیبت۔ میاں ایک عام بے ڈھنگا گھر ہے "میں ایک میاں ہوں" میاں بیوی کے درمیان تعلقات۔ میاں کے دوستوں پر بیوی کے اعتراضات۔ بیوی بھی عام ہی چیز ہے اس کا جدید تعلیم یافتہ فرمانبردار میاں ہے بیوی کے میکے جانے پر خوش ہے کہ ہر قسم کی آزادی ملے گی لیکن پھر بھی بیوی کے گھر میں نہ ہونے سے گھبرا کر اسے تار دے دیتا ہے۔ کیا موقعے سے بیوی گھر پہنچتی ہے۔ کمال ہے!

اب سیاسی زندگی کا کھیل دیکھئے "مرید پور کا پیر" لیڈر کیسے بنتا ہے اور کیسے بنایا جاتا ہے شروع میں ایک طرح بنایا جاتا ہے اب اسے لیڈر بنتے ہی بن پڑتی ہے۔ آخر میں تقریر کرتے ہیں اسے کیسا بنایا جاتا ہے اسے بھاگتے ہی بن پڑتی ہے واہ رے لیڈر اور لیڈری کی حقیقت ہو۔

کالجوں کو دیکھئے انکسار کے مجسمے علم کے مرقع پروفیسر پطرس کو دیکھئے اور ان کے شاگرد لال رشید کے اٹھنی وکس ندرانہ پیش کرنے پر غور کیجئے اور پھر ملک معظم وغیرہ ہم کے تحائف پر ان کی شہادت دیکھئے۔ لگے ہاتھوں کیمبرج یونیورسٹی میں "جیل اور میں" کے فن سے بھی آگاہ ہو جائیے..... "رفتہ رفتہ مجھے اس فن میں کمال حاصل ہو گیا۔ جس روانی اور نفاست کے ساتھ میں ناخواندہ کتابوں پر گفتگو کر سکتا تھا اس پر میں خود حیران رہ جاتا تھا اس سے جذبات کو آسودگی نصیب ہوئی" واللہ کیا بات کہی ہے۔ کیمبرج سے لوگ یہی فن سیکھ کر آتے ہیں۔ کیمبرج کی تعلیم کا شاید یہی نچوڑ ہے۔

ادب زندگی پر تنقید ہے: میتھو آرنالڈ نے اس بات کو کچھ ضرورت سے زیادہ انسپکٹر مدارس کے الفاظ میں ادا کیا ہے۔ بس سے کچھ بات خشک نہیں بنتی دکھائی دیتی ورنہ جو کچھ اس نے "دن" کہا تھا وہ ٹھیک ہی تھا زندگی کی وہ چیز جو فنکار ہمیں دیتے آئے ہیں وہ پطرس نے بھی ہمیں دے دیا ہے اب اگر نظریۂ حیات نصب العین، پول کھولنا، مقدسانہ سنجیدگی وغیرہ قسم کے ساخت زدہ الفاظ کا ذکر کیجئے تو جواب یہی ملتا ہے کہ اگر زندگی کے عمل نقش میں کوئی نظریہ ہے، نصب العین ہے، کسی چیز کے پول کھولنے کی ضرورت ہے کوئی اخلاقی سیاسی وغیرہ قدر یا قدریں ہیں تو وہ پطرس کے یہاں بھی ہیں۔ ورنہ ان کے ذکر پر یک کا جملہ یاد کیجئے اور خاموش ہو جائیے یہ شیکسپیئر والا ہیومر ہے۔ صاف خالص ہیومر طنز وغیرہ کی گندگی سے پاک ذ ہے۔ دب یا منہ اینجا از عجب درگاہ ہست

اب دیکھئے پطرس کیا ہے سب مضامین کو ملا لیجئے اور دیکھئے کیا نکلتا ہے۔ الف لیلیٰ میں ایک قصہ ہے جس میں ایک لڑکا سمندر کے کنارے ایک بوتل پڑی پاتا ہے اس بوتل کو کھولتا ہے تو اس میں سے ایک جن نکلتا ہے جو لڑکے کو کھا جانے کو تیار ہوتا ہے۔ پطرس بھی ویسا ہی ایک جن ہے، مگر یہ جن آدم خور نہیں ہے آدم خوردہ ہے۔ یہ ہمیں نہیں کھاتا اپنے تئیں ہم کو کھلاتا ہے

اس کو پھر شیشے میں نہیں اتارا جا سکتا۔ یہ الف لیلیٰ والا احمق جن تو ہے نہیں کہ ایک لڑکے کے کہنے پر پھر بوتل ہی واپس ہو جائے اور ہم اسے بوتل میں واپس جانے کو کہیں ہی کیوں۔ وہ تو ہماری خوراک ہے۔ بڑے مزے کی خوراک ہے۔

یہی بہادر جن سروانٹیز کے دماغ سے ڈان کوئکزٹ کی صورت میں روزینانٹ پر بیٹھ کر سانچو پانزا کو ساتھ لے کر ڈلسینیا کے عشق میں سرد آہیں بھرتا ہوا دنیا کو فتح کرنے نکلا ہے۔ یہی اب پطرس کی صورت میں نمایاں ہوا ہے۔ جدید دور کے سب ہتھیار اس کے پاس ہیں۔ جدید تعلیم، کیمبرج کی ڈگری پر وفیسری کا عہدہ اس کی ڈلسینیا روشن آرا ہے۔ جس کو وہ آہ سرد کا تار بھیجتا ہے اس کا بھی ایک سانکو پانزا ہے یعنی کبوتر باز مرزا صاحب جو روشن آرا کے فقروں، کبوتر بازی اور تاش بازی کے منظروں سے نمایاں ہوتا ہوا "سینما کا عشق" میں کمال کے ساتھ ابھرتا ہے یاد رکھئے پطرس ایسا جن ہے جو اپنے تئیں ہلکان کرتا ہے۔ چنانچہ اس کا سانکو اس کو پریشان کرنے میں کمال دکھاتا ہے۔ سینما جانا فرض۔ بغیر مرزا صاحب کو ساتھ لئے بن نہیں پڑتی۔ تماشا شروع ہو جانے کے بعد پہنچنا لازمی ٹھہرا۔ اب اندھیرے کی مہم شروع ہوتی ہے۔ ڈان کوئکزٹ کی پنچکیوں والی مہم! اُف۔ اُف۔ واہ مرزا خوب پھانستے رہو۔

مگر مرزا کا پھانسنا بڑی مفید چیز ہے۔ پھانس پھانس کر ہی سہی مگر مرزا ہی نے تو پطرس کو شہسوار بنایا ہے مرزا ہی نے تو اسے وہ سواری دی جس کو دیکھ کر روز نیا نٹ بھی بھڑک کر مالک کے قابو سے باہر ہو جاتی ہے اور ایسی بھاگتی ہے کہ پھر نہیں نظر آتی۔ وہی مرحوم جس کی یاد اردو زبان کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہے بلکہ اردو زبان کے ثبات کی ضامن ہے۔

کیا سواری ہے؟ مشین بنانے والے انسان کی قابلیت کا معجزہ! جدید دور کی سب سے زیادہ تعجب انگیز سواری۔ اگر ڈان کوئکزٹ آج کل تشریف لائیں تو انہیں آج کل کی سب سے زیادہ تعجب میں ڈال دینے والی سواری بائیسکل کے سوا اور کوئی نہ دکھائی دے گی یہ ہوا پر اڑنے والی اور پٹڑیوں پر چلنے والی پٹرول کی غلام سواریاں کیا رقم ہیں!

پطرس اس معجزہ نما سواری کو دنیا کے ادب کی مضحک ترین سواری بنا کر پیش کرتا ہے۔ یہ مرزا صاحب کا تحفہ ہے نہیں موسس دیوتا کا عطیہ ہے رات ہی میں آگئی ہے اور اپنے ساتھ ایک پہلے کسنے کا اوزار بھی لائی ہے یہ اوزار ہی اس کا علاج درد دل بلکہ اس کی روح ہے۔ کیا شکل پائی ہے "دیکھنے سے اتنا تو ثابت ہو جاتا ہے کہ بائیسکل ہے لیکن مجمل ہیبت سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پل اور رہاٹ اور چرخہ اور اسی طرح کی جدید ایجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہے" "ل اور رہٹ اور چرخہ اس کے مقابلے میں جدید ایجادات ہیں۔"

اور اس کی چال بھی کیا کمال ہے پطرس آخر کار اس پر سوار ہوا۔ پہلا ہی پاؤں چلایا تو ایسا معلوم ہوا کہ کوئی مردہ اپنی ہڈیاں چٹخا چٹخا کر اپنی مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہے۔ بائیسکل اپنی آوازوں میں گم ہے۔ ان آوازوں کے مختلف گروہ تھے چیں چاں چوں قسم کی آوازیں زیادہ تر گدی کے نیچے اور پچھلے پہیے سے نکلتی تھیں۔ کھٹ کھڑ کھڑ کے قبیل کی آوازیں مڈگارڈوں سے آتی تھیں۔ چر چرخ۔ چر چرخ کی قسم کے سُر زنجیر اور پیڈل سے نکلتے تھے۔

جوڑ و بند کی حرکات ملاحظہ ہوں۔ "زنجیر ۔۔۔ میں جب کبھی پیڈل پہ زور ڈالتا تھا، زنجیر میں ایک انگڑائی سی پیدا ہوتی تھی جس سے وہ تن جاتی تھی اور چڑ چڑ بولنے لگتی تھی اور پھر ڈھیلی ہو جاتی تھی۔۔۔"

پہیہ ۔۔۔ "پچھلا پہیہ گھومنے کے علاوہ جھومتا ہے یعنی ایک تو آگے کو چلتا تھا اور اس کے علاوہ داہنے سے بائیں اور بائیں سے داہنے کو بھی حرکت کرتا تھا چنانچہ سڑک پر جو نشان پڑتا جاتا تھا۔ اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مخمور سانپ لہرا کر نکل گیا ہے۔"

مڈگارڈ ۔۔۔ "مڈگارڈ تھے تو سہی لیکن پہیوں کے عین اوپر نہ تھے ان کا فائدہ صرف یہ معلوم ہوتا تھا کہ انسان شمال کی سمت سیر کو نکلے اور آفتاب مغرب میں غروب ہو رہا ہو تو مڈگارڈوں کی بدولت ٹائر دھوپ سے بچے رہیں گے۔۔۔"

اگلے پہیے کے ٹائر میں ایک بڑا سا پیوند لگا تھا جس کی وجہ سے پہیہ ہر چکر میں ایک

دفعہ لمحہ بھر تو زور سے اوپر اٹھ جاتا تھا اور میرا سر پیچھے کو یوں جھٹکے کھا رہا تھا۔ جیسے کوئی متواتر ٹھوڑی کے نیچے مکّے مارے جا رہا ہو"

اس کی چال میں ارتقاء بھی ہے "جب اتار پر بائیسکل ذرا زیادہ تیز ہوئی تو فضا میں بھونچال سا آ گیا اور بائیسکل کے کئی اور پرزے جو اب تک سو رہے تھے بیدار ہو کر گویا ہوئے ...... اف۔ اف۔ ایک نتھنوں کے گھوڑے کیا اڑیں گے۔ یہ سائیکل بالکل آسمان سے اتری ہے ..... موسیٰ نے پطرس کے لئے یہ براق بھیجا ہے!

کیا قیامت کی بائیسکل ہے اس کے سامنے مستریوں کی پسپائی کے سین اور خریداروں کی ارمان لینے کی بات چیت! یہ عہد الزبتھ کا انگلینڈ ہے ہمارا اڑن کو ہرٹ بائیسکل کے دو حصے ہاتھوں میں لئے ہوئے آفاق پر چلا آ رہا ہے۔ پکٹ، سرجان فالسٹاف کیا کہتا ہے KNIGHT OF THE BROKEN BICYCLE MASTER SHALLOW

ہمیں اس سے کوئی مطلب نہیں کہ پروفیسر بخاری کہاں پیدا ہوئے کہاں کہاں رہے اور کہاں مرے۔ ہم جانتے تو ان سے ملتے مگر اس کا موقع نہ ملا۔ اچھا ہی ہوا ہمیں ان سے کیا مطلب تھا۔ ہمیں پطرس سے غرض ہے اور رہے گی یہ شخص رہتی دنیا تک رہنے والا ہے۔ عہد الزبتھ کا ایک فرد ہے اس کا لاہور سرجان فالسٹاف کا لندن ہے یہ لاہور لاہور ہی ہے اس کے کچھ نہیں اس کے پاس ایک دریا لیٹا رہتا ہے بہنے کا شغل عرصے سے بند ہے حملہ آوروں کی آماجگاہ ہے یوپی کے حملہ آور دلّی کے رستے سے یہاں آتے ہیں اور اہل زبان کہلاتے ہیں۔ اس کے حدود اربعہ موزخ ہو چکے۔ آب و ہوا کا سوال نہیں! کُھتا آب کی جگہ پائپوں میں ہائیڈروجن اور آکسیجن اور ہوا کی جگہ گرد اور خاص حالات میں دھواں ملتا ہے عہد الزبتھ کی سڑکیں ہیں پھسلا دینے والے تانگے ملتے ہیں۔ مکانوں پر اشتہارات کے بجائے پلستر لگائے جاتے ہیں۔ یہاں کی صنعت و حرفت اسی حد تک رسالہ بازی ہے جیسی الزبتھ کے زمانہ میں ڈرامہ بازی تھی۔ ہر ہر نکڑ پر یہاں بھی اسی

طرح ایک انجمن موجود ہے جیسے شیکسپیر کے لندن میں تھیٹر موجود تھے۔ یہاں کی بہترین پیداوار طلبا ہیں اللہ قسم قسم کے ہیں اور پروفیسر ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ "دودھ پلانے والے جانوروں میں سے ہوں"۔ یہاں کے لوگ بہت خوش جبھ ہیں۔ پکٹ کے پرستار ہیں اور پکٹ کا اوتار پطرس ہے۔

پطرس کا کام کھیل دکھانا ہے۔ لفظوں کا کھیل۔ فقروں کا کھیل جیسے جملوں کا کھیل۔ وٹ (WIT) کا کھیل کھیلتا ہے۔ مگر یہ اس کا خاص کھیل نہیں اس کا کھیل پکٹ کا کھیل ہے۔ موقعوں کا کھیل۔ ڈرامائی حالات کا کھیل۔ ہر مضمون یہی کھیل دکھاتا ہے۔

ہاسٹل میں پڑھنے والا علاؤالدین کو شخصیت کا مطلب سمجھا رہا ہے!

سویرے آنکھ کھولنے والا پلنگ پر لیٹا لالہ جی کی دروازے پر کھٹ کھٹ سن رہا ہے۔

جاگنے کی کوشش ہائے ہائے۔

"یعنی بہت ہی کتا!"

"باپ انگوٹھا چوس رہا ہے۔"

فرمانبردار میاں چھدیا ہوا ہے ..... یہ قعہ پوش ..... منہ سے برقعہ الٹا تو روشن آنا

مرید پور کا پیر تقریر کر رہا ہے پیارے ہموطنو ..... !

پروفیسر پطرس پر عقیدت کی انگلیاں چڑھائی جا رہی ہیں۔

سینما کے اندھیارے میں آب حیات کی تلاش ہو رہی ہے۔

ایک منتخب ناخواندہ کتابوں پر گفتگو کی مشق کر رہا ہے۔

"مرحوم کی یاد میں"، یہ تماشا لمبا ہے۔ سین نمبر ایک۔ مرزا سے گفتگو۔ سین نمبر دو۔ سائیکل کا معائنہ۔ سین نمبر تین۔ رفتار کا ایک منظر نمبر چار۔ مرمت کی دوکان نمبر پانچ فروخت۔ نمبر چھ نومی بائیسکل و لاہیرو نمبر سات۔ ہوئے کیوں نہ غرق دریا۔

لاہور لاہور ہی ہے۔

کھیل ختم

ختم ؟

"یہ کھیل ختم نہیں ہوتا۔ پطرس کا تماشا دیکھ۔ پطرس کا تماشا دیکھ!" ہم گلیب تھیٹر سے بول رہے ہیں۔ اب آپ ایک لافانی تماشہ دیکھیں گے۔ جو پطرس نے پیش کیا ہے..... یہ پروگرام ہو مبٹر بلینڈ پہ ہر وقت سنا جا سکتا ہے اور سننے سے زیادہ دیکھا جا سکتا ہے۔

اس کھیل کے سلسلے میں ایک نیا اعلان سن لیں۔ اردو ادب میں منشیان تنقید بابو پہ ساتی مینڈکوں کی طرح چھیل رہے ہیں۔ پطرس کے کھیل کو ہرگز نہ دیکھیں ورنہ..... پبلک نے ان کے لئے اب تک کوئی سزا تجویز نہیں کی۔

ان میں سے ایک بڑے بابو کو پکڑا گیا ہے وہ عرصہ ہوا اپنے آپ کو فرسٹ کلاس کا اور اقبالؔ کو انٹر کلاس کا ٹکٹ دے گئے تھے۔ اس وقت انہیں معاف کر دیا گیا تھا۔ مگر اب ان کی جرائم پیشگی پختہ ہو گئی اور نظر موٹی ہو گئی انہوں نے اردو کی مزاحیہ نگاری پر بھی ایک نظر ڈالی ہے اور پطرس پر جو کچھ کہا ہے اس کی سزا ان کو اچھی طرح دی جائے گی۔

عصمت چغتائی

ہنستے ہنستے

ہنستے ہنستے بے جاں ہو کر نیر تخت سے نیچے لڑھک گئی۔

"پطرس کو خدا اللہ کا واسطہ۔" میں نے کرتے کے دامن سے آنسو پونچھ کر خوشامد سے کہا ہمارے پیٹوں میں مروڑیاں اٹھ رہی تھیں۔ سانس پھول گئی تھی۔ ہنسی چیخوں میں بدل گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اگر ہنسی کا یہی زنانا رہا تو کچھ دیر میں جسم بیچ میں سے دو ٹکڑے ہو جائے گا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بات بات پر ہنسی آتی تھی۔ کوئی پھسل پڑا ہنسی چھوٹ نکلی۔ مرغی نے کتے کے پنجے کے ٹھونگ ماردی۔ وہ پیں پیں کر کے بھاگا اور قہقہوں کا طوفان ٹوٹ پڑا اور جو کہیں کسی نے پوچھ لیا کہ بھئی کیوں ہنس رہی ہیں تو بس پھر تو ہنسی کا وہ شدید دورہ پڑ جاتا کہ معمولی مار پیٹ سے بجائے قابو میں آنے کے اور بھی تیز ہو جاتا۔ ہنسی آسیب بن کر سوار ہو جاتی ہنس ہنس کر نڈھال ہو جاتے۔ ہڈیاں چٹخنے لگتیں جبڑے دکھ جاتے۔

کسی صورت افاقہ نہ ہوتے دیکھ کر اماں اپنی چپٹی سلیم شاہی لے کر تل پڑتیں اور ساری ہنسی ناک کے راستے نکال دینے کی دھمکی دیتیں۔ تب ہم آنکھیں پونچھتے پیٹ پکڑے نیم تلے پڑے ہوئے اپنے مخصوص جھگڑے میں جا گرتے اور نئے سرے سے ہنسنے لگتے۔

عظیم بھائی کی کتابوں میں سے مضامینِ پطرس چرا کر پڑھنے کے بعد بھی ہم اسی قسم کی جان لیوا ہنسی کے بھنور میں پھنس گئے ہماری کھی کھی کھوں کھوں سے ہماری بردبار اور غمگین آپا کی سمع خراشی ہونے لگی۔ وہ دہیب سر پہ جائے اور کتاب چھین لے گئیں۔ مگر یہ ہم نہ جانے

کونسی بار کتاب پڑھ رہے تھے۔ ہمیں جملے کے جملے یاد ہو گئے تھے جو اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے دہرائے جاتے تھے اور فقرہ بازیاں لگائی جاتی تھیں نہ جانے ایک عمر میں کیوں بے بات ہنسی آتی ہے۔ اب وہی مضامین پڑھتی ہوں تو اتنی ہنسی نہیں آتی۔

اس وقت تک عظیم بھائی نے مزاح نگاری شروع نہیں کی تھی یا شاید ہم نے ان کے مضامین نہیں پڑھے تھے۔ ملا موزی کے مضامین پر اتنی ہنسی نہیں آتی تھی۔ جیسی کبھی آیا کرتی تھی کچھ پھیکے سے لگنے لگے تھے۔ نہ جانے کیوں بس پطرس بھا گئے اور ایک جان چھوڑ ہزار جان سے ان پر عاشق ہو گئے نہ جانے کیوں تخیل میں وہ اپنے ہم عمر سے نظر آتے تھے اور یقین تھا کہ اگر ان سے ملاقات ہو جاتی تو ہم ضرور انہیں پیڑ پر بندھی اس بان کی کھٹولی پر چڑھا لے جائیں جو کنوئیں کے پاس نیم کی اونچی شاخوں پر شمیم اور جیونے باندھ رکھی تھی۔

پطرس کی باتیں —— جی ہاں میں انہیں باتیں ہی کہوں گی کیونکہ ان کی تحریریں بے ساختہ بولتی تھیں۔ ان میں بڑی یگانگت اور قربت محسوس ہوتی تھی۔ ہمارے گھر کے زندہ ماحول میں بڑی بے تکلفی سے کھپتی تھیں چھوٹے بڑے سب ہی انہیں پسند کرنے لگے۔

عظیم بھائی نے "قصر صحرا" لکھی تو ہم نے جی جان سے پڑھی مگر "قرآن و پردہ"۔ "حدیث و پردہ" بڑی بور معلوم ہوئیں۔ خشک مردہ کتابیں ان کے کچھ مضامین اقتصادیات پر "ریاست" میں نکلتے تھے وہ بھی ہمیں قطعی کھردرے معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے جب ہمیں پطرس کے مضامین اس رغبت سے پڑھتے دیکھا تو کچھ مکدر سے ہو گئے۔

ناول پڑھ کر ہنسنے کا دور گزر چکا تھا۔ سخت رومانٹک افسانوں سے کبھی شدید دلچسپی نہ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہمیں پطرس بے طرح پسند آ گئے "میں ایک میاں ہوں" ہمارے گھر میں بالکل کیری کی چٹنی کی طرح چٹخارے لے کر پڑھا گیا۔ اماں تک نے پڑھ ڈالا۔ اور جب اپنی پلنگڑی پر بیٹھ کر وہ ہنسیں تو پان دان کی کلھیاں پھدک پھدک کر آپس میں ٹکرانے لگیں۔ میں نقاد نہیں نہ میں کوئی بات وثوق سے کہہ سکتی ہوں مگر میرا اپنا ذاتی خیال ہے کہ "میں ایک میاں ہوں"

کے بعد سے پطرس کا رنگ دوسرے مزاح نگاروں میں جھلکنے لگا۔ عظیم بھائی نے تو اپنی ایک کہانی میں اعتراف بھی کیا ہے۔ فرحت اللہ بیگ اور شوکت تھانوی کے ہاں بھی وہی رنگ جھلکنے لگا۔ میں مزاح نگاری کی تاریخ نہیں لکھ رہی ہوں کیونکہ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ ان میں سے پہلے اس انداز میں کس نے لکھنا شروع کیا۔ مجھے آج تک نہیں معلوم کہ ان میں سے کون کس سے متاثر ہوا اور کس نے کس کی پیروی کی۔ مگر میرے مطالعے کی تاریخ میں پہلا نام پطرس کا آتا ہے۔ میں پطرس کو اپنی جانب سے کوئی مقام نہیں دینا چاہ رہی ہوں مجھے تو بس یہ کہنا ہے کہ ایک عمر میں پطرس کی تحریریں دل کو ایسی لگی تھیں کہ ہم نے ایک دن جوش میں آ کر پطرس کو خط لکھ مارا۔ ابا میاں کے بکس سے لفافہ اور ٹکٹ چرایا اور معرفت —— "تہذیب نسواں" —— خط بھیج کر جواب کا انتظار کرنے لگے۔

یا اللہ تیری ہر بات میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ اسی پر تو میں خدا کے وجود کی قائل ہوں۔ وہ خط قبلہ ممتاز علی صاحب نے کھول لیا اور مع لفافہ کے آپا کو جنہیں انہوں نے منہ بولی بیٹی بنایا تھا بھیج دیا۔ بلی مظلوم سی ایک چوہیا پکڑ لیتی ہے اور کم بخت اس سے مذاق کرتی ہے۔ کبھی دانت مار دیا۔ کبھی گدگدا دیا کبھی پنجہ سے لڑھکا دیا۔ اس خط کے آنے کے بعد کئی روز ہماری گت اسی طرح بنتی رہی۔ ہمارا خط اونچی آواز سے ابا کے سامنے پڑھا گیا۔ ہر فقرے پر سر پہ چپتیں پڑتی جاتیں۔ خط میں ہم نے انہیں مسخرا لونڈا سمجھ کر نہایت بے تکلفی فرمانے کی کوشش کی تھی۔ اب تک اس خط کا ایک ایک حرف دماغ پر داغا ہوا ہے برسوں خیال ہی سے پسینے چھوٹ جایا کرتے تھے۔ خط ہمیں تنبیہہ دینے کے لئے بار بار پڑھا جاتا تھا۔ ہم نے نہایت بے تکلفی سے اپنی دانست میں بالکل پطرس کے رنگ میں لکھا تھا۔ سب سے بھیانک جملہ تھا۔

"ابے پطرس! کیا تو گھاس کھا گیا ہے؟"

"عوام" اس جملے سے ہماری دھجیاں بکھیرتے تھے۔ ہر شخص کو اجازت تھی کہ بے تکلف

ہمارے سر پر چپت جڑ دے۔ ظاہر ہے کہ اس صلائے عام پر ہر نکتہ داں نے لبیک کہا۔ ہم حضرت ممتاز علی صاحب اور پطرس کی جان کو کوستے تھے۔ ہم مجرم جو تھے صرف اس لیے نہیں کہ پطرس سے یارانہ گانٹھنے کی کوشش کی تھی۔ بلکہ اس لیے بھی کہ ہم نے اس لفافے پر جو ٹکٹ لگایا تھا اس پر "سروس" لکھا تھا جو صرف سرکاری ڈاک کے استعمال کے لیے ہوتا تھا۔ آٹھ آٹھ آنے جرمانہ الگ ٹھکا۔ سچ پوچھیے تو اس سانحہ کے بعد پطرس ہماری چڑ بن گئے۔ ہماری جملہ شیطانیوں کی فہرست بناتے وقت ہمیشہ اس واقعہ کو تکلیف دہ حد تک اہمیت دی جاتی۔

بعض اوقات ایک چھوٹی سی بات کا دل پر کتنے دن نقش رہتا ہے۔ برسوں گزر گئے لوگ بھول بھال گئے مگر شاید دماغ نے ایک ننھی سی گانٹھ باندھ لی۔ بمبئی میں آئے سال بھر گزرا ہوگا کہ ایک دن ریڈیو اسٹیشن سے کسی صاحب نے فون کیا کہ بخاری صاحب آج کل بمبئی آئے ہوئے ہیں اور مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ پہلا خیال یہ آیا کہ کوئی بہانہ کر دوں کہہ دوں کہ بیمار ہوں، پھر سوچا یہ کیا حماقت ہے۔ پطرس آئے ہیں یعنی سچ مچ پطرس آئے ہیں اور میں ان سے ملتے جان چرا رہی ہوں۔ یعنی ان کو کیا پتہ کہ ایک دن ان کی بدولت میرے چپتیں پڑ چکی ہیں۔ وہ مجھے قطعی قابل ملاقات سمجھتے ہیں۔ جب ہی تو بلایا ہے۔ خیر لنچ کا وعدہ رہا۔

مگر میں نے شاہد سے کوئی ذکر نہیں کیا۔ انھوں نے بلایا تو شاہد کو بھی تھا لیکن میں نے بہانہ کر دیا کہ انہیں قطعی فرصت نہیں، وہی میری نیم کے نیچے پڑے ہوئے جھگڑنے والی ذہنیت! یہ ڈر کم بخت کاہے کا تھا۔ ٹھہریئے آگے چل کر بتاؤں گی۔

مجھے ضرورت سے زیادہ ذہین اور جملہ باز لوگوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ ان کی شخصیت مجھے اپنی جانب کھینچتی بھی ہے۔ اور دور بھی دھکیلتی ہے اور پھر پطرس کا مجھ پہ ویسے ہی رعب بیٹھا ہوا تھا۔ خواہ مخواہ ان سے مل کر اور احساس کمتری دوگنا ہو جائے۔ بڑی کوفت ہوئی۔ نہیں جاتی ہوں تو نہ جانے پھر کتنا پچھتانا پڑے۔ جاتی ہوں تو اللہ! نہ جانے کیسی چوٹیں کریں گے۔ ضرور میں بدتمیزی پر اتر آؤں گی۔ قطعی جو جھیل جاؤں میں نہیں چاہتی تھی۔

کہ شاہد کے سامنے میرا پول کھل جائے۔ وہ فوراً منٹو سے کہہ دیں گے کہ پطرس نے عصمت کو وہ پٹخنیاں دیں کہ گھگھی بندھ گئی۔

رات بھر میں نے ان تمام جملوں کے جواب سوچے جو وہ کہیں گے اور میں منہ توڑ جواب دوں گی۔ بدقسمتی سے میری ساری محنت رائیگاں گئی۔ پطرس نے وہ سوال ہی نہ کئے۔ اُف میری حماقت! میں نے اپنے پروفیسروں سے کبھی ہار نہ مانی۔ میرے استاد میری منہ زوری سے چوکنے رہتے تھے۔ میری کئی استانیاں کلاس میں آنسو بھر لاتیں۔ یہ میرا خاندانی ورثہ ہے اور مجھے اس پر بڑا ناز تھا۔ مگر اس دن احساسِ کمتری بے طرح بھوت بن کر گلا دبوچنے لگا۔ میں نے پطرس کی زندگی میں کبھی کسی سے ان احساسات کا ذکر نہ کیا۔ کوئی گلے پہ چھری رکھ دیتا۔ تب بھی نہ کرتی۔ کسی نے بچپن میں مجھے ہوا بن کے ڈرانے کی کوشش کی۔ تو میں نے اس ہوّے کی پنڈلی کی بوٹی اتار لی تھی اور بجائے ڈرنے کے ڈرانے والے کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ مگر پطرس کے ہوّے نے مجھے ہولا ہولا کر شل کر دیا۔ میں نے اپنے لباس کے بارے میں کبھی غور نہیں کیا۔ مگر اس دن میں نے بڑے سوچ بچار کے بعد ایسی ساڑھی نکالی جس کا ذہن پر کوئی دھندلا سا نقش بھی نہ رہ جائے تاکہ کوئی حوالہ نہ دیا جاسکے۔ ہر شے مبہم ہو جائے۔ پطرس کے سامنے دال تو گلے گی نہیں۔ صرف غائب ہو جانے والی ٹوپی پہننے ہی میں عافیت ہے۔

جب ریڈیو اسٹیشن جانے لگی تو دل سے دعا نکلی کاش پطرس بیمار پڑ گئے ہوں یا میرے ہی پیٹ میں درد اُٹھ آئے۔ ہسپتال سے فون کروا دوں کہ آخری وقت ہے۔ لعنت ہے۔ عصمت کی بچی تجھ پر۔ پھر تو وہ ضرور ہسپتال عیادت کو آئیں گے۔ بیگم اب تم نے میں بھی رہائی نہیں۔ کاندھا دینے تو وہ آ ہی پہنچیں گے۔ پھر میرے چغتائی خون نے للکارا۔ میرے سگڑ دادا نے کھوپڑیوں کا مینار چنوا کر اس پر بیٹھ کر خاصہ تناول فرمایا تھا۔ اور میں ایک حقیر پطرس کی دہشت میں فنا ہوئی جا رہی ہوں۔ ایسا بھی کیا ہے ٹانگیں کھینچیں گے تو اپنی ازلی بدزبانی پہ اتر آنا مزاج ٹھکانے آ جائیں گے شاہ صاحب کے!

لیجئے بسم اللہ ہی غلط ہوئی۔ ریڈیو سٹیشن کے دفتر میں پہنچی۔ تو کاغذوں پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔

"آداب عرض!"

"گڈ مارننگ"، جواب ملا۔

"اف بور"، میں نے سوچا۔ اب فر فر کی انگلش کا رعب ڈالیں گے وہ کاغذوں پر جھکے تھے، میں نے غور سے معائنہ شروع کر دیا "صورت تو کچھ زیادہ توپ نہیں"، میں نے سوچا۔ سیدھی سادھی سانولی سلونی شکل ہے مگر تصویر سے نہیں ملتی قطعی مختلف!

"کتنے دن قیام رہے گا۔" میں نے انہیں کاغذوں میں لوٹ پوٹ دیکھ کر پوچھا سوچا میں پہلے بولنا شروع کر دوں تو پہلا وار میرا رہے گا۔ مگر دل ڈوبنے لگا کہ پہلا وار نہایت پھسپھسا رہا۔ ضرور اس جملہ کی دھجیاں اڑیں گی۔

"جی" وہ کاغذوں میں سے ابھرے "میرا تبادلہ بمبئی کا ہو گیا ہے۔"

یہ لیجئے سنا تھا کسی میٹنگ کے سلسلہ میں بمبئی آئے ہیں بہت جلد جانے والے ہیں یہ آخر مجھ سے جھوٹ کیوں بولا۔ کوئی اس میں بھی چال ہو گی۔ اس سے قبل کوئی اور سوال جھاڑتی۔ فرمانے لگے۔

"چلئے!"

"خاصہ بور ہے"، میں نے بٹوہ اٹھا کر پیچھے پیچھے ہوتے ہوئے سوچا یہ دانت کیوں بار بار نکوستا ہے؟ سارا ریڈیو اسٹیشن گھما کر ایک کمرے میں مجھ سے بیٹھنے کو کہا۔ سامنے میز پر ایک اونچے کاغذوں کے ڈھیر کے سامنے ایک عقاب کی سی صورت کا گورا چٹا پٹھان بیٹھا ہوا تھا۔ طوطے جیسی لمبی ناک، بھاری بھاری آنکھیں۔

"آیئے آیئے . . . . معاف کیجئے گا میری میٹنگ ذرا لمبی کھنچ گئی۔"

"اوہ"، میں نے سانولے سلونے پطرس کے جانے کے بعد کہا۔ "میں سمجھی تھی آپ وہ ہیں۔"

"کیا؟ . . . . . میں وہ ہوں . . . . . آپ میری ہتک کر رہی ہیں" وہ برا مان گئے۔ "وہ ملتفن ہیں اور میں قطعی وہ نہیں ہوں" ایک جھٹکے سے سارا اعصابی دباؤ جھک سے اڑ گیا۔ ایر کنڈیشن کمرے میں ایک دم مجھے نیند سی آنے لگی۔ با خدا حق میں نے اس شخص کی اپنی جان پر اتنی ہیبت سوار کر لی ایسا معلوم ہوا میں انہیں برسوں سے جانتی ہوں یہ عقاب تو قطعی فاختہ نکلا پھر جو باتوں کا ریلا چلا ہے تو میرا سارا ریہرسل بے کار ہو گیا۔ سارے تراشے ہوئے جملے اڑن چھو ہو گئے۔ تاج محل ہوٹل پہنچتے پہنچتے دو چار مسائل پر اختلاف بھی ہو گیا۔ میرے خیال میں پطرس کی خاصیت یہی تھی کہ ان سے ملتے ہی برسوں کی ملاقات کا احساس ہونے لگتا تھا۔ یہ معلوم کر کے بھی حیرت ہوئی اور مسرت بھی کہ انہوں نے اس زمانے کے لکھنے والوں کا ایک ایک لفظ بڑی دلچسپی سے پڑھا تھا اور یاد رکھا تھا۔ انہیں جملے کے جملے ازبر تھے۔ شعر تو میں نے بہت لوگوں کو یاد رکھتے سنا ہے مگر نثر صرف پطرس کی زبان سے اس طرح سنی۔

"میرے کمرے میں چلنے پر کوئی اعتراض؟" بڑی بے تکلفی سے پوچھا۔

"کیوں؟"

"ٹھیک ہے آیئے۔"

یہ اطلاع مجھے بعد میں ملی کہ پطرس نہایت لوفر انسان ہیں۔ اس وقت مجھے بھی اندازہ نہیں تھا کہ میری ڈھیٹ کہانیوں کی وجہ سے لوگ مجھے بھی بڑی نٹ کھٹ سمجھتے ہیں۔

میں نہایت بے تکلفی سے آرام کرسی پر دراز لیمونیڈ پیتی رہی۔ وہ پلنگ پر پھیلے ٹھنڈی ٹھنڈی بیر کی چسکیاں لیتے رہے اور دو قینچیاں اپنی پوری رفتار سے چلتی رہیں۔ باتوں کے طوفان میں بار بار یہ محسوس کر کے سخت کوفت ہوتی رہی کہ پطرس کا مطالعہ اور مشاہدہ اتنا وسیع ہے کہ برسوں کھرلی گھونگی پر تل کر عبث نہ ہو سکے گی۔ اس لئے کیوں نہ قنوطیت پر اتر آؤں اور اپنی خاندانی کج بحثی کام میں لاؤں کہ بڑے بڑے سورماؤں پر آزمایا ہوا نسخہ ہے جہالت اور کم مائیگی کے لئے بہترین ڈھال۔

مگر بہت جلد معلوم ہو گیا کہ غنیم نہایت چوکس ہے مجھ سے کئی سال پرانا اور اکھاڑے کا گھٹا ہے تیر کی نوک بڑی چابک دستی سے واپس لوٹا رہا ہے۔ اس میدان میں بھی کھلی بات سے بہتر ہے اسے بزرگ مان کر ہتھیار ڈال دوں۔ شاگرد بن کر مسکین صورت سے سوالات کروں اور یہ لکچر جھاڑ کر حلق خشک کرے۔ موقع پاؤں تو ڈنک مار دوں۔ مگر توبہ کیجئے پطرس گھسے میں آنے والے آسامی نہ تھے۔ میرے ہر ذہین اور دقیق سوال میں نہایت بھونڈے پن سے "ہٹایئے بھی یہ بورنگ باتیں" کہہ کر میرا خوب جی جلایا۔

میں نے بھی چڑ کر ان کی ہر بات کو الٹ کر بحث شروع کر دی۔ انہوں نے میرے ہر پسندیدہ شاعر کو اور ادیب کو جاہل اور الو کہہ دیا۔ میں نے بھی کلس کر نہایت تہذیب اور سلیقہ سے انہیں احمق کہہ دیا جس پر وہ بے تحاشہ ہنسے۔ میں نے پھر چڑھ کر ان کا ساتھ گو جی یہ چاہ رہا تھا۔ سرہانے رکھا ہوا یہ ایش سٹینڈ ان کے سر پہ گر پڑے اور میں ہنستی رہوں۔

"ارے ڈیڑھ بج گیا" گھڑی دیکھ کر وہ جلدی جلدی اپنا گلاس ختم کرنے لگے۔ پھر بھاری بھاری آنکھوں سے میری طرف ایسے دیکھا جیسے میں بالکل کوڑھ مغز ہوں اور پھر بے اختیار ہنسنے لگے۔ بالکل میرے بدذات بھائی چنو کی طرح۔ ایک دفعہ اس کے چڑانے پر میں نے گال پہ ایسا پنجہ مارا تھا کہ چربی نکل آئی تھی۔

"جلدی چلنا چاہیئے ورنہ کھانا نہیں ملے گا۔" مطلع صاف ہو گیا اور ہم نہایت اطمینان سے ڈائننگ ہال میں جا کر مینو پڑھنے لگے۔ "اف یہ فرنچ کھانوں کے نام مجھے بڑے گندے لگتے ہیں" میں نے پھر چلانے کی کوشش کی۔ "سب کھانے سارڈین کی طرح بدبودار اور بس سے معلوم ہوتے ہیں۔" اس کے بعد مچھلیوں، گھونگوں اور سیپیوں پہ بحث ہونے لگی اب انہوں نے ایک دوسرا طریقہ نکالا ہر بات پہ اتفاق کرنے لگے جس پہ کوفت دوگنی ہو گئی اور میں اس نتیجہ پہ پہنچی کہ پطرس اُتر جائیں تو دشمن جاننے میں ہی عافیت ہے۔ میں نے چاہا ان کی تحریروں کے بارے میں بات کروں مگر اس عرصے میں ہمارے تعلقات اتنے کشیدہ ہو گئے تھے کہ وہ

بھڑک گئے اور یہ بجا بھی تھا اس وقت میں ان کی کہانیوں کی تعریف کر کے ان کے چہرے پر آنے والی جھپکیوں پہ مسکرا کر جی ٹھنڈا کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر وہ فوراً ادب کی محفل سے چھلانگ مار کر کھانے پر آ گئے۔ کافی بدمزہ کھانا تھا۔ اسٹو کیا تھا جیسے چمڑہ چبا رہے ہوں۔ اشارے سے بیرے کو بلا کر بڑی لجاجت سے بولے۔

"دوست یہ بکرا تو سینگ مار رہا ہے کوئی مرا ہوا جانور نہیں پکا تمہارے ہاں" بیرا بے چارہ کھسیانا ہو کر ہنس دیا اور جب وہ پلیٹیں اٹھا کر چلا گیا تو ایک دم سے بولے۔

"تم نے لکشمن کو پطرس کیوں سمجھا اگر گدھے کو پطرس سمجھ لیا ہوتا تو مجھے قطعی شکایت نہ ہوتی۔" مجھے مسکراتا دیکھ کر بولنے سے پہلے جلدی سے بولے "شاید گدھے کو شکایت ہوتی" میں نے اتنی زور سے قہقہہ مارا کہ ہال میں مہذب لوگ بڑبڑ کرتے کرتے ایک دم چونک کر تکنے لگے۔ پطرس نے تاریک نظروں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں۔

درمیانہ درجہ کی چاردیواری میں پلی ہوئی لڑکی تاج محل ہوٹل کے آداب سے کیسے واقف ہو سکتی ہے ان کا خیال ٹھیک تھا۔ اس سے پہلے میں نے صرف ایک دفعہ تاج میں چائے پی تھی۔ اس وقت یہ آپا اتنے شاندار ہوٹل مجھے صرف دیکھنے کے لئے لے گئی تھی۔ بناوٹ سجاوٹ اور صفائی کو ہمارے گھر میں نہایت حقیر نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ ہمارے گھر میں کھانے کی میز تو تھی اور جب نہایت غیر دلچسپ قسم کے مہمان آتے تھے تب اس پر سے سلائی کی مشین، اچار کی برنیاں اور بچہ کا گدیلا اتار کر تخت کے نیچے دوسرے کاٹھ کباڑ کے ساتھ چھپا دیا جاتا تھا۔ خاص مہمانوں کی [illegible] بچھا کر چینی کی پلیٹیں سجا دی جاتی تھیں۔ آپا بڑے چاؤ سے نیپکن کے پھول بنا کر گلاسوں میں سنوار دیتیں۔ ہم لوگ اسے احمقانہ بناوٹ اور بیکار کی زحمت سمجھ کر نہایت تحقیر سے ہنستے اور انہیں چڑانے کو گلاس میں سے نیپکن نکالے بغیر پانی بھر لیتے۔ آپا مہمانوں کے سامنے ہمارے جنگلی پن کی وجہ سے شرمندہ ہوتیں تو بڑا لطف آتا۔ ہم لوگ تو تانبے یا تام چینی کی رکابیوں میں کھانا رکھ کر ہاں کی چارپائی پر

سیدھی رکھ کر بیٹھ جاتے۔ ذرا پلنگ کی ادوائین ڈھیلی ہوتی تو بڑا مزا آتا۔ کوئی موٹا آدمی بیٹھ جاتا تو سارا شوربہ گود میں رس آتا۔ ان کی ڈھیلی چارپائی پر بیٹھ کر پتلے شوربے کا سالن کھانا بھی ایک فن ہے۔ جس میں ہمارا گھرانا ماہر تھا۔

تاج محل ہوٹل میں کانٹے چھری سے کھانا کھاتے وقت میرے کندھے استعمال سے بوجھ سے تھک گئے اور چغتائیت کو سخت ٹھیس لگی اور مجھے فوراً احساس برتری ہونے لگا کم از کم اس میدان میں تو مجھے فوقیت حاصل تھی۔ پطرس کو روز روز اسی طرح طمطراق سا کھانا پڑتا ہوگا انہوں نے شاید کبھی کھاٹ پہ بیٹھ کر آلو گوشت نہیں کھایا ہوگا۔ خاص کر جب کہ اس میں پڑوسی کے باغ سے چرا کر میٹھا نیبو نچوڑا گیا ہو۔ اس کے بعد بیرے نے پلیٹوں میں نہ جانے کیا لا کر رکھ دیا۔ باتوں میں خیال ہی نہ رہا۔ بڑے دھواں دھار طریقے پر کرشن چندر، بیدی اور منٹو پہ بحث ہونے لگی۔ ان کا خیال تھا میں تکلف میں ان کی تعریفیں کرتی ہوں تاکہ لوگ مجھے بڑا دریا دل سمجھیں اور میں کہتی تھی میں خدا کی بھی جھوٹی تعریف نہیں کروں گی۔ ان کی کہانیاں میں نے تنقید نگار یا ایک کہانی نگار کی حیثیت سے نہیں ایک انسان کی حیثیت سے دل بہلانے کو پڑی ہیں۔ کچھ بری بھی لگی ہیں اور کچھ نشتر بن کر دل میں ترازو ہو گئی ہیں۔

"یہ جذباتیت ہے" انہوں نے رکھائی سے کہا۔

"جذباتیت کیا ہوتی ہے؟" میں نے بھونڈے پن سے کہا وہ سمجھے میں بن رہی ہوں حالانکہ یہ سولہ سال پہلے کی بات ہے اور واقعی میری سمجھ میں بہت سی باتیں نہیں آتی تھیں۔ میں نے بہت سی باتوں کے نامعقول جواب دیے تھے۔ ان کی علمی بزرگی کی قائل ہوتے ہوئے بھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ میں نے ان سے یہ بھی نہیں کہا کہ میں کب سے اور کتنی ان کی مختصر سی تحریروں کی مداح ہوں۔ میں نے بہت کم ان کی تعریف میں کہا جو کہا وہ نہایت بے رخی سے سنی ان سنی کر گئے۔ ان کی اپنی نگارشات ان کے لئے اتنی اہم نہیں تھیں۔ کم سے کم مجھے تو یہی اندازہ ہوا کہ وہ خود پرست نہیں۔

دو گھنٹے لنچ سے کھیلتے گزر گئے۔

"آپ ڈرامہ کیوں لکھتی ہیں؟" انہیں اچانک بم گرانے میں بڑا مزہ آتا تھا۔

"یونہیں،" میں نے لنگڑا سا جواب دیا۔

"میری رائے میں تو آپ ڈرامے لکھنا چھوڑ دیجئے۔ بڑے آؤٹ پٹانگ ہوتے ہیں۔ کوئی ایکٹ چھوٹا کوئی لمبا۔ سلیقے سے کتر بیونت کرنے کے بجائے آپ انہیں دانتوں سے کھسوٹتی ہیں۔" ان کی بوجھل عقابی آنکھوں میں ایذارسانی کی لذت کا نشہ ابھر آیا۔

جی چاہا میز کا سارا کوڑا کرکٹ ان کے اوپر لوٹ دوں اور بیرے پلیٹس کے مزے کی پڈنگ ان کے شاندار سوٹ پر لسڑ جائے۔ مگر میں نے جلدی سے بھڑکتے ہوئے رہوار کی لگامیں کھینچ لیں اور ایک گلاس ٹھنڈا پانی حلق میں مار کر نہایت نرمی سے کہا: "اچھا۔ . . . . اب نہیں لکھوں گی۔"

انہیں ناامیدی سی ہوئی کہ میں نے بحث کیوں کاٹ دی۔

"مکالموں میں آپ کے کافی جان ہوتی ہے۔" اونھ، میں نے سوچا یہ میرے مکالمے تھوڑی ہوتے ہیں گھر میں سب ایسے ہی بولتے ہیں۔ میں دوسری زبان کہاں سے لاؤں۔

"برنارڈ شا سے متاثر ہیں؟"

"بے حد، میں نے ایک ڈرامہ میں برنارڈ شا کے یہاں سے پورا کا پورا سین اٹھا لیا ہے کیونکہ مجھے وہ سین بہت پسند آیا تھا۔ اس کا حوالہ بھی نہیں دیا۔ مجھے بعد میں آنے والی ذمہ داریوں کا اس وقت تک اندازہ نہیں تھا۔ یہ خبر نہ تھی کہ ایک دن جواب داری کرنا ہوگی۔ اصل میں میں نے وہ سین ایک غلط کہانی کے لئے اڑایا تھا۔"

میں نے سوچا اس سے پہلے یہ میری ٹانگ کھینچیں خود ہی کیوں نہ سر پھوڑ لوں۔ "آپ جیروم کے جیروم اور پی۔ جی وڈہاؤس سے متاثر ہوئے ہوں گے؟" میں نے کہہ تو دیا لیکن اب سوچتی ہوں کہ صرف ایک بات مشترک تھی۔ یعنی دونوں مزاح نگار تھے۔ شاید چڑھ کر کہہ دیا ہوگا۔ وہ نہایت ہوشیاری سے ٹال گئے اور اشارے سے بیرے کو بلایا۔ بڑی پریشان

صورت بنا کر چاروں طرف دیکھا۔

"معاف کیجئے گا۔" بڑے ادب سے مجھ سے معذرت چاہی پھر سرگوشی میں بیرے سے کچھ کہا۔ وہ بڑے زور زور سے سر ہلانے لگا۔

"صاحب! آپ اطمینان رکھو۔ کوئی بات نہیں۔" بیرے نے ہمت بڑھائی۔

"نہیں اگر کوئی اعتراض ہو تو....." پھر سہم کر چاروں طرف دیکھا۔

"آپ بولو صاحب"

"منیجر کو تو کچھ....."

"نہیں صاحب منیجر کو کون بولے گا؟... ہم کو بولو...."

پطرس نے بڑی شکر گزار نظروں سے اسے دیکھا پھر بالکل کان کے پاس ہونٹ لے جا کر بولے۔

"کافی"

"کافی؟" بیرا چکرایا۔

"ہاں! اور نمکین بسکٹ بھی" بیرا مجسم سوال بنا کبھی مجھے اور کبھی انہیں دیکھنے لگا۔

"کسی کو کانوں کان پتہ نہ چلے..... شاباش۔"

"نہیں صاحب اطمینان رکھو"..... بھونچکا سا بیرا کافی لینے چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے حیرت زدہ ہو کر پلٹ کر دیکھا جیسے کہتا ہو "دماغ تو سلامت ہے حضور کا۔" پطرس نے نہایت معنی خیز انداز میں آنکھ ماری بے چارہ گھگیا کر ہنسنے لگا۔

اور مجھے معلوم ہوا پطرس مزاح نگار ہی نہیں ان کی زندگی میں شرارت اور چلبلاپن ہے۔ ان کی زبان میں لطیفے ہیں اور برتاؤ میں ہلکا پھلکا پن ان کے طنز میں تیکھا پن ہے انہوں نے زندگی کا تنگ و تاریک رخ نہیں دیکھا۔ وہ الجھنوں کا شکار نہیں تھے۔ آزاد زندگی کے قائل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نئے لکھنے والوں کی تلخی اور جھنجھلاہٹ سے مکدر سے ہو جاتے تھے۔

جسم فروشی اور حرامی بچوں کے سوال کو وہ کچھ زیادہ مہذب نہیں سمجھتے تھے۔ ان دنوں میں کسی سے بھی ملتی تھی "لحاف" کا ذکر چھڑ جاتا تھا۔ میری چڑ سی ہو گئی۔ پطرس نے لحاف پڑھا نہیں اور بھی جنسی الجھنوں پر کوئی بحث نہ کی۔

"میں اپنی کہانیوں کا انگریزی میں ترجمہ کرانا چاہتی ہوں" میں نے انہیں ذرا رسانیت کے موڈ میں پا کر کہا۔

"کیوں؟" وہ بڑے کھرے پن سے بولے "آپ کی کہانیاں ترجمہ نہ ہوں گی تو کیا انگریزی ادب غریب رہ جائے گا یا شاید آپ کا خیال ہے۔ انگریزی کا جامہ پہن کے تحریر زیادہ بلند ہو جائے گی؟"

پھر جی جلا۔ ایک دم سے یہ انسان اتنا خشک کیوں ہو جاتا ہے۔ "نہیں، یہ بات تو نہیں اصل میں انگریزی میں چھپنے سے پیسے زیادہ ملتے ہیں۔ احمد علی نے ایک کہانی کے مجھے چار پونڈ دلوائے تھے۔"

کچھ لاجواب سے ہو گئے اور مسکرانے لگے۔ "فکر نہ کیجئے ایک دن آئے گا لوگ خود ہی اس طرف توجہ دیں گے۔" پھر میں نے فکر نہ کی۔

ایک ایک لمحہ پرلطف گزرا۔ گھنٹوں باتیں کرنے کے بعد بھی ابھی زنبیل میں بہت کچھ تھا وہ مجھے چرچ گیٹ اسٹیشن تک چھوڑ گئے۔ میں ان دنوں ماڈرن بنی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے میرے بارے میں ایک مضمون لکھا۔ جو میں نے نہیں پڑھا لوگوں سے ٹکڑے سنے۔ ایک بار دلی جانا ہوا تو دعوت میں بلایا وہاں فیض بھی تھے مگر بڑی چپ چاپ سی محفل تھی۔ ان کا میرے ذہن پہ دھندلا سا بھی عکس نہیں کچھ سیاست کی باتیں زیادہ ہوئیں جو میرے پلے نہیں پڑیں۔

سال بھر بعد میں نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔ شاہد کی نوکری بھی کچھ ڈھل مل سی تھی تو میں نے پھر نوکری کا ارادہ کیا۔ شاہد نے کیا دل میں سمائی پطرس کو لکھ مارا کہ نوکری چاہئے کہیں ہم کو ملے۔ چار پانچ سو سے کم میں گزر نہیں ہو گی۔ ہفتہ بھر کے اندر چھ سو روپیے کی نوکری معتبر ذرائع سے مل گئی۔ اس عرصہ میں مجھے ایک فلم کا کام مل گیا تھا اور شاہد کو بھی ڈائرکشن مل گیا۔ میں

نے پطرس کو بڑی شرمندگی کا خط لکھا۔ معافی مانگی۔

پھر ملک تقسیم ہوگیا۔ جاگیریں بٹیں، زبان بٹی، ادب بٹا اور ادیبوں کا بھی بٹوارا ہوگیا۔ آدھا کنبہ یہاں آدھا وہاں چلا گیا۔ پطرس ادب کی دنیا سے سیاست کے آسمان پر پہنچ گئے۔

مگر نقوش میں ان کا ایک خط پڑھ کر نجانے کیوں محسوس ہوا۔۔۔۔ پطرس دور جا کر بھی پاس ہی کھڑے ہیں۔ آج ہی میں نے مضامین پطرس خریدی ہے پڑھ رہی ہوں۔ پڑھ کر پلنگ سے نیچے گرنے کی نوبت تو نہیں آئی مگر میرے دل و دماغ کی تکان سی اتر رہی ہے وہ قلم جو تھکے ہوئے دماغوں کو ایک لمحہ کے لئے بھی مہلت بخش دے خاموش ہو چکا۔ مگر دور میرے تخیل میں دو بھاری بھاری خلاق آنکھیں آج بھی بےساختہ مسکرا رہی ہیں۔

———— ————

مضحک اشیاء کے متعلق چند عام اصول

(پروفیسر ہنری برگساں کا فلسفۂ خندہ)

ہنسی کے کیا معنی ہیں؟ کسی مضحک چیز میں ہنسانے والا عنصر کون سا ہے؟ ہم کبھی کسی کے منہ چڑانے پر کبھی کسی کے ظریفانہ فقرے پر اور کبھی کسی شخص کی ہیئت کذائی پہ ہنس دیتے ہیں۔ ان سب میں مشترک بات کونسی ہے؟ ہم کس طریقے سے ظرافت کی اس پری کو شیشے میں اتار سکتے ہیں جو ایک روح کی طرح مختلف شکلیں اختیار کر لیتی ہے اور سامانِ تضحیک میں اس قدر تنوع پیدا کر دیتی ہے؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر ارسطو سے لے کر آج تک اکثر حکماء اپنا دماغ صرف کرتے رہے لیکن جو ہمیشہ ان کے ہاتھوں سے نکل نکل کر پھر ان کے سامنے آکھڑا ہوتا اور ان کی ہنسی اڑاتا رہا۔

جانِ خندہ یا روحِ ظرافت یا عنصرِ مضحک جو نام بھی آپ اس پری کے لئے تجویز کریں اس نام کو منطق کے اصولوں پر کسی تعریف کے بندھنوں میں جکڑ دینا فضول ہے۔ ہم اتنا جانتے ہیں کہ روحِ خندہ ایک زندہ چیز ہے۔ اس لئے ہمیں اس کا ادب و احترام کرنا چاہیئے اور ایک آدھ فقرے میں اس کی تمام ہستی کو لکھ ڈالنا اس کی توہین کرنا ہے ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ اس کا نظارہ کریں کہ وہ کس طرح پیدا ہوتی ہے اور کس طرح نشوونما پاتی ہے۔ دیکھیں کہ کس کس ڈھنگ سے طرح طرح کی شکلیں اختیار کرتی ہے۔ ممکن ہے ہم اس دیرپا آشنائی کی وجہ سے اس کو اچھی طرح جاننے لگیں اور ہمیں اس بات کی ضرورت ہی نہ رہے کہ کوئی ایک فقرے کی حدود کے اندر اس کو بند کر کے ہمارے سامنے کا خذ پہ رکھ دے اور ممکن ہے یہ

آشنائی ہمارے لئے بہت ہی مفید ثابت ہو کیونکہ روحِ خندہ کی بھی ایک منطق ہے۔ وہ بھی اپنا ایک مقررہ طریق عمل رکھتی ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی دور از کار رفتہ کیوں نہ ہو کیونکہ کئی مضحک باتیں ایسی ہیں جن کو ایک زمانہ جانتا ہے اور ان سے لطف اندوز ہوتا ہے جن پر ایک قوم کی قوم ہنس پڑتی ہے۔ جن پر ایک ملک کا ملک دہرا ہو جاتا ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اگر ہم روحِ خندہ سے اچھی طرح واقف ہو جائیں۔ تو ساتھ ہی ہمیں عوام الناس کے تخیل کا بھی کچھ نہ کچھ علم حاصل نہ ہو جائے۔ ہنسی خود زندگی سے پیدا ہوتی ہے اور فن کی بہت ہی قریبی رشتہ دار ہے تو ممکن ہے یہ زندگی اور فن پر بھی بہت سی روشنی ڈالے۔

شروع شروع میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہنسی کے متعلق تین بنیادی اصول بیان کر دیئے جائیں ان اصولوں کا خود مضحک اشیاء سے بہت تعلق نہیں لیکن ان کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے میدانِ تضحیک کی حدود قائم کی جا سکتی ہیں۔

فصل۔ دورانِ بحث میں سب سے پہلی بات جس کی طرف ہمیں اپنی توجہ مبذول کرنی چاہیئے یہ ہے کہ کوئی سامان تضحیک انسانی دائرہ سے باہر نہیں پایا جاتا۔ کسی دریا یا پہاڑی کا منظر ممکن ہے کہ دلفریب و دلکش ہو یا ممکن ہے کہ بالکل ہی حقیر و بدنما ہو لیکن مضحک ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ بعض اوقات ہمیں ایک جانور کو دیکھ کر بے اختیار ہنسی آ جائے۔ لیکن اس کی وجہ صرف یہی ہوتی ہے کہ ہماری نگاہ کو اس جانور کی ہستی میں کوئی انسانوں کا سا انداز یا انسانوں کی سی حرکت محسوس ہو جاتی ہے جو سامانِ تضحیک بن جاتی ہے ممکن ہے کہ بعض اوقات آپ ایک ملبوتری نوکدار کاغذی ٹوپی کو دیکھ کر ہنس پڑیں۔ لیکن اس میں جو چیز مضحک ہے وہ اس ٹوپی کا کاغذ نہیں۔ وجہ خندہ اس ٹوپی کی شکل ہے۔ وہ شکل جس کو یوں معرض ظہور میں لانے کا باعث کوئی انسانی ہاتھ ہوا ہے۔ یعنی مضحک انگیز ٹوپی کی قطع وضع ہے جو اس وجہ سے ضحکہ انگیز ہے کہ وہ کبھی انسانی دماغ کے ایک عجیب و مضحک خیال کی ترجمان ہے یہ تعجب کی بات ہے کہ ایسا اہم اور سادہ نکتہ حکماء کی تفتیش سے اس قدر مامون رہا ہے اکثر لوگ انسان کو حیوان

ضاحک، کے نام سے پکارتے ہیں اور اگر غور سے دیکھا جائے تو انسان نہ صرف "حیوان ضاحک" بلکہ "حیوانِ مضحک" بھی ہے۔ اگر کوئی اور حیوان یا کوئی بے جان چیز کبھی ہنسی کا باعث ہوتی ہے تو یہ ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ عنصرِ مضحک یا کوئی انسانی مشابہت ہوتا ہے یا صنعتِ انسانی کا کوئی نقش اور یا پھر مضحک وہ کام ہوتا ہے جو کوئی انسان اس چیز سے لے رہا ہو۔

دوسری بات جس کا بیان کر دینا ضروری ہے یہ ہے اکثر دفعہ ہنسی کے وقت جذبات مفقود ہوتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی مضحک چیز اپنا اثر پیدا ہی نہیں کر سکتی۔ جب تک روحِ انسانی مکمل سکون و قرار کی حالت میں نہ ہو۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم ایک ایسے شخص کی ہنسی نہیں اڑا سکتے جس پر ہم ترس کھاتے ہوں یا جس سے ہمارے الفت و محبت کے تعلقات وابستہ ہوں۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ ایسے شخص کی ہنسی اڑانے کے موقع پر ہم اتنی دیر کے لئے رحم اور محبت کی زبان بندی کر دیتے ہیں چنانچہ ایسے اشخاص کی جماعت میں جو صرف دماغ ہی دماغ رکھتے ہیں اور جن کا دل (ان معنوں میں کہ وہ جذبات کا خزینہ ہوتا ہے) معدوم ہو، شاید کوئی شخص بھی کبھی روتا ہوا نہ پایا جائے۔ لیکن ہنسنے والے پھر بھی اس میں موجود ہوں گے اس کے مقابلے میں ایک جماعت حد درجہ کی حساس طبیعت رکھنے والے اشخاص کی ہے۔ جن کا دل زندگی کی اہمیت کے ساتھ پورے طور پر ہم آہنگ ہے یعنی وہ اشخاص جن کو اہل دل کہا جاتا ہے اور جن کی فطرت میں ہر ایک واقعہ ایک جذباتی کیفیت پیدا کر دیتا ہے (جو ہمیشہ کمال کو پہنچتی رہتی ہے) ایسے اشخاص نہ تو ہنسی سے آشنا ہیں نہ اسے سمجھ سکتے ہیں جو آوازیں آپ کے کانوں تک پہنچتی ہیں یا جو حرکات و افعال آپ کے سامنے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اگر آپ ان کے ساتھ دل بستگی پیدا کر لیں۔ اگر آپ تصور و تخیل میں اوروں کے افعال میں ان ہی کی طرح شریک کار ہو جائیں اور انہیں کی طرح سب کچھ محسوس کرنے لگیں۔ مختصر یہ کہ اگر آپ اپنے جذبہ ہمدردی کو پوری طرح وسعت دے دیں تو حقیر سے حقیر چیز آپ کی نظروں میں اس قدر وقیع و اہم بن جائے گی گویا کسی طلسم نے اشیاء کی حقیقت کو

یک لخت بدل دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام محسوسات پر ایک تاریکی چھا جائے گی جو آپ
کو ہنسی سے محروم کر دے گی۔ اب اگر آپ کشمکش حیات سے الگ ہٹ کر اور اپنے آپ کو
بالکل لاتعلق بنا کر اس کا نظارہ کریں تو کئی باتیں آپ کے لئے مضحک بن جائیں گی۔ اگر کہیں
موسیقی کے ساتھ باقاعدہ تال پہ ناچ ہو رہا ہو تو آپ اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن اگر آپ
اپنے کانوں کو اس طرح بند کر لیں کہ موسیقی کی آواز آپ بالکل نہ سن سکیں تو نظارۂ رقص مضحک
ہو جاتا ہے اور شاید ہی کوئی فعل انسانی ایسا ہو۔ جو اس طرح کی آزمائش میں پورا اترے اگر
ہم افعال و حرکات کو جذبات کی ہم آہنگ موسیقی سے علیحدہ کر کے ان پہ نظر ڈالیں تو ان میں
سے کئی ایسے ہوں گے۔ جو فوراً متانت سے گرے ہوئے نظر آئیں گے۔ ثابت ہوا کہ کسی مضحک چیز
کے پورے طور پہ اثر پذیر ہونے کے لئے ایک عارضی انعدام جذبات ضروری ہے تضحیک کا
تعلق عقل و فہم اور صرف عقل و فہم سے ہے۔

لیکن ہنسی کے لئے یہ بات بھی ضروری ہے کہ ایک انسان کا دماغ اور انسانوں کے
دماغ سے دور افتادہ نہ ہو اور یہ تیسرا نکتہ ہے جو توجہ کا طالب ہے۔ اگر آپ اپنے آپ کو
بالکل تنہا اور بے رفیق محسوس کریں تو آپ مضحک اشیاء سے متاثر نہیں ہو سکتے ہنسی کے
لئے ہمیشہ ایک گونج، ایک صدائے بازگشت یعنی شرکت و رفاقت کا ہونا ضروری ہے
آپ خود ہنسی کی آواز کو غور سے سنئے یہ صاف و صریح، بنی تلی اور مقید آواز نہیں۔ خود
اس آواز کی نوعیت میں گونجتے رہنے کی خواہش مضمر معلوم ہوتی ہے کہ ایک دھماکے کی طرح
یکا یک جیسے زور سے چھٹ کر شروع ہوتی ہے اور ایک مسلسل لرزش کے ساتھ جاری رہتی
ہے۔ گویا پہاڑوں میں بادل گرج رہے ہیں لیکن باایں ہمہ نہیں ہو سکتا کہ یہ گرج بلا غایت و
انتہا گونجتی رہے۔ اس کے انتشار کا حلقہ جس قدر بھی وسیع ہو آخر حلقہ ہے اور اس لئے محدود
ہے یعنی ہماری ہنسی ہمیشہ ایک جماعت یا ایک حلقے تک محدود ہوتی ہے۔ آپ کو ریل کے سفر
میں کبھی یہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہوگا۔ آپ کے بعض ہمراہی مسافر آپس میں ایسی باتیں کر رہے ہیں۔

جو آپ کے لئے یقیناً ظرافت آمیز ہیں۔ کیونکہ وہ دل کھول کر ہنستے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ اگر آپ
بھی ان کی صحبت میں شریک ہوتے تو آپ بھی یقیناً ہنستے لیکن چونکہ آپ ان سے علیحدہ ہیں
آپ کو ہنسی نہیں آتی۔ ایک دفعہ ایک شہر کی جامع مسجد میں اس شہر کے بڑے مولوی وعظ فرما
رہے تھے۔ ان کی تقریر اس قدر موثر تھی کہ سب سامعین زار و قطار رو رہے تھے۔ سوائے
ایک کے جو بالکل ہی مطمئن بیٹھا تھا۔ جب اس شخص سے اس کے اس قدر غیر متاثر ہونے
کی وجہ دریافت کی گئی تو اس نے جواب میں کہا "میں اس شہر کا باشندہ نہیں۔ میں تو اجنبی ہوں۔"
رونے کے متعلق اس شخص نے جس خیال کا اظہار کیا وہ ہنسنے کے متعلق اور بھی زیادہ صحیح
ہے۔ ہنسی ہمیں بے اختیاری کی ایک کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ ایک ہنسنے
والے کو ہنسنے کے لئے اور ہنسنے والوں کے ساتھ خواہ وہ حقیقت میں موجود ہوں یا محض تصور
میں، سازش کرنی پڑتی ہے اور بعض اوقات تو وہ محض دوسروں کی مدد ہی سے ہنستا ہے
آپ دیکھتے ہیں کہ تھیٹر میں تماشہ دیکھنے والوں کی تعداد جس قدر زیادہ ہوتی ہے اسی قدر ہجوم
کی ہنسی بھی زیادہ بے قابو ہوتی ہے اور آپ دیکھتے ہیں کہ ایک زبان میں بہت سی ظرافت
کی باتیں ایسی ہوتی ہیں۔ جن کا ترجمہ اگر کسی دوسری زبان میں کیا جائے وہ ظرافت سے خالی رہ
جاتی ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ظرافت ایک خاص قوم کے رسم و رواج اور خیالات سے
تعلق رکھتی ہے۔ جنہوں نے اس نکتے کو نظر انداز کیا ہے۔ وہی لوگ ہیں جن کے نزدیک ظرافت
ایک نہایت ہی حقیر مشغلے سے زیادہ قابلِ غور حقیقت نہیں رکھتی اور جو ہنسی کو حیاتِ انسانی
کی باقی تگ و دو سے بالکل ہی بے تعلق سی چیز خیال کرتے ہیں۔ اکثر لوگ ظرافت کی یوں
توضیح کرتے ہیں کہ "ظرافت ایک تقابلِ ذہنی کا نام ہے" یا "ظرافت ایک محسوس بے ہودگی
کا نام ہے۔" ممکن ہے یہ تعریفیں ٹھیک ہوں لیکن یہ اس سوال کا جواب دینے سے قطعی قاصر
ہیں کہ آخر بعض چیزوں پہ ہمیں ہنسی کیوں آتی ہے؟ کیا وجہ ہے کہ بعض محسوسات تو ایسے ہیں
کہ ان کو دیکھتے یا سنتے ہی ہمارے پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے ہیں حالانکہ اور ہزاروں اشیاء بھی دنیا

میں موجود ہیں جن کا مطلقاً کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ہنسی کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے، ہمیں ہنسی کو ہنسی کے گھر میں اٹھ کر دیکھنا چاہیئے اور یہ ظاہر ہے کہ ہنسی کا گھر انسانوں کی سوسائٹی ہے۔

مفصلہ بالا بحث سے تین باتیں واضح ہوتی ہیں:۔

۱۔ سامانِ تضحیک انسانی دائرے سے باہر نہیں پایا جاتا۔

۲۔ ہنستے وقت جذبات معطل ہوتے ہیں۔

۳۔ ہنسی کے لئے ایک سے زیادہ (حقیقی یا خیالی) ہنسنے والوں کا ہونا ضروری ہے یعنی ہنسی اس وقت پیدا ہو سکتی ہے۔ جب انسانوں کی ایک جماعت اپنی توجہ اپنے ایک فرد کی طرف اس طرح منعطف کرتی ہے کہ اپنے جذبات کو معطل کر دیتی ہے اور صرف اپنے عقل و فہم سے کام لیتی ہے۔

فصل۔ ایک شخص بازار میں دوڑتا چلا جا رہا ہے۔ یکایک وہ ٹھوکر کھا کر گر پڑتا ہے۔ لوگ ہنس دیتے ہیں۔ اب اگر لوگوں کو یہ معلوم ہوتا کہ وہ گرا نہیں بلکہ جان بوجھ کر یوں زمین پر بیٹھ گیا ہے تو وہ اس پر نہ ہنستے۔ لوگ ہنستے اس لئے ہیں کہ اس شخص کا زمین پر یوں بیٹھ جانا اس کا ایک غیر ارادی فعل تھا۔ یعنی باعث خندہ اس شخص کے انداز کا یوں یکایک متغیر ہو جانا نہیں بلکہ اس تغیر میں عدم ارادہ کے عنصر کا پایا جانا ہے۔ اس شخص کو چاہیئے تھا کہ جس پتھر سے اسے ٹھوکر لگی ہے۔ اس سے ہٹ کر چلتا یا اپنی رفتار بدل دیتا۔ اس نے ایسا نہیں کیا اور چونکہ اس کے بدن میں یک لخت کترا جانے کی قابلیت نہ تھی یا شاید وہ کسی اور خیال میں غرق تھا (یعنی اس کا خیال غیر حاضر تھا) اور اس کے جسم میں اتنی لچک اور چستگی کی قابلیت نہ تھی کہ وہ خیال کے پھر حاضر ہو جانے پر اپنے بگڑے ہوئے توازن کو فوراً سنبھال لیتا۔ اس لئے اس کے اعصاب اپنے پہلے فعل یعنی آگے کو چلنے کی حرکت ہی میں مصروف رہے۔ حالانکہ متغیر حالات کچھ اور چاہتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ وہ گر پڑا اور یہی وجہ تھی کہ لوگوں کو ہنسی بھی آئی۔

اب ایک ایسے شخص کی مثال لیجئے جس کا معمول نہایت ہی باقاعدہ اور بندھا ٹکا ہے۔

اور جو چھوٹی سے چھوٹی بات میں بھی اپنے معمول سے سرمو انحراف نہیں کرتا۔ اس کی تمام اشیا ایک مقررہ قرینے اور ترتیب سے رکھی رہتی ہیں اور وہ بہت ہی باقاعدگی سے ان کو استعمال کرتا ہے اب فرض کیجئے کوئی شریر لڑکا آکر ان تمام چیزوں کی ترتیب کو بدل دیتا ہے اب وہ شخص میز پر سے قلم اٹھانے لگتا ہے تو اس کے ہاتھ میں چاقو آ جاتا ہے جب وہ الماری میں سے طب کی کتاب نکالتا ہے تو اس کی جگہ "مخزن" کا فائل نکل آتا ہے جب وہ کرسی پر بیٹھنے لگتا ہے تو دھم سے زمین پر جا گرتا ہے۔ غرضیکہ اس سے کوئی کام ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ عادت اس کو مجبور کرتی ہے کہ جب اسے کرسی پر بیٹھنے کی ضرورت ہو تو وہ ایک خاص جگہ پر پہنچ کر بیٹھ جائے اب اگر خلافِ معمول کرسی وہاں موجود نہیں تو چاہیئے تھا کہ وہ اپنی اس حرکت کو روک لیتا یا منحرف کر دیتا لیکن اس نے ایسا نہ کیا بلکہ ایک مشین کی طرح بہ خطِ مستقیم پر چلتا رہا۔ تو گویا جو شخص اس قسم کی شرارت کا نشانہ بنایا جاتا ہے اس کی حالت بھی ایک طرح سے اسی شخص کی سی ہے جو دوڑنے میں ٹھوکر کھا کر گر پڑتا ہے۔ سامانِ تضحیک دونوں حالتوں میں ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ ان دونوں اشخاص میں ان خاص موقعوں پر بل کھانے یا لچک جانے کی قابلیت کافی مقدار میں نہیں ہوتی اور چونکہ ہم ایک انسان ہیں۔ اس بات کی توقع کرتے ہیں کہ وہ نہایت ہی بیداری سے حرکت کرے اور اس میں مڑ تڑ جانے کی قابلیت پائی جائے۔ اس لئے ہمیں ان پر ہنسی آتی ہے۔ ان دو اشخاص کی مضحک کیفیتوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایک حالت میں تو گرنے کا سامان سوءِ اتفاق نے مہیا کیا تھا اور دوسری حالت میں ایک لڑکے کی شرارت نے ان دو وجوہات سے ان دو شخصیتوں میں فوراً کترا جانے کی قابلیت کی کوتاہی ظہور میں آئی۔

لیکن ان دونوں میں یہ بات بھی مشترک ہے کہ جو مضحکہ خیز نتیجہ رونما ہوا۔ اس کی علت خارجی تھی۔ یعنی ان اشخاص کی اپنی ذات میں پیدا نہ ہوئی تھی۔ اب اگر اس لچک کی کوتاہی کے ظہور کے لئے سڑک میں کسی پتھر کے پڑے ہونے یا کسی شریر لڑکے کی شرارت کی ضرورت نہ ہو۔ بلکہ یہ کوتاہی قدرتی اور طبعی طریقے پر خود اپنے خزانے میں سے اپنے ظہور کے لئے کئی مواقع نکال لے

تو سامانِ تضحیک کی علت خارجی نہ رہے گی۔ بلکہ داخلی بن جائے گی۔ ایک ایسے شخص کی مثال لیجئے
جس کا دماغ اپنے گذشتہ افعال کے متعلق مصروف رہتا ہے اور اس بات کی طرف کبھی توجہ نہیں
کرتا کہ وہ فی الحال کیا کر رہا ہے۔ یعنی اس کے خیالات زمانۂ حال سے ہمیشہ ایک قدم پیچھے رہتے
ہیں۔ اگر آپ اس سے کوئی سوال پوچھتے ہیں تو وہ اس کا وہی جواب دیتا ہے جو صبح اس نے
کسی اور شخص کو کسی اور بات کے متعلق دیا تھا۔ اگر اس کے سامنے ایک گاڑی آکر ٹھہر جاتی ہے
تو وہ اس پر اسی طرح چڑھنا شروع کر دیتا ہے جس طرح وہ صبح اپنے مکان کی سیڑھیوں پر
چڑھا تھا۔ یعنی چڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حواس اور عقل دونوں میں
ایک لچک اور خمیدگی کی ایسی کمی اور کوتاہی ہے کہ وہ زمانہ حال میں وہ آوازیں سنتا ہے جو کچھ
عرصہ ہوا بلند ہوئیں اور وہ کچھ دیکھتا ہے جو آنکھوں سے کب کا اوجھل ہو چکا۔ اس کے حواس اور اس
کی عقل میں اتنی لچک نہیں کہ وہ ان پر زور ڈال کر ان کو گرد و پیش کے حالات کے ساتھ مطابقت
دینا رہتا۔ جب کہ اس پر واجب یہ ہے کہ اس کے افعال حقیقت حاضرہ کے موافق ہوں۔ ایسی
حالت میں سامان تضحیک (اور اس کی علت ظہور) خود اس شخص کی ذات کے اندر موجود ہے۔
ایسا شخص بعض اوقات بہت ہی مضحکہ انگیز ہوتا ہے اور اگر آپ ذرا غور کریں تو آپ کو شیخ چلی
کی کئی ایسی باتیں یاد آجائیں گی جو اس خیال کی ترجمانی کریں گی۔

خیال کی غیر حاضری کا جو نتیجہ ظہور میں آتا ہے۔ اس کا مضحک ہونا بعض اوقات دیگر وجوہ
سے اور بھی زیادہ قوت پکڑتا ہے۔ مثلاً اگر آپ کو کسی شخص کے خیالات کے یوں غیر حاضر
رہنے کی ساری تاریخ سے واقفیت ہو اس کی وارفتگی گویا آپ کی آنکھوں کے سامنے پیدا
ہوا ور آپ اس بات سے بھی واقف ہوں کہ وہ کیسے بڑھتی رہتی ہے اور کن وجوہ سے ترقی کر
رہی ہے تو آپ کو اور بھی زیادہ ہنسی آئے گی۔ فرض کیجئے ایک شخص رات دن مجنوں اور فرہاد
کے قصے پڑھتا رہتا ہے اور چوبیس گھنٹے اس کا دل و دماغ، عشق کی وحشت، صحرانوردی
خود فراموشی، بے خودی اور دیگر کیفیات میں مصروف رہتا ہے۔ حتیٰ کہ قیس اور فرہاد کا کیرکٹر

سے اتنا جاذب و دلکش معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی تقلید کرنے لگ جاتا ہے اب وہ اپنے
آپ کو بالکل قیس سمجھتا ہے اور اس کے خیالات اور ارادے اس کی طرف مائل ہوتے ہوتے بالکل
اسی کی طرح ہو گئے ہیں۔ اگر چندے اس کی یہی حالت رہی تو ایک دن ایسا آئے گا کہ وہ اگر
اور لوگوں کی صحبت میں شریک ہوگا تو اس طرح گویا ایک مسلسل خواب اس پر طاری ہے اور وہ
اسی خواب میں ادھر ادھر چل پھر رہا ہے اس کی باتیں اس طرح کی ہوں گی جیسے کوئی نیند میں
بڑبڑا رہا ہو۔ اب اس کی تمام حرکتیں کسی دوسری دنیا سے تعلق رکھتی ہیں ایسے شخص میں سامانِ تضحیک
کس قدر موثر و عمیق ہوتا ہے۔ جب آپ اس سے وقت پوچھتے ہیں تو وہ ایک شعر پڑھ دیتا ہے
اور کبھی وہ آپ کو اپنا محبوب فرض کر کے ایک قصیدہ مدحیہ گانے لگ جاتا ہے ایسے شخص کے
خیال کی غیر حاضری میں یہ بات زائد ہے کہ اس کا خیال غیر حاضر تو ضرور ہے لیکن اس کے علاوہ
کسی اور جگہ حاضر بھی ہے جہاں وہ موجودات سے بے خبر ہے۔ وہاں متخیلات سے باخبر بھی ہے
یعنی صرف یہی نہیں کہ وہ گرد و پیش میں بے کار ہے۔ بلکہ وہ ایک اور دنیا میں مصروف بھی ہے۔
ایسی ہستی اس شخص سے زیادہ مضحک ہے۔ جس کے خیال کے متعلق آپ صرف یہی جانتے
ہیں کہ غیر حاضر ہے۔ لیکن یہ نہیں معلوم کہ آخر وہ ہے کہاں! مگر جب آپ کو اس بات کا علم
ہو جائے کہ واقعات موجودہ سے بے خبر اس کا دماغ کس بات میں مصروف ہے تو وہ زیادہ
مضحک ہو جاتا ہے۔ ایسے اشخاص کو صرف عام میں جنونی اور پاگل کہتے ہیں۔ ان دیوانوں کو
دیکھ کر جب ہمیں ہنسی آتی ہے تو ہمارے ساز ہستی میں وہی تار لرزاں ہوتے ہیں جو کسی
ایسے شخص کو دیکھ کر لرزاں ہوئے تھے۔ جو ایک شریر لڑکے کی شرارت کا تختۂ مشق بنتا ہے
یا جو بازار میں دوڑتا ہوا پھسل کر گر پڑتا ہے۔ یہ دیوانے بھی ایک نصب العین کی طرف دوڑ
رہے تھے۔ اور اس تگ و دو میں کسی سخت و کرخت حقیقت سے ٹھوکر کھا کر گر پڑتے
ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ایسے لوگوں سے اس بات میں بڑھے ہوتے ہیں کہ ان کی بے خبری
باقاعدہ منظوم و منضبط ہوتی ہے اور ایک خاص مرکز کے گرد چکر لگاتی رہتی ہے ان کے

سوانح اور ان کے حادثات علت و معلول کے ایک خاص سلسلے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ جو باہوش انسانوں کی منطق سے کسی طرح کم نہیں۔ ان کی عقل میں لچک کی ایک ایسی کمی ہے جس کے ہوتے ہوئے وہ اپنے حواس کو اپنی دنیا سے موڑ کر اس دنیا کے حواس کے ساتھ مطابقت نہیں دے سکتے۔

مذکورہ بالا شخص کے ایک خاص خیال میں اس قدر ہٹ اور ضد ہے کہ وہ دماغ میں سے باہر ہی نہیں نکلتا۔ اس لئے خیالات اس کے دماغ میں جگہ نہیں پا سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ شخص مضحک حرکتوں کا مرتکب ہوتا ہے اب ذرا اس سے آگے چلئے اور غور کیجئے کہ جو تعلق ایک خاص خیال کی ہٹ کو انسانی دماغ سے ہے۔ وہی تعلق بعض برائیوں کو انسان کی سیرت سے ہے یہاں پر یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ بداخلاقیاں دو قسم کی ہیں بعض برائیاں ایسی ہیں کہ روح انسانی اپنی تمام قوتوں اور طاقتوں کو ساتھ لئے ان میں کود پڑتی ہے اور اپنی حیات سے ان برائیوں کو گویا زندگی بخش کر ان کو اپنے ساتھ ساتھ گھسیٹتی چلی جاتی ہے اور اس طرح سے مختلف شکلوں میں انہیں ظاہر کرتی رہتی ہے۔ ایسی برائیاں دردانگیز اور ملال آمیز ہوتی ہیں۔ برخلاف اس کے مضحک برائی گویا ایک چوکھٹا سا ہوتا ہے جس میں انسان کو کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ ہم میں حلول کر جائے وہ ہم پر سوار ہو جاتی ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اسے اپنے رنگ تنوع میں رنگ دیں۔ وہ ہمیں اپنی یکسانیت کا جامہ پہنا دیتی ہے۔ ڈرامے اور کامیڈی میں فرق صرف اسی سے ہے۔ ممکن ہے کہ ڈرامے میں چند ایسی برائیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہو جو خاص اسماء سے موسوم ہو سکتی ہیں۔ لیکن وہ کچھ اس طرح سے کیریکٹر کا جزو بدن بن جاتی ہیں کہ ہم ان برائیوں کے نام بھول جاتے ہیں۔ ان کے خواص کو فراموش کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمیں ان برائیوں کا خیال تک نہیں آتا۔ بجائے اس کے ہمارے پیش نظر صرف وہ کیریکٹر ہوتا ہے جس کی ذات میں ان برائیوں کو بھر دیا جاتا ہے اسی لئے ایک ڈرامہ کا نام کوئی اسم معرفہ ہوتا ہے مثلاً اتھیلو، ہملٹ وغیرہ لیکن ایک مضحک برائی خواہ وہ ایک شخص سے نہایت ہی

پیچیدگی کے ساتھ وابستہ ہو پھر بھی اپنی علیحدہ نوعیت اور ہستی کو قائم رکھتی ہے وہ بہ ذات خود ایک کیریکٹر بن جاتی ہے جس کے اردگرد زندہ کیریکٹر گھومتے رہتے ہیں۔ اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ مضحک برائیاں کیریکٹروں کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچاتی ہیں۔ اسی لئے ایک شخص جتنا زیادہ وہ اپنی ذات سے بے خبر ہوتا ہے اتنا زیادہ مضحک بھی ہوتا ہے ایک ڈرامے کے کیریکٹر کو اگر اس بات کا علم ہو جائے کہ وہ کیا ہے اس میں کونسی برائیاں ہیں اور ان برائیوں کو ہم کس نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں تو ممکن ہے کہ وہ اپنے آپ میں کوئی اصلاح یا تغیر پیدا کرنا چاہے لیکن جہاں صاحب نقائصِ مضحکہ کو اپنے مضحک ہونے کا احساس ہوا۔ وہیں وہ اپنی ذات میں ترمیم شروع کر دیتا ہے یا کم از کم یہ اثر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کہ اب اس میں وہ بات نہیں رہی یا کچھ نہ کچھ تغیر ہو گیا ہے۔ لوگوں کی ہنسی مصلح اخلاق ہے۔

سو ہم دیکھتے ہیں کہ اس شخص میں جو دوڑتے ہوئے گر پڑتا ہے اور اس شخص میں جو کسی شرارت کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور اس شخص میں جو ایک خیالی دنیا میں رہتا ہے اور اس شخص میں جس کی سیرت کے نقائص مضحکہ انگیز ہوتے ہیں۔ ان سب میں لچک یا فوری تبدیلی کر سکنے کی کمی کے اثرات پائے جاتے ہیں اور یہی سامان تضحیک کی رہنمائی کا باعث ہوتی ہے۔ کشمکش حیات اور سوسائٹی کے تقاضے ہم سے ہمیشہ اس بات کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں کہ ہماری توجہ ہر وقت بیداری اور آگاہی کے ساتھ واقعاتِ حاضرہ کو پیش نظر رکھے اور ساتھ ہی ہمارے جسم اور دماغ میں وہ لچک پائی جائے جس کی بدولت ہم اپنے آپ کو موجودات کے ساتھ مطابقت دے سکیں۔ اگر ہمارے جسم میں اس کی کوتاہی ہو تو ہم مختلف عوارض و حادثات میں مبتلا رہتے ہیں۔ اگر یہ کوتاہی ہمارے دماغ میں پائی جائے تو ہر ایک قسم کی بے وقوفی اور ہر ایک قسم کا جنون ہماری زندگی میں خلل انداز ہوتا ہے۔ اگر یہ کوتاہی ہماری سیرت میں پائی جائے تو ہماری ہستی اپنے گردوپیش کی سوسائٹی میں بے جوڑ سی رہ جاتی ہے۔ طرح طرح کے مصائب ہم پر نازل ہوتے ہیں اور انواع واقسام

کے جرائم ہم سے سرزد ہوتے ہیں۔ ہنسی گویا سوسائٹی کی ایک انگشت نمائی ہے۔ جو وقتاً فوقتاً ہماری اصلاح کرتی رہتی ہے۔ اس کا تعلق محض لطافت قلبی سے نہیں۔ اگرچہ یہ کون نہیں جانتا کہ ہم ہنستے صرف اس وقت ہیں جب ہم تحفظ نفس کے تفکرات سے آزاد ہو کر ایک دوسرے کو صرف مخلوق فن اور دلچسپ صنعت کاریاں تصور کرنے لگ جاتے ہیں۔

"پطرس"

(مخزن۔ جنوری ۱۹۲۲ء)

اخبار میں ضرورت ہے

یہ ایک اشتہار ہے لیکن چونکہ عام اشتہار بازوں سے بہت زیادہ طویل ہے اس لئے شروع ہی میں یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوا ورنہ شاید آپ پہچاننے نہ پاتے۔

میں اشتہار دینے والا ایک روزانہ اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔ چند دن سے ہمارا ایک چھوٹا سا اشتہار اس مضمون کا اخباروں میں نکل رہا ہے کہ ہمیں مترجم اور سب ایڈیٹر کی ضرورت ہے یہ غالباً آپ کی نظر سے بھی گزرا ہوگا اس کے جواب میں کئی امیدوار ہمارے پاس پہنچے اور بعض کو تنخواہ وغیرہ چکانے کے بعد ملازم بھی رکھ لیا گیا لیکن ان میں سے کوئی بھی ہفتے دو ہفتے سے زیادہ ٹھہرنے نہ پایا آتے کے ساتھ ہی یہ غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اشتہار کا مطلب وہ کچھ اور سمجھے تھے۔ ہمارا مطلب کچھ اور تھا، مختصر سے اشتہار میں سب باتیں وضاحت کے ساتھ بیان کرنا مشکل تھا جب رفتہ رفتہ ہمارا اصل مفہوم ان پر واضح ہوا یا ان کی غلط توقعات ہم پر روشن ہوئیں تو تعلقات کشیدہ ہوتے تلخ کلامی اور بعض اوقات دست درازی تک نوبت پہنچی۔ اس کے بعد یا تو وہ خود ہی ناشائستہ باتیں ہمارے منہ پر کہہ کر جانے والے کابل ادا کئے بغیر چل دیئے یا ہم نے ان کو دھکے مار کر باہر نکال دیا اور وہ باہر کھڑے نعرے لگایا کئے جس پر ہماری اہلیہ نے ہم کو احتیاطاً دوسرے دن دفتر جانے سے روک دیا اور اخبار بغیر لیڈر ہی کے شائع کرنا پڑا، چونکہ اس قسم کی غلط فہمیوں کا سلسلہ ابھی تک بند نہیں ہوا اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ ہم اپنے مختصر اور مجمل اشتہار کے مفہوم کو وضاحت کے ساتھ بیان کریں کہ ہمیں کس قسم کے آدمی کی تلاش ہے اس کے بعد جس کا دل چاہے ہماری طرف رجوع کرے جس کا دل

نہ چاہے وہ بے شک کوئی پریس الاٹ کرا کے ہمارے مقابلے میں اپنا اخبار نکال لے۔

امیدوار کے لئے سب سے بڑھ کر ضروری یہ ہے کہ وہ کام چور نہ ہو، ایک نوجوان کو ہم نے شروع میں ترجمے کا کام دیا۔ چار دن کے بعد اس سے ایک نوٹ لکھنے کو کہا تو بھڑک کر بولے کہ میں مترجم ہوں سب ایڈیٹر نہیں ہوں۔ ایک دوسرے صاحب کو ترجمے کے لئے کہا تو بولے میں سب ایڈیٹر ہوں، مترجم نہیں ہوں ہم سمجھ گئے کہ یہ ناتجربے کار لوگ مترجم اور سب ایڈیٹر کو الگ الگ دو آدمی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے اخبار میں یہ قاعدہ نہیں، ہم سے بحثنے لگے کہ آپ نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ دوسرے صاحب کہنے لگے۔ آپ کے اشتہار میں عطف کا استعمال غلط ہے۔ ایک تیسرے صاحب نے ہمارے ایمان اور ہمارے صرف و نحو دونوں پر فحش حملے کئے اس لئے ہم واضح کئے دیتے ہیں کہ ان لوگوں کی ہم کو ہرگز ضرورت نہیں جو ایک سے دوسرا کام کرنے کو اپنی ہتک سمجھتے ہیں اور اس کے لئے صرف و نحو کی آڑ لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو ملازم ہوں گے انہیں تو وقتاً فوقتاً نکڑ کی دکان سے پان بھی لانے پڑیں گے اور اگر انہیں بحث ہی کرنے کی عادت ہے تو ہم ابھی سے کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سب ایڈیٹر کے معنے یہ ہیں۔ ایڈیٹر کا اسم مخفف اخبار میں ایک عہدہ دار کا نام جو ایڈیٹر کو پان وغیرہ لاکر دیتا ہے —

یہ بھی واضح رہے کہ ہمارا اخبار زنانہ اخبار نہیں لہذا کوئی خاتون ملازمت کی کوشش نہ فرمائیں پہلے خیال تھا کہ اشتہار میں اس بات کو صاف کر دیا جائے اور لکھ دیا جائے کہ مترجم اور سب ایڈیٹر کی ضرورت ہے جو مرد ہوں لیکن پھر خیال آیا کہ لوگ مرد کے معنے شاید جوانمرد سمجھیں اور اہل قلم کی بجائے طرح طرح کے پہلوان، گتکا، گارڈ والے اور مجاہد پٹھان ہمارے دفتر کا رخ کریں پھر یہ بھی خیال تھا کہ آخر عورتیں کیوں آئیں گی۔ مردوں کی ایسی بھی کیا قلت ہے لیکن ایک دن ایک خاتون آ ہی گئیں۔ بیرے سے پر نام لکھ کر بھیجا۔ ہمیں معلوم ہوتا کہ عورت ہے تو واپس کرتے ہی کیوں؟ لیکن آج کل نام سے تو پتہ ہی نہیں چلتا۔ فاطمہ، زبیدہ، عائشہ کچھ ایسا

نام ہوتا تو میں غسل خانے کے رستے باہر نکل جاتا لیکن وہاں تو نازجہاں، بجری یا عندلیب گلستانی یا کچھ ایسا ہی فینسی نام تھا۔ آج کل لوگ نام بھی تو عجیب عجیب رکھ لیتے ہیں۔ غلام رسول، احمد دین، مولا داد ایسے لوگ تو ناپید ہی ہو گئے ہیں۔ جسے دیکھئے نظامی گنجوی اور سعدی شیرازی بنا پھرتا ہے اب تو اس پر بھی شبہ ہونے لگا کہ حرارت عزیزی، نزلہ کھانسی، ثعلب مصری ادیبوں ہی کے نام نہ ہوں عورت مرد کی تمیز تو کوئی کیا کرے گا۔ بہرحال ہم نے اندر بلایا تو دیکھا کہ عورت ہے دیکھنے کے یہ معنی ہیں کہ ان کا برقعہ دیکھا اور حسنِ ظن سے کام لے کر اندازہ لگایا کہ اس کے اندر عورت ہے ہم نے بصد ادب و احترام کہا کہ ہم خواتین کو ملازم نہیں رکھتے انہوں نے وجہ پوچھی ہم نے کہا، پیچیدگیاں کہنے لگیں آگے بولئے ہم نے کہا پیدا ہوتی ہیں۔ بھڑک کر بولیں کہ آپ بھی تو عورت کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے کیونکہ اس امر کا ہماری سوانح عمری میں کہیں ذکر نہیں اس لئے ہم تائید تردید کچھ نہ کر سکے میری ولادت کو انہوں نے اپنا تکیہ کلام بنا لیا، بہتیرا سمجھایا کہ جو ہونا تھا وہ ہو گیا اور بہرحال میری ولادت کو آپ کی ملازمت سے کیا تعلق؟ اور یہ تو آپ مجھ سے کہہ رہی ہیں اگر ہمارے پروپرائٹر سے کہیں تو وہ آپ کی اور میری ہم دونوں کی ولادت کے متعلق وہ وہ نظریئے بیان کریں کہ آپ ہکا بکا رہ جائیں۔ خدا خدا کر کے پیچھا چھوٹا۔

ہمارے اخبار میں پروپرائٹر کا احترام سب سے مقدم ہے وہ شہر کے ایک معزز ٹوپو ہولڈر ہیں۔ اخبار انہوں نے محض خدمتِ خلق اور رفاہِ عام کے لئے جاری کیا ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ پبلک ان کی شخصیت اور مشاغل سے ہر وقت باخبر رہے چنانچہ ان کے پوتے کا ختنہ، ان کے ماموں کا انتقال، ان کے صاحبزادے کی میٹریکولیشن میں حیرت انگیز کامیابی (حیرت انگیز اس معنوں میں کہ پہلے ہی ریلے میں پاس ہو گئے) ایسے واقعات سے پبلک کو مطلع کرنا ہر سب ایڈیٹر کا فرض ہوگا نیز ہر اس پریس کانفرنس میں جہاں خورد و نوش کا انتظام بھی ہو ہمارے پروپرائٹر مع اپنے دو چھوٹے بچوں کے جن میں سے لڑکے کی عمر سات سال اور لڑکی کی پانچ سال ہے شریک ہوں گے اور بچے فوٹو میں بھی شامل ہوں گے اور کسی سب ایڈیٹر کو زیب فقرے

کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ یہ بچے بہت ہی ہونہار ہیں اور حالاتِ حاضرہ میں غیر معمولی دلچسپی لیتے ہیں۔ کشمیر کے متعلق پریس کانفرنس ہوئی تو چھوٹی بچی ہندوستانیوں کی ریشہ دوانیوں کا حال سن کر اتنے زور سے روئی کہ خود سردار ابراہیم اسے گود میں لئے لئے پھرے تو کہیں اس کی طبیعت سنبھلی۔

ہمارے اخبار کا نام "آسمان" ہے پیشانی پہ یہ مصرعہ مندرج ہے کہ آسمان بادل کا پہلے خرقہ دیرینہ ہے اس فقرے کو بدلنے کی کوئی سب ایڈیٹر کوشش نہ فرمائیں کیونکہ یہ خود ہمارے پروپرائٹر صاحب کا انتخاب ہے ہم نے شروع شروع میں ان سے پوچھا بھی تھا کہ صاحب اس مصرعے کا اخبار سے کیا تعلق ہے کہنے لگے اخبار کا نام آسمان ہے اور اس مصرعے میں بھی آسمان آتا ہے ہم نے کہا، بجا لیکن خاص اس مصرعے میں کیا خوبی ہے کہنے لگے علامہ اقبال کا مصرعہ ہے اور علامہ اقبال سے بڑھ کر شاعر اور کون ہے اس پہ ہم چپ ہوگئے پیشانی پہ اردو کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار بھی لکھا ہے یہ میرا تجویز کیا ہوا ہے اسے بھی بدلنے کی کوشش نہ کی جائے کیونکہ عمر بھر کی عادت ہے ہم نے جہاں جہاں ایڈیٹری کی اپنے اخبار کی پیشانی پہ ضرور لکھی۔

بعض امیدوار ایسے بھی آتے ہیں کہ آتے کے ساتھ ہی ہمیں سے سوالات پوچھنے لگتے ہیں ایک سوال بار بار دہراتے ہیں کہ آپ کے اخبار کی پالیسی کیا ہے۔ جیسے کوئی پوچھے کہ آپ کی ذات کیا ہے ہماری پالیسی میں چند باتیں تو مستقل طور پر شامل ہیں مثلاً ہم عربوں کے حامی ہیں اور امریکہ سے ہرگز نہیں ڈرتے چنانچہ ایک دن تو ہم نے پریذیڈنٹ ٹرومین کے نام اپنے اخبار میں ایک کھلی چٹھی بھی شائع کر دی لیکن عام طور پر پالیسی میں جمود کے قائل ہیں اسی لئے سب ایڈیٹر کو مسلسل ہم سے ہدایات لینی پڑیں گی۔ ہفتہ رواں میں ہماری پالیسی یہ ہے کہ پنڈی گھیپ کے ہیڈ ماسٹر کو موسم سرما سے پہلے پہل یا ترقی دلوائی جائے یا ان کا تبادلہ لاہور کرایا جائے دراصل ان کی شادی ہمارے پروپرائٹر کی لڑکی سے طے پا چکی ہے اور خیال ہے کہ موسم سرما میں شادی کر دی جائے۔

انشا کے متعلق ہمارا خاص طرزِ عمل ہے اور ہر سب ایڈیٹر اور مترجم کو اس کی مشق بہم پہنچانی پڑے گی۔ مثلاً پاکستان بنا نہیں معرضِ وجود میں آیا ہے۔ ہوائی جہاز اڑتا نہیں محوِ پرواز ہوتا ہے۔ مترجموں کو اس بات کا خاص طور پہ خیال رکھنا پڑے گا۔ ایک مترجم نے لکھا کہ کل مال روڈ پر دو موٹروں کی ٹکر ہوئی اور تین آدمی مر گئے حالانکہ انہیں کہنا چاہیئے تھا۔ کہ دو موٹروں کے تصادم کا حادثہ رونما ہوا جس کے نتیجے کے طور پر چند اشخاص جن کی تعداد تین بتائی جاتی ہے۔ مہلک طور پہ مجروح ہوئے۔

لاہور کارپوریشن نے اعلان کیا کہ فلاں تاریخ سے ہر پالتو کتے کے گلے میں پیتل کی ایک ٹکیہ لٹکانی ضروری ہے جس پہ کمیٹی کا نمبر لکھا ہوگا ایک مترجم نے یہ ترجمہ یوں کیا کہ ہر کتے کے گلے میں بلا ہونا چاہیئے حالانکہ کارپوریشن کا مطلب ہرگز یہ نہ تھا کہ ایک جانور کے گلے میں ایک دوسرا جانور لٹکا دیا جائے۔

سینما کے فری پاس سب ایڈیٹر کے مشاہرے میں شامل نہیں۔ یہ پاس ایڈیٹر کے نام آتے ہیں اور وہی ان کو استعمال کرنے کا مجاز ہے۔ فی الحال یہ پروپرائٹر اور ان کے اہل خانہ کے کام آتے ہیں لیکن عنقریب اس بارے میں سینما والوں سے ایک نیا سمجھوتہ ہونے والا ہے اگر کوئی سب ایڈیٹر اپنی تحریر کے زور سے کسی سینما والے سے پاس حاصل کرے تو وہ اس کا اپنا حق ہے لیکن اس بارے میں ایڈیٹر کے ساتھ کوئی مفاہمت کر لی جائے تو بہتر ہوگا، علی ہذا جو اشیا ریویو کے لئے آتی ہیں مثلاً بالوں کا تیل، عطریات صابن، ہاضم دوائیاں وغیرہ وغیرہ ان کے بارے میں بھی ایڈیٹر سے تصفیہ کر لینا ہر سب ایڈیٹر کا اخلاقی فرض ہوگا۔

ممکن ہے ان شرائط کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد کوئی شخص بھی ہمارے ہاں ملازمت کرنے کو تیار نہ ہو اس کا امکان ضرور موجود ہے لیکن ہمارے لئے یہ چنداں پریشانی کا باعث نہ ہوگا ہمارے پروپرائٹر آگے ہی دو تین مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ سٹاف بہت بڑھ رہا ہے بہت بڑھ رہا ہے

اور اسی وجہ سے انہوں نے ہماری ترقی بھی روک دی ہے عجب نہیں کہ جب ہم دفتر میں اکیلے رہ جائیں تو وہ ہمیں ترقی دینے پر آمادہ ہو جائیں وہ اصولاً اسٹاف بڑھانے کے خلاف ہیں۔ دانشمندانہ انداز میں کہتے ہیں کہ سٹاف زیادہ ہو تو بات باہر نکل جاتی ہے یہ معلوم کبھی نہیں ہوا کہ کیا بات ہے کونسی بات؟ اپنے ڈپو پر بھی وہ اکیلے ہی کام کرتے ہیں اور اس کی وجہ بھی یہی بتاتے ہیں کہ ورنہ بات باہر نکل جاتی ہے۔

وارفتگیٔ جذبات

بھائی۔ ۔ ۔ ۔ تم سے کیا کہوں طبیعت روز بروز حساس ہوتی جاتی ہے۔ دل میں ایک بے نام سا رنج رہتا ہے جس کو تنہائی اور بھی بڑھا دیتی ہے۔ مختلف اسباب مل کر ایک عجیب بے دلی پیدا کر دیتے ہیں۔ میں فطرتاً ہوس ناک ہوں۔ ناکامیوں نے مجھے دل برداشتہ بنا دیا ہے اس لئے بعض اوقات ایک پیالی کا ٹوٹ جانا زلزلے کی طرح مجھے برہم کر دیتا ہے۔ اسے شاعری نہ سمجھنا۔ یہ حقیقت ہے۔ گھنٹوں مطالعہ میں مشغول رہتا ہوں۔ پھر خیال آتا ہے کہ یہ سب بے فائدہ ہے۔ پہروں سوچتا رہتا ہوں اور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا۔ رات کو لیمپ بجھا دیتا ہوں کہ اب سو جاؤں اور پھر جلا دیتا ہوں کہ نیند نہیں آتی۔ آدھی رات کے وقت گھر کے سب لوگ دن بھر کی کلفت اور تکان کے بعد خواب راحت میں ہوتے ہیں۔ میں اپنے آپ میں اس وقت حیات کی ایک بیداری اور جذبات کی ایک بے قراری پاتا ہوں جو مجھے سونے نہیں دیتی۔

کہیں دور چند غریب پٹھان مزدور رباب بجا رہے ہیں۔ ور پشتو کے کسی دردناک گیت کی فراق زدہ نوا، رباب کی سادہ موسیقی، رات کی تنہائی اور خاموشی دل کے تاروں میں ایک دھیمے سے درد کا نغمہ چھیڑ دیتی ہے جس کو گھنٹوں تک بے حس و حرکت پڑا سنتا رہتا ہوں۔ مضطرب روح سرحدی کوہستانوں کے درشت عشق و حسن کی داستان سن کر اور مضطرب ہو جاتی ہے۔ بار بار یہی تصور آتا ہے کہ ایک جنگجو، غیور اور تنومند افغان نے اپنی بندوق کو کندھے سے اتار کر پتھروں پر رکھ دیا ہے اور ایک ٹیلے پر بیٹھے ہوئے تصنع سے مبرا فقروں میں

اپنے عشق کی کہانی کہہ رہا ہے۔ خیبر کی آغوشِ کوہ کی پروردہ حسینہ کے خوب صورت سڈول بازوؤں کو نسوانیت نے ڈھیلا کر دیا ہے اور اس کی معصوم نگاہوں میں ایک محجوبیت آگئی ہے یکایک اس کے جوانی بھرے سینے کو غیرت نے ابھار دیا ہے اور وہ اپنے چاہنے والے کو بزدلی کے بھوت کے خوف کے طعنے دے رہی ہے۔ رعبِ حسن میں تنی ہوئی اسے اجتناب کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ پھر غصہ میں آکر اس نے اپنی گھاس کی گٹھڑی اور درانتی کو سر پہ رکھ لیا ہے اور ندی کے بیچ میں سے گزر کر اس پار چلی گئی ہے۔ رباب کے تاروں میں ایک اضطراب، ایک شکستگی سنائی دیتی ہے۔ غیرت مند افغان نے اپنی بندوق کو اٹھا کر مضبوط گرفت میں پکڑ لیا ہے اور ایک پتھر پہ کھڑا ارد گرد کی چوٹیوں کو، پتھریلے ٹیلوں کو، بے رحم پہاڑیوں کو طیش کی نظروں سے دیکھ رہا ہے اس کی آنکھوں میں خون ہے اور آگ ہے اس نے بندوق میں ایک کارتوس بھر لیا ہے اور اس بنجر اور رتیلے کوہستان میں اس کے گیت کی مہجور سُریں وادیوں میں گونج گونج کر موت کو تلاش کر رہی ہیں ایک جنگ جو کی موت کو، ایک فاتح کی موت کو عشق اس میدان و کوہ میں آوارہ، سرگرداں پھر رہا ہے۔ اس جستجو میں کہ کہیں ایک بے رحم عورت کی خاطر اپنی جان، مردانگی اور بہادری کے حوالے کر دے خیبر کے بنجر اور ڈراؤنے پہاڑ محبت کی اس وارفتگی کو دیکھ رہے ہیں اور موت کی طرح خاموش اور دہشت انگیز ہیں۔ اس موت کی طرح جو اتنی ظالم ہے کہ نہیں آتی۔ رباب کی موسیقی بے دردی سے دل کے ٹکڑے کر رہی ہے۔

مجھے اس وقت ایک عجیب دور افتادگی، ایک غربت، ایک بے کسی کا احساس ہوتا ہے۔ گویا ایک درماندہ اور راہ گم کردہ مسافر ہوں۔ نظر کو سوائے افق کی ناشکستہ لکیر کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا اور تکان نے منزل سے مایوس کر دیا ہے گویا میں صحرا کی دہشت اور آسمان کی پہنائی میں ایک ذرہ ہوں اور ستاروں کی دور دراز دنیا تک اپنی آواز پہنچانا چاہتا ہوں کیونکہ وہی سب سے نزدیک معلوم ہوتے ہیں۔ چاند کھجور کے درختوں کے ایک جھنڈ میں سے چمک رہا ہے

اور کائنات میں یا چاندنی ہے جو چپ چاپ خاموشی سے برس رہی ہے یا تاریک سائے ہیں جن میں رات نے اپنے پراسرار اقتدار کی ہیبت کو چھپا رکھا ہے۔ فضا میں اس درد کے گیت نے ایک بے حد بے قراری پیدا کر دی ہے۔ میرے دل میں اس وقت ڈر نہیں ہوتا۔ خوف نہیں ہوتا فقط ایک اضطراب ہوتا ہے ایک ناقابلِ بیان بے قراری ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو بستر پہ سکون کی حالت میں مردہ کی طرح دیکھ کر دل غصے میں پیچ و تاب کھاتا ہے کہ میں بے بس کیوں ہوں۔ بس یہ بے بسی کا احساس جذبات میں ایک تلاطم پیدا کر دیتا ہے اور تنہائی ایک عشرستان، بیداری ایک ہنگامہ بن جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ رباب کی موسیقی دھیمی ہو جاتی ہے اور گیت کی لے آہستہ آہستہ چاندنی میں تحلیل ہو کر خاموش ہو جاتی ہے۔ رات کا طلسم جذبات کی سردی پر سکون کی چادر ڈال دیتا ہے۔ آنسو پلکوں پر سوکھ جاتے ہیں اور آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ قدرت کے دل میں رحم آجاتا ہے تو ہوا کے جھونکے تھپک تھپک کر سلا دیتے ہیں نیند آہی جاتی ہے۔ مگر آہ! کس بیداری کے بعد!

(مخزن جولائی ۱۹۲۱ء)

ایک رات

رات کے بارہ بجنے والے ہیں۔ آدھ گھنٹہ ہوا میں مطالعہ سے فارغ ہو چکا ہوں۔ اردگرد
تمام کوٹھی میں مکمل خاموشی اور سکون ہے۔ کھلے ہوئے دروازے میں سے باہر کا تاریک منظر دکھائی
دے رہا ہے۔ جس پر اس قدر سکوت طاری ہے کہ کبھی کبھی ہوا کا ایک جھونکا میرے چہرے پر
دفعتہً ایک کم بقا سی خنکی پیدا کر دیتا ہے۔ تو میں کانپ اُٹھتا ہوں۔ کہیں دور ایک کتا بھونک
رہا ہے جس کی آواز محیط خاموشی میں ایک دھیمی سی ہیبت ہو کر مل گئی ہے۔ جب یہ آواز ایک
لمحہ کے لئے میرے کان تک نہ پہنچے تو اس چپ چاپ میں وحشت کی سی سرسراہٹ سنائی دینے
لگتی ہے اور میرا دل ایک لمحہ کے لئے زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ سکوت کی بے زبان اور ڈراؤنی
آوازوں سے اپنے دل کو ہٹاتا ہوں تو لیمپ کی خاموش روشنی اور گھڑی کی ٹک ٹک اور بھی گھبرا
دیتی ہے میز پر رکھی ہوئی تصویروں کا سکون اور ان کی بے حس و حرکت روحوں کو دیکھ کر کسی قبرستان
کا بھیانک منظر تصور میں آکر ڈراتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کمرے کی تمام چیزیں اس وقت
سو رہی ہیں اور میں اس وقت سگریٹ پینا چاہتا ہوں لیکن میں اس آواز سے خوف کھاتا
ہوں جو دیا سلائی جلاتے وقت اس سنسان سے کے نحیف نغمہ کو اپنی درشتی سے پریشان کر دے
گی۔ مجھے اس بل کھاتی ہوئی دھوئیں کی باریک دھار سے ڈر لگتا ہے جو سلگتے ہوئے سگریٹ سے
ایک نازک اور پُراسرار ناگن کی طرح نکل کر میرے سامنے کہیں تاریکی میں غائب ہو جائے گی
میں دروازے میں سے چمن کی کالی کالی جھاڑیوں کو کچھ دیر دیکھتا رہتا ہوں۔ تو مجھے یہ احساس
ہونے لگتا ہے کہ باہر کی تاریکی ایک مہیب خاموشی کے ساتھ آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہو رہی
ہے اور میرے لیمپ کی روشنی مدھم ہوتی جا رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آہستہ سے اُٹھ کر
دبے پاؤں دروازے تک جا کر اسے ہلکے سے بند کر دوں۔ لیکن میں ڈراؤنی کالی رات سے
ڈرتا ہوں، میں ڈرتا ہوں کہیں میرے حواس اس کی ہوشربائی کے بے حد طلسم سے مسحور ہو
کر رات کی تاریکی کے ساتھ نہ مل جائیں اور میں اس سکوت کے سمندر میں آہستہ سے ڈوب کر
غائب نہ ہو جاؤں۔ مجھے صرف لمبے لمبے بکھرے ہوئے گھنے سیاہ لہروں والے بال دکھائی
دے رہے ہیں۔ اس حسین کے جس نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا ہو۔ ان کی ڈراؤنی سیاہی
میری آنکھوں میں چھا رہی ہے۔ حسن میری آنکھوں سے اوجھل ہے اور خیال میں ایک کانپتی
ہوئی امید کی طرح ڈر ڈر کر جھجک رہا ہے۔ ہوا کے کمزور سے جھونکے میرے بدن میں خون
کی سی ٹھنڈک پیدا کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی میرے ماتھے کے لمبے بال گر کر میری آنکھوں کے
سامنے آ جاتے ہیں تو مجھ پر ایک تھرتھرانے والا ڈر طاری ہو جاتا ہے آنکھیں ان کو دیکھ کر
ہیبت زدہ ہو جاتی ہیں اور ہاتھ ان کو ہٹاتے ہوئے کانپتا ہے۔ فرش پر میرا سیاہ کمبل اس
سکون سے پڑا ہے گویا رات نے اس پر اپنی لمبی لمبی انگلیاں پھیر کر ہوا کے ایک جھونکے
کے ساتھ ہلکے سے اپنی خاموشی کا دھیما سا طلسم پھونک دیا ہے میں اس کو ہاتھ لگاتے ہوئے
سہم جاتا ہوں گویا پُراسرار چپ چپ دنیا کا کوئی بھیانک ساحر یک لخت مجھے اپنی وحشت
دکھائے گا اور میں ہیبت ناک چیخ مارنے کی کوشش کروں گا جو میرے منہ سے نہ نکلے
گی۔ میرا گلا ان تصورات سے خشک ہو رہا ہے۔ میں اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ زبان پھیرتا
ہوں لیکن وہ خشک ہو جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں کسی چیز کو نہ دیکھوں اور رات کی خاموشی
اور میرے سکون میں کوئی اضطراب پیدا ہو جائے لیکن میں اپنے آپ کو کسی جادو میں جکڑے
ہوئے پاتا ہوں۔ جو میری آنکھوں کو زور سے کھولے ہوئے ہے۔ جو میرے سینے کو دبا رہا ہے
اور جو مجھے سانس نہیں لینے دیتا۔ گھڑی کی سوئیاں جن میں میں نے کوئی حرکت نہیں دیکھی

اب کسی اور جگہ میں رات کے ساتھ ساتھ وہ بھی چپ چاپ آہستہ آہستہ سانپ کی طرح آگے چلتی رہی ہیں۔ کیا کمرے کی دیواریں بھی اسی طرح قریب ہوتی جا رہی ہیں۔ کیا کائنات چاروں طرف سے آہستہ آہستہ آگے کو بڑھ کر مجھے بھینچنے کے لئے میری طرف آ رہی ہے اور کیا خاموشی اور تاریکی کے جادو نے مجھے اس تنہا بھیانک موت کے لئے یہاں باندھ رکھا ہے۔

باہر سڑک پر ایک تانگا گزر رہا ہے۔ یہ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز ہے۔ یہ پہیوں کی۔ دو آدمی آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ شاید تھیٹر سے واپس آئے ہوں گے۔ آج تھیٹر میں خدا جانے کونسا کھیل تھا۔ سگریٹ میں نے کہاں رکھے ہیں؟ دیاسلائی کی ڈبیا تو اس جیب میں ہے۔ میں اب سگرٹ پی رہا ہوں۔ اور رات اب میرے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتی سوائے اس کے کہ میں اب سو جاؤں اور صبح پھر اٹھوں۔

(نیرنگِ خیال)

دوست کے نام

از لاہور

اے میرے کراچی کے دوست!

چند دن ہوئے میں نے اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ کراچی میں فنونِ لطیفہ کی ایک انجمن قائم ہوئی ہے جو وقتاً فوقتاً تصویروں کی نمائشوں کا اہتمام کرے گی ـــــ واضح طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے کرتا دھرتا کون اہلِ جنون ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ کو ایسی باتوں کا بے انتہا شوق ہے اور مدت سے ہے اور آپ ادب اور آرٹ کا ذوقِ صحیح رکھتے ہیں۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ آپ اس میں ضرور شریک ہوں گے بلکہ عجب نہیں کہ یہ انجمن آپ ہی کی مساعی کا نتیجہ ہو اور آپ ہی نے اپنی جاذبیت سے ایسے خوش مذاق لوگوں کو ایک نقطے پر جمع کر لیا ہو جنہیں شوق تو ہے لیکن آپ کا سفف نہیں۔ یہ سوچ کر بہت اطمینان ہوا کیونکہ اپنے ہم خیالوں کی ایک انجمن بنا کر آپ کو ضرور ایک گونہ تقویتِ قلب نصیب ہو گی۔ ورنہ تن تنہا کتابوں اور تصویروں سے راز و نیاز کی باتیں کرتے کرتے انسان تھک جاتا ہے۔ ذوقِ سلیم کی تازگی پر تنہائی کی وحشت اور تلخی غالب آنے لگتی ہے انسان دیوانہ نہیں تو عیلِ دماغ ضرور ہو جاتا ہے اور غالب کا ایک مصرعہ قافیہ بدل کر پڑھنے کو جی چاہتا ہے کہ "مقدور ہو تو ساتھ رکھوں رازداں کو میں"

لیکن اے دوست! کیا اس کام میں کسی نے آپ کی مزاحمت نہیں کی؟ کیا کسی مقامی

اخبار نے جل کر نہیں لکھا کہ پاکستان پر ابتلا کا زمانہ آیا ہوا ہے اور آپ جیسے خوش فکروں کو مصوری اور نقاشی کا شوق چرایا ہے؟ کسی نے جلتے ہوئے شہر روما اور نیرو کی سارنگی کا فقرہ نہیں کسا؟ کسی "سنوں چشم بد دور" ہیں آپ دین کے عنے مسجد میں واعظ کرتے ہوئے آپ کے لہو ولعب اور تفریح کوشی پر نفرین نہیں کی؟ اور آپ پر کفر اور شرک اور الحاد کا فتوےٰ لگا کر لوگوں کو آپ کے خلاف نہیں اکسایا؟ اور کچھ نہیں تو کیا کسی کھاگس مصلحت بین افسر نے ہمدردی اور تہذیب کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ آپ کو یہ مشورہ نہیں دیا کہ برخوردار

بیانگِ چنگ مخور مے کہ محتسب تیز است؟

اور بالفرض ان باتوں سے بچ نکلے تو کیا ضیافت کے موقعے پر کسی نیم تعلیم یافتہ ہمعصر نے جو تنخواہ میں آپ سے برتری کا دعوے دار ہے آپ کی آنادمنشی کا مضحکہ نہیں اڑایا؟ اور جب آپ پٹے ہوتے نظر آئے تو آپ پر قہقہے بلند نہیں ہوتے؟

اگر آپ کو ایسی منزلیں پیش آئیں تو کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہوگی یا پھر بیزاری اور بددلی پک رہی ہوگی اور آپ کو ابھی دکھائی یا سنائی نہ دی ہو گی ورنہ جس حسنِ مذاق پر آپ کو غرہ ہے وہ تو آج کل ایک مہاجر یتیم کی طرف بھوکا اور ننگا کسی کھنڈر کے کونے میں سر نہڑائے بیٹھا ہے اور باہر بڑا اپڑ مینہ برس رہا ہے اور آندھیاں چل رہی ہیں۔

"پچھلے سال قائداعظم یہاں تشریف لائے ـــ اور وہ باغ جس کو لارنس گارڈن کہا کرتے تھے اس میں جو قطعہ "روز گارڈن" کہلاتا تھا وہاں ایک عظیم الشان پارٹی ہوئی۔ اس دن جو پاکستانی لاہور کا پہلا جشن کا دن تھا "روز گارڈن" کا نام "گلستانِ فاطمہ" رکھا گیا۔ اور یہ نام ایک بورڈ پر لکھ کر باغ میں جو چھوٹی سرخ اینٹوں کی خوب صورت محراب استادہ ہے اس کی پیشانی پر نصب کیا گیا لیکن اس کی کتابت ایسی کریہہ اور طفلانہ تھی۔ کہ مدرسہ کے لڑکوں کو بھی کسی انسپکٹر کی تشریف آوری پر ایسا قطعہ لٹکاتے ہوئے شرم آتی۔ "گلستانِ فاطمہ" کی بے ذوق ترکیب سے قطع نظر کیجئے اور اس کے مصنوعی پن کو جانے دیجئے جس کی بدولت

نہ وہ غریب ہی اس نام سے مانوس ہوں گے جو دوپہر کے وقت درختوں کے سایے میں اپنا گرد آلود جوتا سر کے نیچے رکھ کر اس باغ میں سو جاتے ہیں۔ نہ پتلون پوش ہی اس میں کوئی کشش پائیں گے۔ جو شام کے وقت موٹروں میں سوار ہو کر یہاں ٹینس کھیلنے آتے ہیں لیکن جب ان جلووں کی پیاسی گنہگار آنکھوں نے اسے یوں ایک نمایاں جگہ پر منقوش دیکھا تو نظر اور دل دونوں مجروح ہوئے۔ کیونکہ ایسے شاندار موقع کے لئے اس سے بدصورت کتابت کی نمائش ذہن میں نہ آ سکتی تھی۔ مسلمانوں کی قوم، وہ قوم جو کئی پشتوں سے فنِ خوشنویسی کی علمبردار ہے جس نے قرآن پاک کے ہزاروں نسخے اس صناعی اور ہنرمندی سے لکھے کہ کاتبِ قدرت نے بھی ان کو آفرین کہا ہوگا پنجاب کا خطہ، وہ خطہ جسے نستعلیق کی ایک جدید اور جمیل طرز کے موجد ہونے کا فخر حاصل ہے لاہور کا شہر، وہ شہر جہاں ہر گلی میں ایک خوشنویس رہتا ہے اور جہاں حکیم فقیر محمد مرحوم جیسے استاد ف... ہوئے۔ جن کے سامنے ہندوستان بھر کے جادو رقم زانوئے تلمذ تہ کرتے تھے اور ... پر یہ حال کہ اس تقریبِ سعید پر اس شہر میں، مسلم قوم کی طرف سے عقیدت اور محبت کے صرف دو لفظ لکھنے پڑیں اور ان کے بھی دائرے غلط ہوں اور نشست بے ڈھنگی ہو۔ آپ دیکھتے تو یقیناً آپ کو اس کی تہ میں بدمذاقی کا عروج نظر آتا اور آپ پژمردہ ہو جاتے اور ڈھونڈتے پھرتے کہ کس کے پاس جا کر شکایت کروں اور لوگ آپ کو دیوانہ سمجھتے اور بعض ایسے بھی ہوتے کہ ایسی خردہ گیری پر آپ کو بدتمیز کہتے یا آپ سے توقع رکھتے کہ آپ ہر قباحت کو حسن سمجھیں یا حسن کہیں۔ ورنہ آپ پر پاکستان میں کیڑے ڈالنے کا الزام لگتا اور آپ کی وفاشعاری پر حرف آتا۔

اب آپ اس انجمن کے چکر میں اپنے آپ کو کسی منبر پر پائیں اور آپ کے سامنے آپ کے ہم قوم جمع ہوں اور وہ آپ کو زبان کھولنے کی اجازت دیں تو آپ جو سینے میں دردمند دل رکھتے ہیں یہ کہنے سے کیونکر باز آئیں گے کہ اے مسلمانو! تمہارے آبا و اجداد خط اور دائرے اور خم اور زاویے کا وہ ذوق رکھتے تھے کہ دنیا میں اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ کوئی اور

طغرے، نستعلیق اور نسخ کس کس نہج سے انہوں نے ابجد سے عشق کیا ہے۔ ان کے ایوانوں میں آویزاں وصلیوں کو دیکھو، ان کے مطلا اور مذہب نسخوں کو دیکھو، ان کے روضوں اور محلوں ان کی مسجدوں اور خانقاہوں ان کے فرامین اور سکوں اور مہروں، ان کی قبروں اور ان کے کتبوں کو دیکھو۔ مرگ یا زیست کا کوئی مقام سطوت یا افلاس، مسرت یا ماتم، جشن یا یکسوئی، خلوت یا جلوت کا کوئی مقام ایسا ہے جہاں انہوں نے قلم اٹھایا ہو اور ان کے قلم نے حسین و جمیل حروف کے لافانی نقوش چوب و قرطاس و سنگ پر ثبت نہ کر دیئے ہوں۔ اب جب کہ خدا نے تمہیں اپنے کلچر کے احیا اور تحفظ کے لئے سب قوتیں تمہارے ہاتھ میں دے دی ہیں۔ قسمیں کھا لو کہ اس ورثہ کو ہاتھ سے جانے نہ دو گے اور عہد کر لو کہ آج سے تمہاری دکانوں، تمہارے مکانوں، تمہارے دفتروں، تمہاری کتابوں اور اخباروں اور رسالوں، تمہاری مسجدوں اور تمہارے مزاروں، تمہارے سرناموں اور تمہارے نوٹس بورڈوں پر جہاں جہاں تمہارے ہاتھ ابجد کے خط کھینچیں گے اسلاف کا نام روشن کر دیں گے اور جو نزاکتیں اور لطافتیں اور رعنائیاں انہوں نے صدیوں میں پیدا کی ہیں انہیں مسخ نہ ہونے دیں گے تاکہ جہاں کسی کو تمہاری تحریر نظر آئے وہ جان لے کہ یہ مسلمان کا لکھا ہوا ہے اس قوم کا لکھا ہوا ہے جس نے دنیا میں خوش خطی کا مرتبہ بلند کیا اور جو اب بھی اپنی حسن آفرینی پر ناز کرتی ہے

یہ کہنے سے آپ کیونکر باز آئیں گے؟ لیکن کیا آپ کی بات کوئی سنے گا؟ کیا کراچی میں ہیں ایسے لوگ؟ فنون لطیفہ کی انجمن تو آپ نے بنالی ہے۔

اور پھر خوش نویسی تک تو عافیت رہے گی لیکن کیا آگے بھی بڑھئے گا؟ تصویروں کا ذکر بھی کیجئے گا؟ اخبار میں لکھا تھا کہ آپ تصویروں کی نمائش کا اہتمام کر رہے ہیں۔ یہ سچ ہے تو اے دوست وقتاً فوقتاً مجھے اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہئے گا۔ کیونکہ اگر کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ نہیں تو آپ کو بے انتہا جسارت سے کام لینا پڑے گا اور عجب نہیں کہ لوگ آپ کا حال دیکھ کر عبرت پکڑا کریں۔

ہمارے ملک میں اس وقت کوئی بھی ادارہ ایسا نہیں جسے آپ صحیح معنوں میں آرٹ سکول کہہ سکیں۔ لاہور یونیورسٹی کے نصاب میں آرٹ بحیثیت ایک مضمون کے شامل تھا لیکن یہ ایک مخلوط سا شغل تھا جس میں تھوڑی سی موسیقی، تھوڑی سی مصوری اور کچھ صنعت اور دستکاری سب چٹکی چٹکی بھر پھینک دی گئی تھیں اور اس معجون کو ایک زنانہ مشغلہ سمجھ کر صرف لڑکیوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ یہ مضمون اب بھی نصاب میں موجود ہے۔ لیکن کب تک؟ فی الحال تو ایک یورپین خاتون میسر ہیں جو یہ مضمون پڑھاتی ہیں وہ کہیں ادھر ادھر ہو گئیں اور کوئی عورت ان کی جگہ دستیاب نہ ہوئی تو یہ قصہ بھی پاک ہو جائے گا۔ کیونکہ لڑکیوں کو پڑھانے کا کام خدانخواستہ کسی مرد کے سپرد ہوا تو زلزلے نہ آ جائیں گے؟ اور پھر اس مضمون کا حلیہ بھی سرعت کے ساتھ بدل رہا ہے۔ موسیقی تو ته کر کے رکھ دی گئی ہے کیونکہ کس کی مجال کہ اس کی بیٹی اس کے دستخط سے یہ لکھوا بھیجے کہ ہمیں گانے کا شوق ہے؟ باقی رہی تصویر کشی تو ایک ملنے والے اگلے دن سنا گئے کہ ایک کالج نے کہلوا بھیجا ہے کہ ہماری لڑکیاں جانداروں کی شکلیں نہ بنائیں گی۔ چنانچہ تجویز ہو رہی ہے کہ تصویر کشی کی مشق صرف سیب، ناشپاتی، مرتبان یا پہاڑ دریا، جنگل پر کی جائے۔ اس پر ایک آدھ جگہ بحث ہوئی۔ شریعت کا قدم درمیان میں آیا۔ ایک روشن خیال مولوی صاحب نے صرف اتنی ڈھیل دی کہ ہاتھ کی بنی ہوئی تصویریں تو ہرگز جائز نہیں فوٹو البتہ جائز ہے وجہ یہ بتائی کہ فوٹو میں انسان کی شبیہ ہو بہو ویسی ہی ہوتی ہے۔ ہاتھ سے تصویر بنائی جائے تو اس میں جھوٹ ضرور سرایت کر جاتا ہے کسی نے کہا فوٹو بھی تو کئی حرفتوں سے لی جاتی ہے اور بعض فوٹو گرافر بھی تو بڑے فن کار ہوتے ہیں جواب ملا کہ چابکدستی اور تکلف سے کام لیا جائے تو فوٹو بھی جائز نہیں رہتا۔ غرضیکہ ان کے نزدیک اسی ایک فوٹو گرافر کا کام حق و راستی کا آئینہ دار ہے جو لاہور کے چڑیا گھر کے باہر جا پارا آنے میں تصویر کھینچتا ہے یہ حال تو جاندار اشیاء کا ہے باقی رہے جنگل، پہاڑ، دریا تو وہاں بھی ایک نہ ایک دن کوئی کو توال حق ہیں مصوروں کے "جھوٹ" کو گردن سے

جادو بوچے گا۔ اور آپ چیختے اور سسکتے رہ جائیں گے کہ یہ تو دین گوگ ہے! یہ تو بہت بڑا آرٹسٹ ہے! اور آپ کے ہاتھوں سے تصویر نوچ کر پھاڑ دی جائے گی۔

ان حالات میں چغتائی کے جیسے کا امکان بہت کم ہے کوئی بات "سچ"، بھی ہوتی ہے اس کی تصویروں میں؟ درخت تک تو مجنوں کی انگلیاں معلوم ہوتے ہیں اور پھر انسانوں کی تصویریں بنانے سے بھی تو وہ نہیں چوکتا اور صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی۔ غزال چشم، سینہ چاک اور بعض اوقات محرم کے بند تک دکھائی دیے جاتے ہیں۔ گو یقین سے کچھ کہنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ چغتائی کی تصویروں میں تسمے، ڈوریاں، پھندنے بہت ہوتے ہیں اور سمجھ میں نہ آئے کہ یہ تسمہ یا ڈوری بیلٹے کے لباس کا حصہ ہے یا ناقہ کے ساز و سامان کا۔ لیکن چغتائی کی وجہ سے ایک سہولت ضرور نظر آتی ہے وہ یہ کہ لے دے کے یہی ایک ہمارا مصور رہ ہے۔ اسے دفن کر دیا تو یہ وبا فوراً ختم ہو جائے گی اور ہماری مصوری ایک ہی ضرب سے ہمیشہ کے لئے پاک ہو جائے گی۔ باقی رہی مغلوں کے قدیم نمونے جو چند لوگوں کے پاس بطور ترک محفوظ ہیں یا جن کی انڈیا آفس کے عجائب خانے کی تقسیم کے بعد پاکستان کو مل جانے کی اُمید ہے تو ان کو کسی اور ملک کے ہاتھ بیچ کر دام وصول کئے جا سکتے ہیں۔ کیا کراچی میں لوگوں کا یہ خیال نہیں؟ اگر نہیں تو کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہو گی۔

لیکن یہ کیونکہ ہو سکتا ہے؟ کراچی کونسا ایسا جزیرہ ہے اور کونسے گم شدہ براعظم میں واقع ہے کہ ارد گرد کے سمندر کی کوئی لہر وہاں تک نہ پہنچ سکے گی؟ آپ کو تعمیر اور تخلیق کی سوجھ رہی ہے۔ لیکن یہاں تو تخریب کا دور دورہ ہے۔ ہاتھوں سے لٹھ چھین کر اس کی جگہ قلم اور موقلم آپ کیونکر رکھ دیں گے؟ آپ کوئی سا ہیجان پیدا کیجئے۔ آپ کے دیکھتے دیکھتے وہ تخریب کی راہ اختیار کر لیتا ہے۔ لوگ جس چیز کا نعرہ لگا کر اُٹھتے ہیں۔ سب سے پہلے اسی چیز کا خون کر لیتے ہیں۔ آپ کہئے کہ رمضان کا احترام واجب ہے تو لوگ ٹولیاں بنا بنا کر بازاروں میں ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ کس کا منہ کالا کریں۔ آپ اسلام کی عوت دیجئے تو

تلاشی شروع ہو جاتی ہے کہ کس کے وزے سلگا میں؟ کسے سنگسار کریں؟ آپ حیا کی تلقین کیجئے تو لوگ سربازار عورتوں کے منہ پر تھوکنے لگتے ہیں اور پھبتیوں پر اتر آتے ہیں۔ یہ ما نہ زور آزماتے ہیں سہ

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی؟

ایسے غیظ و غضب کی فضا میں بھی آج تک کہیں آرٹ پنپتا ہے؟ آرٹ کے لئے تو ضبط اور نسق اور استحکام اور اخلاق اور فراغ لازم ہیں یا پھر کوئی ولولہ کوئی امنگ کوئی عشق جو دلوں کے دروازے کھول دے اور ان میں سے شعر و سخن، نغمہ و رنگ کے طوفان اچھل اچھل کر باہر نکل پڑیں۔ کیا کبھی آرٹ ایسے میں بھی پنپتا ہے؟ کہ ہر بڑے کو دولت اور اقتدار کی ہوس نے اندھا اور بہرہ کر رکھا ہو اور ہر چھوٹا اپنی بے بضاعتی کا بدلہ ہمسائے اور راہگیر سے لینے پہ تلا ہوا ہو۔ نہ کوئی اقتصادی نظام ایسا ہو کہ ہر چیز کی پوری قیمت اور ہر قیمت کی پوری چیز نصیب ہو اور لوگ فاقے کے ڈر سے نجات پا کر قناعت کی گود میں ذرا آنکھ جھپک لیں۔ نہ کوئی اخلاقی نظام ایسا ہو کہ لوگوں کو اس دنیا یا اس دنیا میں کہیں بھی جزا و سزا کی امید یا خوف ہو۔ نہ مسرت کا کوئی ایسا جھونکا آئے کہ درختوں کی ٹہنیاں مست ہو کر جھومیں اور پتوں کی سرسراہٹ سے آپ ہی آپ نغمے پیدا ہوں۔ نہ عافیت کا کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں آپ کا فنکار معتکف ہو کر بیٹھ جائے۔ اور آپ کے لئے تصویریں بناتا رہے۔ نہ آس پاس کوئی ایسی نرالی بستی ہو جہاں شاعر غریب شہر بن کر گھومتا پھرے اور لوگ اسے دیوانہ اجنبی سمجھ کر اسے پکھ لینے دیں۔ فنونِ لطیفہ کی انجمن تو آپ نے بنالی ہے لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں پہلا کام اس انجمن کا یہ نہ ہو کہ چند تصویروں کو مخربِ اخلاق اور عریاں کہہ کر جلا دیا جائے۔ چند مصوروں پر اوباشی اور بے دینی کی تہمت لگا کر انہیں ذلیل کیا جائے۔ یا پھر ان پر ایسے لوگ مسلط کر دیئے جائیں جو ان کے ہنر کو کھردری کسوٹیوں پہ پرکھیں اور ان پر وہ نسخ کر دیں کہ جس برتری کا انہیں دعوےٰ تھا اس کا دور اب

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں

پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے

میں جانتا ہوں کہ آپ آرٹ کو عشرت نہیں سمجھتے اسے محض امارت کا دل بہلاوا نہیں سمجھتے آپ ایسے نہیں کہ آپ کو جاندار ہی کی تصویر پہ اصرار ہو یا محض تصویر ہی پر اصرار ہو۔ حسن کو اختیار ہے جہاں چاہے رہے جو شکل چاہے اختیار کرے صرف یہ ہے کہ زندہ رہے اور امیر غریب، چھوٹے بڑے، ادنٰے اعلٰے سب پہ اپنی بخششیں ارزانی فرمائے۔ ایک زمانہ تھا کہ آرٹ اور صنعت و حرفت کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔ آپ تو اس عہدِ زریں کو واپس لانا چاہتے ہوں گے: تاکہ آرٹ کا جلوہ بچوں کے کھلونوں میں، کسان کے تہمد میں، بیلانی کے ہاتھ کی چھڑی میں، پنہاری کے مٹی کے گھڑوں میں، غرض زندگی کے ہر گوشے میں نور پاش ہو لیکن جو ننھی ننھی شمعیں یہاں وہاں ٹمٹما رہی ہیں انہیں ہی بجھا دیا گیا تو لاکھوں انسانوں کی زندگیاں جو ابھی تک تاریک پڑی ہیں وہ کیسے جگمگائیں گی؟ کیا کراچی میں جو آپ کے ہم جلیس ہیں انہیں اس بات کا احساس ہے؟ اگر ہے تو انہیں بتا دیجئے کہ آرٹ کی ایک مسکراہٹ کے لئے انہیں اس بیگانۂ تبسم ماحول میں کئی صحرا چھاننے پڑیں گے۔

فرخنہ نیست کہ در پہلوئے آں صد غم نیست

روزِ مولودِ جہاں کم ز شبِ ماتم نیست

اگر یہ محض میرا وہم ہے تو اے دوست پھر کراچی سب سے الگ تھلگ کوئی جگہ ہوگی تو پھر اے دوست ہم سب کو وہاں بلا لیجئے یا کراچی کو اتنا وسیع کیجئے کہ ہم سب اس میں سما جائیں۔

کراچی میں آپ نے بہت کچھ رسوخ پیدا کر لیا ہوگا۔ آپ کے اخلاص اور اصابت رائے کے سب لوگ قائل ہوں گے۔ بڑے بڑے افسروں سے آپ کی ملاقات ہوگی۔

بڑے بڑے اربابِ حل و عقد کا قرب نصیب ہوگا۔ ان سے کہئے کہ

منزلِ راہرواں دور بھی دشوار بھی ہے

کوئی اس قافلہ میں قافلہ سالار بھی ہے

(نقوش جشنِ آزادی نمبر ۱۹۴۸ء)

بچّے

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ بچوں کی کئی قسمیں ہیں مثلاً بلی کے بچے، فاختہ کے بچے وغیرہ مگر میری مراد صرف انسان کے بچوں سے ہے۔ جن کی ظاہرا تو کئی قسمیں ہیں۔ کوئی پیارا بچہ ہے اور کوئی ننھا بچہ ہے، کوئی پھول سا بچہ ہے اور کوئی چاند سا بچہ ہے لیکن یہ سب اس وقت تک کی باتیں ہیں جب تک برخوردار پنگوڑے میں سویا پڑا ہے۔ جہاں بیدار ہونے پر بچے کے پانچوں حواس کام کرنے لگے، بچے نے ان سب خطابات سے بے نیاز ہو کر ایک الارم کلاک کی شکل اختیار کر لی۔

یہ جو میں نے اوپر لکھا ہے کہ بیدار ہونے پر بچے کے پانچوں حواس کام کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہ میں نے حکماء کے تجربات کی بنا پر لکھا ہے ورنہ حاشا وکلا میں اس بات کا قائل نہیں۔

کہتے ہیں بچہ سنتا بھی ہے اور دیکھتا بھی ہے لیکن مجھے آج تک سوائے اس کی قوت ناطقہ کے اور کسی قوت کا ثبوت نہیں ملا۔ کئی دفعہ ایسا اتفاق ہوا ہے کہ روتا ہوا بچہ میرے حوالے کر دیا گیا ہے کہ ذرا اسے چپ کرانا۔ میں نے جناب اس بچے کے سامنے گانے گائے ہیں شعر پڑھے ہیں، ناچ ناچے ہیں، تالیاں بجائی ہیں، گھٹنوں کے بل چل کر گھوڑے کی نقلیں اتاری ہیں، بھیڑ بکری کی سی آوازیں نکالی ہیں، سر کے بل کھڑے ہو کر ہوا میں بائیسکل چلانے کے نمونے پیش کئے ہیں لیکن کیا مجال جو اس بچے کی یکسوئی میں ذرا بھی فرق آیا ہو یا جس سُر پر اس نے شروع کیا تھا اس سے ذرا بھی نیچے اترا ہو اور خدا جانے ایسا بچہ دیکھتا ہے۔

اور سنتا ہے تو کس وقت؟

بچے کی زندگی کا شاید ہی کوئی لمحہ ایسا گزرتا ہو جب اس کے لئے کسی نہ کسی قسم کا شور ضروری نہ ہو۔ اکثر اوقات تو وہ خود ہی سامعہ نوازی کرتے رہتے ہیں۔ ورنہ یہ فرض ان کے لواحقین پہ عائد ہوتا ہے۔ ان کو سلانا ہو تو لوری دیجئے۔ ہنسانا ہو تو مہمل سے فقرے بے معنی منہ بنا کر بلند سے بلند آواز میں ان کے سامنے دہراتیے اور کچھ نہ ہو تو شغل بے کاری کے طور پر ان کے ہاتھ میں ایک جھنجھنا دے دیجئے۔ یہ جھنجھنا بھی کم بخت کسی بے کار کی ایسی ایجاد ہے کہ کیا عرض کروں یعنی ذرا سا آپ ہلا دیجئے لڑھکتا چلا جاتا ہے اور جب تک دم میں دم ہے اس میں سے ایک ایسی بے سُری، کرخت آواز متواتر نکلتی رہتی ہے کہ دنیا میں شاید اس کی مثال محال ہے اور جو آپ نے "مامتا" یا "باپتا" کے جوش میں آکر برخوردار کو ایک عدد وہ ربڑ کی گڑیا منگوا دی جس میں ایک بہت ہی تیز آواز کی سیٹی لگی ہوتی ہے تو بس پھر خدا حافظ۔ اس سے بڑھ کر میری صحت کے لئے مضر چیز دنیا میں اور کوئی نہیں سوائے شاید اس ربڑ کے تھیلے کے جس کے منہ پر ایک سیٹی دار نالی لگی ہوتی ہے اور جس میں منہ سے ہوا بھری جاتی ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو والدین کہلاتے ہیں، بدقسمت ہیں تو وہ بے چارے جو قدرت کی طرف سے اس ڈیوٹی پر مقرر ہوئے ہیں کہ جب کسی عزیز یا دوست کے بچے کو دیکھیں تو ایسے موقع پہ ان کے ذاتی جذبات کچھ ہی کیوں نہ ہوں وہ یہ ضرور کہیں کہ کیا پیارا بچہ ہے۔

میرے ساتھ کے گھر ایک مرزا صاحب رہتے ہیں۔ خدا کے فضل سے چند بچوں کے والد ہیں۔ بڑے بچے کی عمر نو سال ہے۔ بہت شریف آدمی ہیں۔ ان کے بچے بھی بے چارے بہت ہی بے زبان ہیں۔ جب ان میں سے ایک روتا ہے تو باقی کے سب چپکے بیٹھے سنتے رہتے ہیں۔ جب وہ روتے روتے تھک جاتا ہے تو ان کا دوسرا برخوردار شروع ہو جاتا ہے وہ ہار جاتا ہے تو تیسرے کی باری آتی ہے۔ رات کی ڈیوٹی والے بچے الگ ہیں۔ ان کا سُر ذرا باریک ہے۔ آپ انگلیاں چٹخوا کر، سر کی کھال میں تیل جھسوا کر کانوں میں روئی دے کر لحاف

بس سر لپیٹ کر سو ئیے، ایک لمحے کے اندر آپ کو جگا کے اٹھا کے بٹھا نہ دیں تو میرا ذمہ۔

انہی مرزا صاحب کے گھر پر جب میں جاتا ہوں تو ایک ایک بچے کو بلا کر پیار کرتا ہوں۔

اب آپ ہی بتائیے میں کیا کروں۔ کئی دفعہ دل میں آیا مرزا صاحب سے کہوں حضرت! آپ کی ان نغمہ سرائیوں نے میری زندگی حرام کر دی ہے نہ دن کو کام کر سکتا ہوں۔ نہ رات کو سو سکتا ہوں۔

لیکن یہ میں کہنے ہی کو ہوتا ہوں کہ ان کا ایک بچہ کمرے میں آ جاتا ہے اور مرزا صاحب ایک والدانہ تبسم سے کہتے ہیں "اختر بیٹا! ان کو سلام کرو۔ سلام کرو بیٹا۔ اس کا نام اختر ہے صاحب بڑا اچھا بیٹا ہے کبھی ضد نہیں کرتا، کبھی نہیں روتا، کبھی ماں کو دق نہیں کرتا،" میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ وہی نالائق ہے جو رات کے دو بجے گلا پھاڑ پھاڑ کے رونا ہے۔ مرزا صاحب قبلہ تو شاید اپنے خراٹوں کے زور شور میں کچھ نہیں سنتے، بدبختی ہماری ہوتی ہے لیکن کہتا یہی ہوں کہ "یہاں آؤ بیٹا"، گھٹنے پر بٹھا کر اس کا منہ بھی چومتا ہوں۔

خدا جانے آج کل کے بچے کس قسم کے بچے ہیں۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ہم بقر عید کو تھوڑا سا رو لیا کرتے تھے اور کبھی کبھار کوئی مہمان آ نکلا۔ تو نمونے کے طور پر تھوڑی سی ضد کر لی! (کیونکہ ایسے موقعہ پر ضد کار آمد ہوا کرتی تھی) لیکن یہ کہ چوبیس گھنٹے متواتر روتے رہیں ایسی مشق ہم نے کبھی بہم نہ پہنچائی تھی۔

اب اور تب

جب مرض بہت پرانا ہو جائے اور صحت یابی کی کوئی امید باقی نہ رہے تو زندگی کی تمام مسرتیں محدود ہو کر بس یہیں تک رہ جاتی ہیں کہ چارپائی کے سرہانے میز پر جو انگور کا خوشا رکھا ہے اس کے چند دانے کھا لئے مہینے دو مہینے کے بعد کوٹھے پر غسل کر لیا گاہے گاہے ناخن ترشوا لئے۔

مجھے کالج کا مرض لاحق ہوئے اب کئی برس ہو چکے ہیں۔ شباب کا رنگین زمانہ امتحانوں میں جوابات لکھتے لکھتے گزر گیا۔ اور اب زندگی کے جو دو چار دن باقی ہیں وہ سوالات مرتب کرتے کرتے گزر جائیں گے۔ ایم اے کا امتحان گویا مرض کا بحران تھا یقین تھا اس کے بعد یا مرض نہ رہے گا یا ہم نہ رہیں گے۔ سو مرض تو بدستور باقی ہے اور ہم ـــ ہر چند کہیں کہ ہیں ـــ نہیں ہیں۔ طالب علمی کا زمانہ بے فکری کا زمانہ تھا۔ نرم نرم گدیلوں پر گزرا گویا بستر عیش پر دراز تھا۔ اب تو صاحبِ فراش ہوں۔ اب عیش صرف اس قدر نصیب ہے کہ انگور کھا لیا غسل کر لیا۔ ناخن ترشوا لئے۔

تمام تگ و دو لائبریری کے ایک کمرے اور سٹاف کے ایک ڈربے تک محدود ہے اور دونوں کے درمیان کا ہر موڑ ایک کمین گاہ معلوم ہوتا ہے ـــ

کبھی راوی سے بہت دلچسپی تھی۔ روزانہ علی الصباح اس کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ اب اس کے ایڈیٹر صاحب سے ملتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ کہیں نہ کہیں سلام روستائی کھینچ ماریں گے۔

ہال میں سے گزرنا قیامت ہے۔ وہم کا یہ حال ہے کہ ہر ستون کے پیچھے ایک ایڈیٹر چھپا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

کالج کے جلسوں میں اپنی دریدہ دہنی سے بہت ہنگامہ آرائیاں کیں۔ صدر جلسہ بننے سے ہمیشہ گھبرایا کرتا ہوں کہ یہ "دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ" والا معاملہ ہے اب جب کبھی جلسہ کا سن پاتا ہوں ایک خنک سا ضعف بدن پہ طاری ہو جاتا ہے جانتا ہوں کہ کرسی صدارت کی سولی پہ چڑھنا ہوگا اور سولی بھی ایسی کہ انا الحق کا نعرہ نہیں لگا سکتا۔

قاضی صاحب قبلہ نے اگلے دن کالج میں ایک مشاعرہ کیا۔ مجھ سے بدگمانی اتنی کہ مجھے اپنے عین مقابل ایک نمایاں اور بلند مقام پہ بٹھا دیا اور میری حرکت پر نگاہ رکھی۔ میرے اردگرد محفل گرم تھی اور میں اس میں کینچن جنگا کی طرح اپنی بلندی پر جما بیٹھا تھا۔

جس دن کالج میں تعطیل ہوا کرتی مجھ پہ اداسی سی چھا جاتی۔ جانتا کہ آج کے دن تہمد پوش، تولیہ بردار، صابن نواز ہستیاں دن کے بارہ ایک بجے تک نظر آتی رہیں گی۔ دن بھر لوگ گنے چوس چوس کر جا بجا پھوگ کے ڈھیر لگا دیں گے۔ جو رفتہ رفتہ آثارِ صنادید کا سا مٹیالا رنگ اختیار کر لیں گے۔ جہاں کسی کو ایک کرسی، ورسٹول میسر آگیا وہیں کھانا منگوا لے گا اور کھانا کھا چکنے پر کوئی اور چیلوں کی ایک بستی آباد کرتا جائے گا کہ دنیا میں نام برقرار رہے۔

اب یہ حال ہے کہ مہینوں سے چھٹی کی تاک میں رہتا ہوں۔ جانتا ہوں کہ اگر اس چھٹی سے دن بال نہ کٹواسکے تو پھر بات گرمی کی تعطیلات پہ جا پڑے گی۔ مرزا صاحب سے اپنی کتاب واپس نہ لایا تو وہ بلا تکلف ہضم کر جائیں گے۔ مچھلی کے شکار کو نہ گیا تو پھر عمر بھر زندہ مچھلی دیکھنی نصیب نہ ہوگی۔

اب تو دلچسپی کے لئے صرف یہ باتیں رہ گئی ہیں کہ فورتھ ایئر کی حاضری لگانے لگتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ اس دروازے کے پاس جو نوجوان سیاہ ٹوپی پہنے بیٹھے ہیں اور اس دروازے کے پاس جو نوجوان سفید پگڑی پہنے بیٹھے ہیں۔ حاضری ختم ہونے تک یہ دونوں جادو کی کرامات سے

غائب ہو جائیں گے اور پھر ان میں سے ایک صاحب تو ہال میں نمودار ہوں گے اور دوسرے بھگت کی دکان میں دودھ پیتے دکھائی دیں گے۔ آج کل کے زمانے میں ایسی نظر بندی کا کھیل کم دیکھنے میں آتا ہے۔ یا صاحب کمال کے کرتب کا تماشا کرتا ہوں جو عین لیکچر کے دوران میں کھانستا کھانستا یک لخت اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور بیماروں کی طرح دروازے تک چل کر وہاں سے پھر ایسا بھاگتا ہے کہ پھر مطلق سراغ نہیں ملتا۔ یا ان اہلِ فن کی داد دیتا ہوں جو روزانہ دیر سے آتے ہیں۔ اور یہ کہہ کر اپنی حاضری لگوا لیتے ہیں کہ صاحب غریب خانہ بہت دور ہے جانتا ہوں کہ دولت خانہ ہوسٹل کی پہلی منزل پہ ہے لیکن منہ سے کچھ نہیں کہتا۔ میری بات پر یقین انہیں بھلا کیسے آئے گا اور کبھی ایک دو منٹ کو فرصت نصیب ہو تو دل بہلانے کے لئے یہ سوال کافی ہے کہ ہال کی گھڑی مینار کی گھڑی سے تین منٹ پیچھے ہے۔ دفتر کی گھڑی ہال کی گھڑی سے سات منٹ آگے ہے۔ چپڑاسی نے صبح دوسری گھنٹی مینار کے گھڑیال سے پانچ منٹ پہلے بجائی اور تیسری گھنٹی ہال کی گھڑی سے نو منٹ پہلے تو مرکب سود کے قاعدے سے حساب لگا کر بتاؤ کہ کس کا سر پھوڑا جائے۔

وہی میں نے کہا نا کہ انگور کھا لیا، غسل کر لیا، ناخن ترشوا لئے ؎

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی ۔۔۔ اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی

"پطرس"

(راوی ۱۹۲۹ء)

مینہ برس رہا ہے

مینہ موسلادھار برس رہا ہے۔ ندی نالے چڑھے ہوئے ہیں۔ ہر طرف شام کی سی تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ درخت اور پودے ایک دُھلی ہوئی تصویر کی طرح اپنی سبزی میں زیادہ سبز اور اپنی پاکیزگی میں زیادہ صاف نظر آرہے ہیں پھول اور پرندے۔ نغمہ اور نکہت، رنگ اور بو سب شاداں معلوم ہوتے ہیں۔ اے میری آرزوؤں کی ملکہ میرا دل اداس ہے۔

بارش کی چلمن میں سے کائنات کی دنیائے موہوم دکھائی دیتی ہے جس کو دیکھ کر دل میں اُمنگیں اُٹھ سکتی ہیں۔ مگر جہاں خواہشوں کا پورا ہونا اسی دنیا کے باشندوں کے لئے مخصوص ہے درخت جھومتے ہیں۔ میں ان کو دیکھتا ہوں۔ اُن کے پتے ہل ہل کے لپٹتے اور جھک جھک کے چومتے ہیں۔ ان کی لرزش میں مجھے تیرا تبسم نظر آتا ہے۔ سبزہ لہلہاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں تو اٹھکیلیاں کر رہی ہے۔ پرندے کھیتوں میں چھُپ چھُپ کے گاتے ہیں۔ میرے کانوں میں تیری آواز پڑتی ہے۔ میں یہ سب دیکھتا ہوں۔ سب کچھ سنتا ہوں اور ترستا ہوں یہ تو بارش کے اس پار کی دنیا ہے۔

بجلی چمکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ اس دنیا سے کوئی پیغام آیا لیکن وہ تڑپ تڑپ کے ترساتی ہے اور میں ترس ترس کے تڑپتا ہوں۔ اس کو کہہ کہ اپنا ایک نقرئی تیر میرے سینے تک

پہنچا دے اور اس کو میری حسرتوں میں بجھا کر تجھ تک لے جائے۔ لیکن اے میری حسرتوں کی امید! کیا تو اپنی دنیا میں جہاں ہوائیں چل رہی ہیں اور نالے بہہ رہے ہیں۔ میری ضعیف التجا کے درد کو سُن سکتی ہے؟

پرندے چہچہاتے ہیں۔ میں چپ بیٹھا ہوا سُنتا ہوں۔ میرے سینے میں بھی ایک نغمہ ہے۔ ان کو کہہ کہ وہ مجھے بھی اپنے ساتھ گانے دیں کہ میرے نغمے کی نکہت تیرے بالوں کی طرح کائنات کے دل میں بکھر جائے۔ میں اکیلا اس کی مستی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک شراب ہے کہ جس میں ساقی قدرت نے ایک آبگینہ کے ٹکڑے پھینک دیئے تھے۔ میرے دل میں خراش ہو رہے ہیں۔ اس بلبل کو بھیج دے کہ آکے سُن جائے اور تیرے پاس روتی ہوئی جائے۔

اے میری مقصود انتظار! تو بارش کے اس پار آجا۔ جہاں میرا دل اور میری آنکھیں تیرے لئے خواہشوں اور آرزوؤں کی پاکیزگیاں لئے تیری راہ تک رہی ہیں اس پار آجا۔ پیشتر اس کے کہ میں اپنے ساز کو توڑ دوں اور اپنی تمام آرزوؤں کو ایک درد انگیز چیخ کی صورت میں اپنے سینے سے نکال کر تیرے لئے ویسا ہی موہوم بن جاؤں جس طرح تو آج میرے لئے ہے۔

"پطرس"

(کہکشاں۔ اپریل ۱۹۲۰ء)

تنزّل

مجھے نہیں معلوم میرا انجام کیا ہوگا؟ جس تیز روی سے میں تنزل کی طرف جا رہا ہوں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ دل و دماغ کے لئے مہلک ثابت ہوتی ہے۔ مجھے خود بھی اس بات کا یقین ہے۔ میں ہمیشہ سے اس کا قائل رہا ہوں۔ لیکن میں سوائے اس کے کیا کہہ سکتا ہوں کہ میں بے بس ہوں۔ میں مجبور ہوں۔ میں اپنے آپ کو نہیں روک سکتا۔ ایک زبردست کشش، ایک ہمہ گیر جاذبیت مجھے ہلاکت اور پستی کی طرف کھینچے لئے جا رہی ہے۔

آہ! بہت تھوڑے عرصہ کا ذکر ہے کہ میں اپنے آپ کو ایک نہایت عالی مقام پاتا تھا۔ میرا مطمع نظر اور میرا دائرۂ افق اس قدر وسیع تھا کہ اس پر نظر ڈالتے ہوئے میرا دماغ چکر کھاتا تھا۔ مجھے صرف عالی نگاہ لوگ دیکھ سکتے تھے اور میں کوتاہ بینوں سے مامون تھا۔ اب میری یہ حالت ہے کہ کسی اور کو تو کیا۔ میں خود اپنے آپ کا مطالعہ نہیں کر سکتا۔

مجھے معلوم ہے کہ بہت عرصہ نہیں گزرنے نہیں پائے گا۔ جب میرے حسیات فنا ہو جائیں گے۔ شاید میرے حواس مجھے جواب دے جائیں میں اپنے آپ کو زندہ کہتا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مردوں سے بدتر ہوں۔ کیونکہ جو شخص مر جاتا ہے وہ کہیں نہ کہیں ٹھکانے تو لگ جاتا ہے اور میرا حال یہ ہے کہ دنیا میں کوئی سہارا نہیں۔ آرام و سکون میرے لئے ناممکنات

میں سے ہیں۔ نہ مجھے اس وقت کوئی ناصح مفید ہو سکتا ہے اور نہ میں خود ہی اپنی رہنمائی کر سکتا ہوں۔

چارہ گر کو مجھ پر رحم آسکتا ہے اسے میرے نزدیک آنے کی ہمت نہیں پڑ سکتی۔

زندگی میں یہ ایک —— صرف ایک لغزش کا نتیجہ ہے۔

آپ نہیں سمجھے؟ خوب! بات یہ ہے کہ میں جامع مسجد کے مینار سے گر رہا ہوں۔

(مخزن۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء)

آسمان

مجھے یاد ہے کہ بچپن کے زمانے میں میں آئینہ کو ہاتھ میں لے کر اس میں آسمان کا عکس دیکھا کرتا تھا۔ وسعتِ فلک کا اندازہ میں صرف آسمان کو یوں الٹا کر ہی لگا سکتا تھا۔ آسمان کی بلندی سے مانوس فطرتِ انسانی کو اس کی عظمت کا احساس صرف اسی طرح ہو سکتا تھا کہ میں اس بلندی کو گہرائی بنا کر دیکھتا پھر جب میں آئینے کو یونہی ہاتھ میں تھامے اپنی نظر کو اعماقِ فلک میں پھینکتے ہوئے چلنے کی کوشش کرتا تو ہر ایک قدم ایک مہیب افتاد کے کنارے پر ہوتا ہے اور ہر ایک لغزش گویا مجھے غرقابی کی گود تک لے جاتی اور پھر سلامتی تک یوں واپس پہنچاتی کہ میرا دل دھڑک رہا ہوتا اور میری آنکھیں بند ہو جاتیں۔ عقل کے نافہم ہاتھوں نے اس فریب و طلسم کو توڑ دیا۔ اب میں آسمان کی طرف نگاہیں جھکا کر دوڑ بھی سکتا ہوں۔ اب اس کی حقیقت کے متعلق ہرزہ سرائی بھی کر سکتا ہوں۔ اب میں اس کو کئی دفعہ اپنے آپ سے لاتعلق بھی سمجھتا ہوں گویا اس کی ہستی ہی نہیں۔

مگر ایک رات ایسی بھی آتی ہے جب ایک بے نام سی بے چینی مجھے نیند سے ناآشنا کر دیتی ہے۔ دل ایک خاموش اور بے نوا اضطراب بیداری بن کر آنکھوں میں بھر آتا ہے۔ کسی تنہا، آہستہ خرام رہگیر کی سریلی تان رات کی گہری تاریکی میں سے چھن کر مجھ تک ایک رقیق سی بے قراری اور ایک خفیف سی لرزش ہو کر پہنچتی ہے۔ درختوں میں ہوا کی سرسراہٹ قدرت کے عالی شکوہ گنبد میں کسی سانپ کے پھنکار کی پُراسرار گونج معلوم ہوتی ہے۔ گویا فطرت کی آہ سرد ہے یا الہام کی سرگوشی جو ایک عظیم الشان کائنات کے خاموش اندھیرے اور تاریک اندوہ کے رازسے مجھے غرق متحیر

کر رہی ہے۔ ستاروں میں ایک ابدی روشنی چمکتی نظر آتی ہے۔ کالے آسمان کی مہیب سیاہی ایک لازوال اور ہمہ گیر غم کی طرح دنیا و مافیہا پہ چھائی ہوئی ہے اور ستارے اس غیر محدود بلندی پہ آگ کے قطروں کی طرح معلّق و لرزاں معلوم ہوتے ہیں۔ اس وقت میں اس دور دراز بلند اور پر ہیبت عظمت کے نیچے ایک ذرۂ حقیر اور ایک روحِ بے مایہ کی طرح گم ہو جاتا ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر ایک ستارہ رات کا ایک خاموش اور بے بہا آنسو ہے جو صبح کے وقت زمین کے کسی پھول کی پتیوں پر سورج کی کرنوں میں مسکرا رہا ہوگا۔ آسمان ایک بھیانک غم کی طرح ہر ایک طرف طاری دکھائی دیتا ہے اور میں اپنے آپ کو اس میں کھویا ہوا پاتا ہوں جب کوئی ٹوٹتا ہوا تارا ایک وارفتہ سرعت کے ساتھ آسمان کی وسعت و پنہائی پہ ایک افق سے لے کر دوسرے افق تک ایک طویل خطِ آتشیں کھینچتا ہوا تاریکی میں کہیں فنا ہو جاتا ہے تو میں آسمانی زلزلے سے خوفزدہ ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔

اس وقت میں قدرت سے رحم کا طلب گار ہوتا ہوں۔ اس وقت میں اپنی تمام زندگی میں سے آنسوؤں کے سوا اور کوئی چیز آسمان کے حضور میں پیش نہیں کر سکتا۔ میرے ہونٹوں پر ایک مہرِ سکوت ہوتی ہے اور میری روح ایک حیرت بن کر رہ جاتی ہے اس وقت میں آسمان کی سیاہ وسعت و رفعت کو دیکھ کر بھول جاتا ہوں کہ ازل اور ابد میں کیا فرق ہے؟

(مخزن۔ جنوری ۱۹۲۲ء)

آئینہ دل

بچپن کے جذبات گویا ساحلِ دریا پر چھوٹی چھوٹی ہلکی ہلکی سی لہریں ہیں جہاں ننھے ننھے ننگے پاؤں سیپیوں کی تلاش میں ریت کی باریک اور نفیس سلوٹوں کو ایک معصوم بے پروائی سے مسل دیتے ہیں جہاں کا طوفان قہقہوں اور پانی کے چھینٹوں سے زیادہ نہیں ہوتا۔

گویا ایک خوش نما نازک بربط جس کو اب تک کسی انسانی ہاتھ نے نہیں چھوا۔ اور جو ایک درخت کے سایے کے نیچے تنہا پڑا ہے۔ جس کا زیر و بم لا ابالیانہ تاروں اور پردوں میں کہیں بکھرا پڑا ہے۔ ہوا کے جھونکے اس کو کبھی کبھی گدگدا دیتے ہیں اور اس میں سے ایک خندۂ آزاد، ایک بے ترتیب سا نغمہ یوں بے اختیار ہو کر فضا میں سے نکل جاتا ہے جیسے کسی باد رفتار پری کے پازیب کی جھنکار۔

اٹھتی جوانی کا عالم مجھے یوں دکھائی دیتا ہے جیسے ایک دریا جس کی گہرائیوں کے تلاطم پہ سطحی سکون بے خبر سا مسکرا رہا ہے جس کے اعماق کی تاریکیوں میں لہریں اٹھتی ہیں اور سطح کو چھیڑ کر واپس ڈوب جاتی ہیں۔ جہاں ایک تلاطم پنہاں ہے اور ایک محشر فرمائی۔

جیسے بربط ایک منتظر معنی کے ہاتھوں میں ہے۔ ہر ایک تار ایک شدید انتظار سے کسا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ نغمے اپنی مستی میں کھوئے ہوئے منتظر کھڑے ہیں اور مضراب کو [illegible] نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

اس وقت کی حالت نہ پوچھو جب عشق کا بلاخیز طوفان روحِ دریا اور قعرِ دریا کو یک

کر دیتا ہے۔ جب غرقابی کی ہر کشتی اور ہر تیراک کو پستی سے بلندی اور بلندی سے پھر پستی تک یوں دھکیل کر لے جاتی ہے جیسے قہرِ خداوندی، جہاں ہر ایک بھنور طاقت ور سے طاقت ور انسان کو اپنی طرف یوں کھینچ لیتا ہے جیسے قسمت کی مجبوری۔

بربطِ ہستی کے تار تار میں تھرتھراہٹ کا ایک ہنگامہ ہوتا ہے۔ دل خراش نغمے بگولوں کی طرح چکر کھاتے ہوئے اٹھتے ہیں اور اپنی سر چکرا دینے والی تیزی میں زیر و بم کو تنکوں کی طرح لپیٹے لیے جاتے ہیں۔ ہوش و حواس سروں کے ہجوم میں کہیں غائب ہو جاتے ہیں اور ایک دل چھیڑنے والے سرود ایک نشیلے شور کے سوا اور کچھ محسوس نہیں ہوتا۔

آہ! مگر جب دریا اپنے کناروں کی حدود کو توڑ کر اپنے جوشِ مستی میں آوارہ ہو جاتا ہے۔ جب اس کی لہریں ایک بے معنی تلاش میں کوسوں تک نکل کر ہلکی پڑ جاتی ہیں۔ تو اس کا دم ٹوٹ جاتا ہے۔ بے رحم زمین قطرہ قطرہ کر کے اس کو چوس لیتی ہے۔ اس کا طوفان بے بس ہو جاتا ہے پھر اس کی روانی لنگ رہ جاتی ہے اور آخر کار اس کا پانی سوکھ جاتا ہے پھر وہاں موجِ ریگ کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ بحر جب بحر نہیں رہتا تو بیاباں ہو جاتا ہے اور ایک ویران، سنسان، ایک بھیانک وحشت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

گیت کی دردناکی ہے جب تاروں میں ایک بے قراری ایک وجد کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے جب سُر اپنی جان سے بیزار ہو کر بے حجابانہ اور بے تابانہ ایک دوسرے سے سر ٹکراتے ہیں۔ جب بربط کی جانِ نازک اپنی بساط سے بڑھ کر چیخ اٹھتی ہے تو اس کے تار ٹوٹ جاتے ہیں شکستگی نغموں کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ پھر وہ بربط، بربط نہیں رہتا بلکہ فنا کا ایک خاموش نوحۂ ماتم ہو جاتا ہے" یہ ہے عشق کی نامرادی"۔

(مخزن۔ نومبر و دسمبر ۱۹۲۱ء)

کاغذی روپیہ

خواجہ علی احمد شہر کے بڑے سوداگر تھے۔ لاکھوں کا کاروبار چلتا تھا۔ لوگوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بچہ بچہ ان کی دیانتداری سے واقف تھا اور ہر شخص جانتا تھا کہ خواجہ علی احمد قول کے سچے اور بات کے پکے ہیں۔

ایک دن انہوں نے اپنے ایک آدمی کو جوتے والے کی دکان سے جوتا خریدنے بھیجا۔ جوتے کی قیمت بیس روپیہ تھی لیکن بجائے اس کے کہ خواجہ علی احمد اپنے نوکر کو بیس روپے دے کر بھیجتے، انہوں نے نوکر کے ہاتھ کریم خاں جوتے والے کے نام یہ رقعہ لکھ بھیجا۔

" میاں کریم خاں! مہربانی کر کے ہمارے آدمی کو بیس روپے کا ایک جوتا دے دو۔ ہمارا یہ رقعہ اپنے پاس سنبھال کے رکھ چھوڑو۔ جب تمہارا دل چاہے یہ رقعہ آ کے ہم کو یا ہمارے منشی کو دکھا دینا اور بیس روپے لے جانا۔ یہ رقعہ اگر تم کسی اور شخص کو دینا چاہو تو بے شک دے دو۔ جو ہمارے پاس لائے گا۔ ہم اس کو بیس روپے دے دیں گے۔ راقم خواجہ علی احمد۔

دکاندار نے جب رقعے کے نیچے خواجہ علی احمد کے دستخط دیکھے۔ تو اسے اطمینان ہوا۔ جانتا تھا کہ خواجہ صاحب مکرنے والے آدمی نہیں اور پھر لاکھوں کے آدمی ہیں۔ روپے نہیں بھیجے تو نہ سہی یہ رقعہ کیا روپوں سے کم ہے؟ جب جی چاہے گا، رقعہ جا کر دے دوں گا اور روپیہ لے لوں گا۔ چنانچہ اس نے بغیر تامل کے جوتا بھیج دیا۔

تھوڑی دیر بعد کریم خاں دکاندار کے پاس عبداللہ حلوائی آیا اور کہنے لگا: "میاں کریم خاں! میرے تمہاری طرف پچیس روپے نکلتے ہیں ادا کر دو تو تمہاری بہت مہربانی ہو گی۔"

کریم خاں نے کہا: "ابھی لو۔ یہ پانچ تو نقد لے لو۔ باقی بیس روپے مجھے خواجہ علی احمد سے لینے ہیں یہ دیکھو، ان کا رقعہ ذرا ٹھہر جاؤ، تو میں جا کے ان سے بیس روپے لے آؤں۔"

عبداللہ بھی خواجہ علی احمد کو اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ شہر بھر میں خواجہ صاحب کی ساکھ قائم تھی کہنے لگا: "تم یہ رقعہ مجھے ہی کیوں نہ دے دو میں ان سے بیس روپے لے آؤں گا کیونکہ اس میں لکھا ہے کہ جو شخص یہ رقعہ لائے گا اس کو بیس روپے دے دیئے جائیں گے۔"

کریم خاں نے کہا: "یونہی سہی"، چنانچہ عبداللہ حلوائی نے بیس روپے کے بدلے وہ رقعہ قبول کر لیا۔

کئی دنوں تک یہ رقعہ یونہی ایک سے دوسرے کے ہاتھ میں پہنچ کر شہر بھر میں گھومتا رہا۔ خواجہ علی احمد پر لوگوں کو اس قدر اعتبار تھا کہ ہر ایک اسی رقعے کو بیس روپے کی بجائے لے لینا قبول کر لیتا کیونکہ ہر ایک شخص جانتا تھا کہ جب چاہوں گا اسے خواجہ صاحب کے منشی کے پاس لے جاؤں گا اور وہاں سے بیس روپے وصول کر لوں گا۔

ہوتے ہوتے یہ رقعہ ایک ایسے شخص کے پاس پہنچ گیا جس کا بھائی کسی دوسرے شہر میں رہتا تھا۔ یہ شخص اپنے بھائی کو منی آرڈر کے ذریعے بیس روپے بھیجنا چاہتا تھا۔ ڈاک خانے والوں نے اس رقعہ کو بیس روپے کے عوض میں لینا قبول نہ کیا۔ چنانچہ وہ شخص سیدھا خواجہ علی احمد کی کوٹھی پر پہنچا۔ رقعہ منشی کو دیا۔ منشی نے بیس روپے کھن کھن گن دیئے۔ اس نے روپے جا کر ڈاک خانے والوں کو دیئے اور انہوں نے آگے اس کے بھائی کو بھیج دیئے۔

اس مثال سے یہ ظاہر ہوا کہ محض ایک کاغذ کا پرزہ کتنی مدت تک روپے کا کام دیتا رہا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کاغذ کے نیچے ایک ایسے شخص کے دستخط تھے جس کی دولت کا سب کو علم تھا۔ سب جانتے تھے کہ یہ شخص جب چاہے بیس روپے ادا کر سکتا ہے اور قول کا پکا [illegible] ادا کرنے سے انکار نہ کرے گا

اگر ایسے ہی ایک رقعے کے نیچے ہم یا تم دستخط کر دیتے تو کوئی بھی اسے روپے کے بدلے میں قبول نہ کرتا۔ اول تو ہمیں جانتا ہی کون ہے اور جو جانتا بھی ہے وہ کہے گا۔ ان کا کیا پتہ آدمی نیک اور شریف اور دیانتدار سہی، لیکن خدا جانے ان کے پاس بیس روپے ہیں بھی یا نہیں؟ کیا معلوم ہم مانگنے جائیں اور وہاں کوڑی بھی نہ ہو۔

خواجہ علی احمد کا رقعہ گویا ایک قسم کا نوٹ تھا۔ سرکاری نوٹ بھی بالکل یہی چیز ہوتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ان کے نیچے سرکار کی طرف سے سرکاری خزانے کے ایک افسر کے دستخط ہوتے ہیں۔ اگر تم دس روپے کے نوٹ کو لے کر دیکھو تو اس پر اوپر حکومت پاکستان اور اس کے نیچے لکھا ہوتا ہے کہ "میں اقرار کرتا ہوں کہ عندالمطالبہ حامل ہذا کو دس روپیہ سرکاری خزانہ کراچی سے ادا کروں گا"۔ اس عبارت کے نیچے سرکاری افسر کے دستخط ہوتے ہیں...

خواجہ احمد علی کو تو صرف ایک شہر کے لوگ جانتے تھے۔ حکومت پاکستان کو ملک کا ہر آدمی جانتا ہے بلکہ اور ملکوں میں بھی اس کی ساکھ قائم ہے اس لئے سرکاری نوٹ کو ہر شخص بلا تامل قبول کر لیتا ہے اور کوئی قبول کیوں نہ کرے۔ لوگ جانتے ہیں کہ جب چاہیں خزانے میں جا کر اس کے روپے بھنا سکتے ہیں۔

خواجہ علی احمد کے رقعے اور سرکاری نوٹ میں ایک فرق اور بھی ہے۔ خواجہ علی احمد کا رقعہ تو ڈاک خانے والوں نے قبول نہ کیا تھا لیکن سرکاری نوٹ انہیں ضرور ہی قبول کرنا پڑتا۔ سرکاری نوٹوں کو قانونی طور پر ملک کا سکہ قرار دیا گیا ہے اور کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ان کو روپے کے بدلے لینے سے انکار کرے۔ اگر تمہیں کسی شخص نے دس چاندی کے روپے قرض دیئے تھے اور اب تم اس کو یہ قرضہ اتارنے کے لئے دس روپے کا نوٹ دیتے ہو تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تو چاندی کے روپے ہی لوں گا۔ اسے دس کا نوٹ ضرور لینا پڑے گا۔

روپیہ ایسا ہونا چاہیئے کہ آسانی سے پاس رکھا جا سکے۔ چاندی کے سکوں میں یہ خوبی

ایک حد تک پائی جاتی ہے۔ تاہم چاندی کے سکے وزنی ہوتے ہیں۔ اسی روپے کا وزن سیر بھر ہو جاتا ہے تو جہاں پانچ چھ سو روپے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا ہوں، وہاں اچھی خاصی دقت پیش آتی ہے۔

نوٹوں سے یہ دقت رفع ہو جاتی ہے۔ ہزاروں روپے کے نوٹ ایک جیب میں آسانی سے ڈالے جا سکتے ہیں۔ نوٹوں کے جاری کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

باوجود ان سب باتوں کے جس شخص کے پاس بہت سا روپیہ ہو۔ اس کے لئے یہ مشکل ہے کہ بہت سے نوٹ، کچھ روپے، چونیاں، دونیاں، یہ سب کچھ اپنے پاس سنبھال رکھے۔ ایک تو سنبھالنے کی تکلیف، دوسرے چوری کا خطرہ۔ اس لئے بہتر یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنا سب روپیہ بنک میں رکھوا دے۔

بنک میں روپیہ امانت کے طور پر رہتا ہے روپے کا مالک جب چاہے اس کو نکلوا سکتا ہے یا جس کو چاہے اپنے حصے کا روپیہ دلوا سکتا ہے کسی اور کو اپنے حصے کا روپیہ دلوانے کی ترکیب یہ ہے کہ اس کو چیک لکھ کر دے دیا جائے۔

ہم یہاں چیک کے معنوں کو واضح طور پر بیان کرنا چاہتے ہیں۔ فرض کرو عبداللہ نے بنک میں بہت سا روپیہ جمع کر رکھا ہے۔ کریم خاں اس سے دس روپے مانگنے آتا ہے۔ عبداللہ بجائے اس کے کہ کریم خاں کو دس روپے نقد دے۔ وہ اسے دس روپے کا چیک لکھ دیتا ہے۔ چیک گویا ایک قسم کا رقعہ ہے جو عبداللہ کریم خاں کی معرفت اپنے بنک کو بھیج رہا ہے۔ چیک پر مفصلہ ذیل الفاظ لکھے ہوتے ہیں ——

بنام فلاں بنک

کریم خاں کو دس روپے دے دو

راقم عبداللہ

کریم خاں کی بجائے عبداللہ اگر کسی اور کا نام لکھ دے تو جس کا نام لکھے گا۔ اسی کو روپیہ

ملیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ کریم خاں دس روپوں کی بجائے یہ دس روپے کا چیک کیوں قبول کر لیتا ہے؟ اس لئے کہ اسے عبداللہ پر اعتبار ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بنک میں ضرور عبداللہ کا روپیہ جمع ہوگا۔ بس جب یہ چیک لے جاؤں گا مجھے روپیہ ضرور مل جائے گا۔

اب فرض کرو کہ کریم خاں وہ چیک لے کے عبداللہ کے بنک میں گیا اور کہا کہ مجھے اس چیک کا روپیہ ادا کرو۔ بنک والوں نے عبداللہ کا حساب دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہاں تو کل تین روپے ہیں۔ ایسی حالت میں وہ چیک ادا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ وہ انکار کر دیں گے اور کریم خاں کا عبداللہ پر اعتبار باقی نہ رہے گا۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بنک والے عبداللہ کو جانتے ہیں۔ مدت سے اس کا حساب کھلا ہوا ہے وہ کہتے ہیں۔ بنک میں تو عبداللہ کے تین روپے ہیں۔ مگر چلو فی الحال ہم باقی کے سات روپے اپنے پاس سے دے دیتے ہیں اور عبداللہ کی لاج رکھ لیتے ہیں۔ ہم یہ سات روپے پھر اس سے لے لیں گے۔ لیکن عام طور پر ایسا کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ لوگوں کا جتنا روپیہ بنک میں ہوتا ہے اس کے اندر اندر ہی چیک دیتے ہیں اور کم ہی ایسا موقعہ پیش آتا ہے، کہ بنک چیک ادا کرنے سے انکار کر دے۔

اگر کریم خاں نے خود بھی کسی بنک میں حساب کھول رکھا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ عبداللہ کا چیک لے کر وہ خود عبداللہ کے بنک میں جائے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح وہ اپنا روپیہ بنک میں جمع ہونے کے لئے بھجوا دیتا ہے اسی طرح یہ چیک بھی بھجوا دے۔ اس کے بنک والے خود ہی عبداللہ کے بنک سے اس چیک کا روپیہ وصول کر لیں گے۔ یہ دس روپے کی رقم کریم خاں کے حساب میں جمع کر دی جائے گی اور عبداللہ کے حساب میں خرچ کی آمد میں چڑھا دی جائے گی۔

اس طرح سے یہ سہولت ہوئی کہ عبداللہ اور کریم خاں دونوں کا روپیہ اپنے اپنے بنک میں محفوظ پڑا ہے نہ تو عبداللہ کو روپیہ ادا کرتے وقت نہ کریم خاں کو وصول کرتے وقت بنک

جانا پڑا۔ وہ روپیہ ایک کے حساب میں سے نکل کر دوسرے کے حساب میں جمع بھی ہو گیا۔ یہ سب کچھ ایک چیک کی بدولت ظہور میں آیا۔

یہاں ہم نے صرف "کاغذی روپے" کی دو قسموں کا ذکر کیا ہے، ایک سرکاری نوٹ اور دوسرے چیک، ان کے علاوہ اور بھی کاغذات ایسے ہیں جن کے ذریعے سے بڑی بڑی رقمیں یہاں سے دور دراز ملکوں تک پہنچ جاتی ہیں۔

(بچوں کے لئے) (خیابانِ اردو)

رونا رُلانا

ایک امریکن ادبی نقاد ایک مقام پر لکھتا ہے کہ مرد ایک ہنسوڑا جانور ہے اور عورت ایک ایسا حیوان ہے جو اکثر رونی شکل بنائے رہتا ہے۔

مصنف کی خوش طبعی نے اس فقرے میں مبالغے اور تلخی کی آمیزش کر دی ہے اور چونکہ وہ خود مرد ہے اس لئے شاید عورتوں کو اس سے کلی اتفاق بھی نہ ہو۔ لیکن بہرحال موضوع ایسا ہے۔ جس پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

میرے ایک دوست کا مشاہدہ ہے کہ عورتوں کی باہمی گفتگو یا خط و کتابت میں موت یا بیماری کی خبروں کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ایسے واقعات کے بیان کرنے میں عورتیں غیر معمولی تفصیل اور رقت انگیزی سے کام لیتی ہیں۔ گویا ناگوار باتوں کو ناگوار ترین پیرائے میں بیان کرنا ان کا نہایت پسندیدہ شغل ہے۔ ان سے وہ کبھی سیر نہیں ہوتیں۔ ایک ہی موت کی خبر کے لئے اپنی شناساؤں میں سے زیادہ سے زیادہ سامعین کی تعداد ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتی ہیں۔ ایسی خبر جب بھی نئے سرے سے سنانا شروع کرتی ہیں ایک نہ ایک تفصیل کا اضافہ کر دیتی ہیں اور ہر بار نئے سرے سے آنسو بہاتی ہیں اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ موت یا بیماری کسی قریبی عزیز کی ہو۔ کوئی پڑوسی ہو، ملازم ہو، ملازم کے ننھیال یا سہیلی کے سسرال کا واقعہ ہو گی ہیں روزمرہ آنے جانے والے کسی خوانچہ والے کا بچہ بیمار ہو۔ کوئی اڑتی اڑاتی خبر ہو، کوئی افواہ ہو غرضیکہ اس ہمدردی کا حلقہ بہت وسیع ہے ؎

"سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے"

نہ صرف یہ بلکہ رقت انگیز کہانیوں کے پڑھنے کا شوق عورتوں ہی کو بہت زیادہ ہوتا ہے اور اس بارے میں سبھی اقوام کا ایک ہی سا حال ہے۔ غیر ممالک میں بھی رلانے والی کہانیاں ہمیشہ نچلے طبقہ کی عورتوں میں بہت مقبول ہوتی ہیں۔ گھٹیا درجے کے غم نگار مصنفین کو اپنی کتابوں کی قیمت اکثر عورتوں کی جیب سے وصول ہوتی ہے۔ وہ بھی عورتوں کی فطرت کو سمجھتے ہیں۔ کہانی کیسی ہی ہو اگر اس کا ہر صفحہ غم و الم کی ایک تصویر ہے تو اس کی اشاعت یقینی ہے اور عورتوں کی آنکھوں سے آنسو نکلوانے کے لئے ایسے مصنفین طرح طرح کی ترکیبیں کرتے ہیں۔ کبھی ایک پھول سے بچے کو سات آٹھ سال کی عمر میں ہی مار دیتے ہیں اور بستر مرگ پر توتلی باتیں کرواتے ہیں۔ کبھی کسی یتیم کو رات کے بارہ بجے سردی کے موسم میں کسی چوک میں بھوکا اور ننگا کھڑا کر دیتے ہیں اور بھی رقت دلانی ہو تو اسے سید بنا دیتے ہیں۔ یہ بھی کافی نہ ہو تو اسے بھیک مانگتا ہوا دکھا دیتے ہیں کہ "میری بوڑھی ماں مر رہی ہے۔ دوا کے لئے پیسے نہیں۔ خدا کے نام کا کچھ دیتے جاؤ۔" کبھی کسی سگھڑ خوبصورت نیک طینت لڑکی کو چڑیل سی ساس کے حوالے کرا دیا یا کسی بدقماش خاوند کے سپرد کر دیا اور کچھ بس نہ چلا تو سوتیلی ماں کی گود میں ڈال دیا اور وہاں دل کی بھڑاس نکال لی۔ پڑھنے والی ہیں کہ زار و قطار رو رہی ہیں اور بار بار پڑھتی ہیں اور بار بار روتی ہیں۔

خود عورتوں کی تصنیفات اکثر ہچکیوں میں بیٹھی ہوئی اور آنسوؤں میں بھڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ پاکستان میں جو کتابیں عورتوں نے لکھیں۔ اکثر میں نزع، بیماری، دق، سل، خودکشی، زہر، ظلم و تشدد ایک نہ ایک چیز کا سماں باندھ دینا گویا فرض جانا۔ ہاں کوئی کروشیا کھانا پکانے کی کتاب ہو تو اور بات ہے۔

آخر یہ مصیبت کیا ہے؟ یہ بات بات پر صف ماتم بچھ جانا کیا معنی؟ بار بار سوچتا ہوں کہ آخر اس امریکن نقاد نے کیا غلط کہا؟ جل کے کہا سہی لیکن بڑی بات کیا کہی؟

کسی گھر میں موت واقع ہو جائے تو زنانے اور مردانے کا مقابلہ کیجئے۔ مردوں کا ماتم تو صاف

دکھائی دیتا ہے۔ بیچارے گھر کے باہر بیٹھے ہیں۔ سر نیچا کئے چپ چاپ آنکھیں کچھ سُرخ ہیں کبھی کبھی آنسو بھی ٹپک پڑتے ہیں یا کسی نہ کسی انتظام میں مصروف ہیں۔ چہرے پر تھکن اور اداسی سی ہے اور قدم ذرا آہستہ آہستہ اُٹھتے ہیں اور زنانے کا ماتم تو دور دور سے موت کے گھر کا پتہ دیتا ہے اور جب کوئی نئی فلاں بی بی ڈولی سے اتر کر اندر جاتی ہے تو ماتم کی بھنبھناہٹ ہیں از سر نو ایک لہر اٹھتی ہے۔ جیسے یک لخت کوئی ہوائی جہاز پہ سے گر پڑے۔ مرد تو دوسرے تیسرے دن کام میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ لیکن عورتوں کے ہاں مہینہ بھر کو ایک کلب قائم ہو جاتی ہے۔ گلوریوں پر گلوریاں کھائی جاتی ہیں اور چیخوں پہ چیخیں ماری جاتی ہیں۔

کہیں بیمار پرسی کو جاتی ہیں تو بیمار میں وہ وہ بیماریاں نکال کے آتی ہیں جو ڈاکٹر کے وہم و گمان میں نہ تھیں جتنی دیر سرہانے بیٹھی رہیں۔ بیمار کی ہر کروٹ پہ ہاتھ ملتی ہیں۔ بے چارہ کہیں گلا صاف کرنے کو بھی کھانسے تو یہ سورۃ یٰسین تک پڑھ جاتی ہیں۔ رنگت کی زردی، بدن کی کمزوری، سانس کی بے قاعدگی، ہونٹوں کی خشکی ہر بات کی طرف توجہ دلاتی ہیں۔ حتیٰ کہ بیمار کو بھی اپنی یہ خطرناک حالت دیکھ کر چار و ناچار منحنی آواز میں بولنا پڑتا ہے۔ جوں جوں بیمار پرس عورتوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ موت قریب آتی جاتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ بعض عورتوں کو مریض کے بچ جانے پر صدمہ ہوتا ہوگا کہ اتنی تو بیمار پرسی کی اور نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔

عورتیں نہ صرف دوسروں کے غم میں مزے لے لے کے روتی ہیں۔ بلکہ دوسروں کی اشک باری کے لئے خود بھی سامان مہیا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتیں ایک پُرانے زمانے کے بزرگ اپنی اہلیہ کے متعلق فرمایا کرتے ہیں کہ ہماری گھر والی بھی اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ کہ کوئی پڑوسن آکے کہہ دے اکہ اے لو! ماشاءاللہ آج تو تمہارے چہرے پر رونق برس رہی ہے۔ تو جھنجلا کر یوں کہتی ہیں کہ تیرے منہ میں خاک۔ میں تو مری جاتی ہوں اور میرا بڑا چاہنے والوں کو ابھی میں ہٹی کٹی نظر آتی ہوں اور کوئی آکے کہہ دے کہ اے ہے بیٹی تجھے کیا ہوگیا تُو تو دن بدن گھلتی جاتی ہے۔ نہ جانے تجھے کیا غم کھا گیا؟ تو ایسی پڑوسن کو فوراً خالہ کا لقب مل جاتا

تھا۔ بڑی خاطر تواضع ہوتی تھی۔ گھر کا کام کاج چھوڑ کر شام تک ان کو اپنے دکھڑے سنائے جاتے تھے اور چلتے وقت وہ پانچ روپے قرض بھی لے جایا کرتی تھیں۔ جن کی ادائیگی کے لئے کبھی تقاضا نہ کیا جاتا تھا۔

اپنے اوپر رحم دلانے کا مرض جس کسی میں بھی پایا جائے۔ بہت ذلیل مرض ہے۔ لیکن عورتوں میں یہ اس قدر عام ہے کہ خوش حال گھرانے کی بہو بیٹیاں بھی گفتگو میں چاشنی پیدا کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی دکھ وضع کر لیتی ہیں اور موقع موقع پر سنا کر داد لیتی ہیں۔

اس تحریر سے میرا مطلب ان بہنوں کا مذاق اڑانا ہرگز نہیں جو فی الواقع غمگین یا مصیبت زدہ ہیں۔ ان کی ہنسی اڑانا پرلے درجے کی شقاوت ہے۔ جو خدا نخواستہ نصیب نہ کرے کسی کا غم ایسی بات نہیں جو دوسرے کی خوش طبعی کا موضوع بنے۔ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ زندگی کا بہت سا دکھ، ضبط، تحمل، اور خندہ پیشانی سے دور ہو سکتا ہے۔ کسی مصیبت زدہ شخص کے ساتھ سب سے بڑی ہمدردی یہ ہے کہ اس کا غم غلط کرایا جائے کسی بیمار کی سب سے بڑی تیمارداری یہ ہے کہ اس کی طبیعت کو شگفتہ کرنے کا سامان پیدا کیا جائے۔ غم کو برداشت کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کو ضبط کرنے کی کوشش کی جائے مہذب شخص کی یہی پہچان ہے اپنے دکھ کے قصے کو بار بار دہرا کر کسی دوسرے شخص کو متاثر کرنے کی کوشش کرنا گویا اپنے آپ کو ذلیل کرنا ہے خود بھی ہنسو اور اوروں کو بھی ہنساؤ دنیا میں غم کافی سے زیادہ ہے اس کو کم کرنے کی کوشش کرو، ہنسنا اور خوش رہنا دماغ اور جسم کی صحت کی نشانی ہے۔ غم نگار مصنفین کو میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ وہ شخص انمول ہے جو اپنی تحریر سے ہزاروں لوگوں کو خوش کر دیتا ہے اور وہ شخص خدا کے سامنے جواب دہ ہوگا جو اپنے زورِ قلم سے ہزاروں جوان، معصوم، خوش مزاج عورتوں اور مردوں کو رُلاتا ہے اور رلاتا بھی اس طرح ہے کہ نہ اس سے تزکیہ نفس ہوتا ہے نہ کوئی دل میں امنگ پیدا ہوتی ہے اور ہزار قابلِ افسوس ہے وہ شخص جو یہ سب کچھ کر کے بھی اپنی انشا پردازی پر ناز کرتا ہے۔

(تہذیب نسواں)

نوعِ انسان کی کہانی

دُنیا کی ابتدا

ہماری ہستی ایک بہت بڑا گورکھ دھندا ہے۔

ہم کون ہیں؟

ہم کہاں سے آئے ہیں؟

ہم کہاں جا رہے ہیں؟

ان سوالات کا جواب افق سے بھی پرے کہیں دور ہمارا انتظار کر رہا ہے اور ہم بہت ہی آہستہ آہستہ لیکن بڑے استقلال اور ہمت کے ساتھ اس کے قریب پہنچ رہے ہیں۔

لیکن ابھی ہم نے کچھ بھی مسافت طے نہیں کی!

ابھی ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں۔

ابھی ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں، تاہم اتنا کچھ جان گئے ہیں کہ اپنے علم کی بدولت کئی اور باتیں بہت حد تک بوجھنے کے قابل ہو گئے ہیں۔

اس باب میں ہم تمہیں یہ بتائیں گے کہ ظہورِ انسان سے پہلے جہاں تک ہمیں معلوم ہے دنیا کا کیا حال تھا!

اگر ہم یہ اندازہ لگائیں کہ کرۂ زمین پر جان دار اشیاء کا وجود کتنے عرصہ سے ممکن ہے اور مدت کو اس لکیر سے ظاہر کریں کہ جو ننھی سی لکیر اس کے نیچے کھینچی گئی ہے وہ بظاہر

کرتی ہے کہ انسان یا انسان کے طرح کی مخلوق یہاں کتنے عرصے سے رہتی ہے۔

انسان سب سے آخر میں آیا لیکن عقل کے ذریعہ قدرت کی طاقتوں کو تسخیر سب سے پہلے کیا۔ اسی لئے ہم بلیوں یا کتوں یا گھوڑوں یا دوسرے جانوروں کی بجائے انسان ہی کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے گو اپنی اپنی جگہ ہر ایک کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے یہ کرۂ زمین جس پر ہم آباد ہیں شروع شروع میں شعلہ بار مادے کا ایک بہت بڑا گولا تھا جو فضا کے ناپیدا کنار سمندر میں دھوئیں کے ایک ننھے سے بادل کی مانند اڑ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ کئی سال بعد جب زمین کی سطح جل چکی تو اس پر چٹانوں کی ایک ہلکی سی تہ نمودار ہوئی ان بنجر چٹانوں پر موسلا دھار مینہ برسا سخت پتھر بارش کے پانی میں تحلیل ہو گئے اور گدلا پانی ان وادیوں میں بہہ نکلا جو گرم گرم زمین کی اونچی اونچی پہاڑیوں کے درمیان چھپی ہوتی تھیں۔

آخر ایک ایسا زمانہ آیا جب سورج نے بادلوں میں سے اپنا چہرہ نکالا اور دیکھا کہ اس ننھے سے کرے کی سطح پر پانی کے چند تالاب سے بن گئے ہیں۔ یہی تالاب بعد میں مشرقی اور مغربی نصف کروں کے عظیم الشان سمندر بن گئے۔

پھر ایک دن ایک حیرت انگیز معجزہ ظہور میں آیا بے جان دنیا نے جاندار چیزوں کو جنم دیا۔

پہلا جاندار ذرّہ سمندر کی سطح پر نمودار ہوا۔

کئی سال تک یہ ذرّہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہتا رہا۔ اس عرصے میں رفتہ رفتہ زمین کے ناموافق حالات سے مانوس ہوتا گیا اور بالآخر زندگی کی مشکلات پر قابو پا لیا بعض ذرّے ایسے بھی تھے جو جھیلوں اور جوہڑوں کی تاریک گہرائیوں ہی میں خوش رہتے تھے۔ بہت سی مٹی اور کیچڑ پہاڑیوں کی چوٹیوں سے بہہ کر نیچے آ گئی تھی اس میں جڑیں پکڑ لیں اور پودے بن گئے بعض نے کسی جگہ ٹھہرنا پسند نہ کیا یونہی ادھر ادھر گھومتے رہے۔ ان کے جسم میں ننھے بچھوؤں کی سی عجیب و غریب جوڑ دار ٹانگیں نمودار ہوئیں اور وہ سمندر کی تہ میں پودوں اور ان سبزی

مائل لوتھڑوں کے درمیان جو جیلی مچھلیوں سے مشابہ تھے۔ رینگنے لگے بعض چھلکوں والے ذرّے ایسے بھی تھے جنہیں خوراک کی تلاش میں اِدھر اُدھر تیرنا پڑا۔ ان کی بدولت سمندر رفتہ رفتہ کروڑوں مچھلیوں سے آباد ہوگیا۔

اس عرصے میں پودوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ انہیں رہنے کے لئے نئی نئی جگہیں تلاش کرنی پڑیں۔ طوعاً وکرہاً پانی کو الوداع کہا اور پہاڑوں کے دامن میں کیچڑ اور دلدلوں کے اندر سکونت اختیار کرلی۔ دن میں دو دفعہ جوار بھاٹے کی وجہ سے نمکین سمندر کی لہروں سے ہم آغوش ہوتے لیکن تمام وقت بڑی بے چینی سے کاٹتے اور رقیق ہوا میں جو زمین کی سطح کو لپیٹی ہوتی تھی۔ زندہ رہنے کی کوشش کرتے۔ کئی صدیوں کی تربیت کے بعد اس قابل ہوئے کہ جس طرح پہلے پانی میں رہتے تھے ایسی آسانی کے ساتھ اب ہوا میں رہنے لگے۔ بڑے ہوئے تو جھاڑیاں اور درخت بنے اور آخر کار خوب صورت پھول پیدا کرنا سیکھا جب پھول اُگے تو بھونرے آکر رس چوسنے لگے۔ پرندے دور دور تک بیج اڑا کرلے گئے۔ یہاں تک کہ سب زمین پر سبزے نے اپنی چادر بچھادی اور بڑے بڑے درختوں نے اپنے سائبان پھیلا دیئے۔

بعض مچھلیوں نے بھی سمندر سے باہر قدم رکھا اور گلپھڑوں کی بجائے پھیپھڑوں سے سانس لینا سیکھا۔ ایسے جانوروں کو خاکابی کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خشکی اور تری دونوں جگہ آسانی سے زندہ رہ سکتے ہیں۔ کسی مینڈک سے پوچھو تو وہ تمہیں بتائے گا کہ خاکابی جانور کس مزے سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

جب ایک دفعہ پانی سے باہر نکل آئے تو یہ جانور رفتہ رفتہ خشکی ہی کے ہو رہے۔ بعض نے رینگنا سیکھا اور سنسان جنگلوں میں کیڑے مکوڑوں کے ساتھ رہنے لگے۔ نرم نرم زمین پر تیزی سے چلنے کی خواہش پیدا ہوئی تو رفتہ رفتہ ٹانگیں بڑی ہوگئیں۔ ساتھ ہی جسامت بھی بہت بڑھ گئی۔ چنانچہ دنیا بڑے جانوروں سے آباد ہوگئی۔ علم حیوانات کی کتابوں میں

اکتیاسورس (IEHTHYOSAURUS) میگلوسورس (MEGALOSAURUS) اور برانٹوسورس (BRANTOSAURUS) نامی جانوروں کا ذکر آتا ہے جو تیس تیس چالیس چالیس فٹ لمبے تھے اور ہاتھیوں سے اس طرح کھیل سکتے تھے جس طرح بلی اپنے بچوں سے کھیلتی ہے۔

ان رینگنے والے جانوروں میں سے بعض جانور درختوں پر جا چڑھے اور وہیں رہنے لگے (درخت ان دنوں سو فٹ سے زیادہ اونچے نہ تھے) چلنا پھرنا موقوف ہوگیا تو ٹانگوں کی بھی ضرورت نہ رہی لیکن ایک شاخ سے دوسری شاخ تک پھرتی سے حرکت کرنے کے لئے اپنی جلد کی جھلی سی بنائی اور اسے اگلے پاؤں کی انگلیوں کے درمیان اس ٹانگ سے اس ٹانگ تک پتنگ کی طرح پھیلالیا۔ پھر اس جھلی پر پَر اگاتے۔ دم سے مڑنے تڑنے کا کام لیا۔ ڈال ڈال اڑنے لگے اور سچ مچ کے پرندے بن گئے۔

اس کے بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ بڑے عظیم الجثہ رینگنے والے جانور سب کے سب مرگئے اس کا سبب آج تک معلوم نہیں ہوسکا۔ شاید آب و ہوا یک لخت تبدیل ہوگئی۔ یا شاید بھوک کے مارے مرگئے کیونکہ بہت ممکن ہے وہ اتنے بڑے ہوگئے ہوں کہ نہ تیرنے کے قابل رہے ہوں نہ چلنے کے نہ رینگنے کے اور بڑے بڑے پودے اور درخت سامنے دکھائی دے رہے ہوں لیکن وہ ان تک پہنچ نہ سکتے ہوں۔ لیکن وہ ان تک پہنچ نہ سکتے ہوں بہر حال بڑے بڑے رینگنے والے جانور دس لاکھ سال تک اس دنیا پہ مسلط رہے اور پھر یہاں سے چل بسے۔

ان کی جگہ بالکل ہی مختلف جانوروں نے لے لی۔ یہ اولاد تو انہی رینگنے والے جانوروں کی تھی لیکن ان میں بڑا فرق یہ تھا کہ اپنے بچوں کو چھاتیوں کا دودھ پلاتے تھے اس لئے انہیں دودھ پلانے والے جانور کہتے ہیں۔ مچھلیوں کے سے پَر ان کے جھڑ چکے تھے۔ پرندوں کے سے پَر اختیار نہ کئے۔ ان کی بجائے بال اُگ آئے۔ ان دودھ پلانے والے جانوروں نے بعض ایسی عادات سیکھ لیں جن کی بدولت ان کی نسل کو باقی تمام جانوروں پر فوقیت حاصل

ہوگئی۔ جب تک بچے پیدا نہ ہو جاتے۔ مادہ اپنے انڈے جسم کے اندر ہی اٹھائے اٹھائے پھرتی باقی سب جانور تو اپنے بچوں کو گرمی اور سردی کے رحم پر چھوڑ دیتے لیکن دودھ پلانے والے جانور بہت مدت تک اپنے بچوں کو ساتھ رکھتے اور جب تک وہ طاقت ور ہو کر دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ ہو جائیں خود ان کی حفاظت کرتے اس طرح دودھ پلانے والے جانوروں کے بچے کئی باتیں اپنی ماں سے سیکھ لیتے اور زیادہ آسانی سے زندہ رہ سکتے۔ کسی بلی کو دیکھو کس طرح بچوں کو اپنی حفاظت کرنا اور منہ دھونا اور چوہے پکڑنا سکھاتی ہے۔

لیکن ان دودھ پلانے والے جانوروں کے حالات بہت تفصیل کے ساتھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ تم انہیں اچھی طرح جانتے ہو وہ تمہارے اردگرد ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ بازار میں اور گھر پر وہ تمہارے ساتھ رہتے ہیں اور جو اتنے عام نہیں انہیں تم چڑیا خانے میں جا کر دیکھ سکتے ہو۔

ان بے شمار بے زبان جانوروں میں سے ایک جانور نے باقی سب سے الگ اپنے لئے ایک رستہ نکالا۔ عقل و شعور سے کام لیا اور اس کی بدولت زندگی کی کشمکش میں اپنی نسل کی رہنمائی کی۔ یہ جانور "انسان" کہلایا۔

تھا تو یہ بھی دودھ پلانے والا جانور لیکن خوراک مہیا کرنے اور جان بچانے میں سب سے ہوشیار تھا۔ پہلے اگلی ٹانگوں سے شکار پکڑنے کی عادت ڈالی۔ ہوتے ہوتے پنجے کی شکل ہاتھ کی سی بن گئی۔ پھر بے انتہا کوششوں کے بعد پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہونا سیکھا (یہ کرتب اب بھی کچھ ایسا آسان نہیں۔ انسان دس لاکھ سال سے اس کا عادی ہے پھر بھی بچے کو یہ از سر نو سیکھنا پڑتا ہے)

یہ جانور دیکھنے میں کچھ بندر، کچھ بن مانس سے ملتا جلتا تھا لیکن ذہانت میں دونوں سے بڑھ کر تھا۔ شکار میں کوئی اس کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ ہر قسم کی آب و ہوا میں رہ لیتا تھا۔ ایک مقام سے دوسرے مقام تک جاتا تو حفاظت کی خاطر ہم جنسوں کی ایک ٹولی بنا کر سفر کرتا۔ بچوں کو خطرے سے آگاہ کرنے کے لئے عجیب و غریب آوازیں نکالتا۔ کئی لاکھ سال بعد

انہی آوازوں سے گفتگو کرنا سیکھا۔

تمہیں یقین تو مشکل سے آئے گا کہ ہم تم سب اسی جانور کی اولاد ہیں۔ لیکن حقیقت یہی ہے۔

وہ سچ جو کبھی جھوٹ نہ ہوگا

میں انسانی زندگی کی الجھنوں پر جس قدر غور کرتا ہوں اتنا ہی مجھ پر روشن تر ہوتا جاتا ہے۔ کہ جس طرح قدیم مصر کے لوگ بخشش اور نجات کے لئے آئیس اور نیفتیس کا دامن پکڑتے تھے۔ اسی طرح ہمیں اپنی مشکلات کے حل کے لئے طنز اور رحم کا دامن پکڑنا پڑتا ہے۔

طنز اور رحم سے بڑھ کر کوئی چیز ہماری مشکل کشا نہیں ہو سکی۔ طنز سے زندگی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے اور رحم اپنے آنسوؤں سے زندگی کو مقدس بناتا ہے۔

جس طنز کو میں اپنا دیوتا بنانا چاہتا ہوں وہ کوئی سنگدل دیوتا نہیں۔ وہ محبت اور حسن کا مضحکہ نہیں اڑاتا وہ حلیم اور مہربان دیوتا ہے اس کا تبسم دشمنوں کو بھی دوست بنا لیتا ہے اور وہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ احمقوں اور ظالموں پر ہنسو۔ ان سے نفرت مت کرو۔ کیوں کہ یہ کمزوری کی نشانی ہے۔"

ایک بہت بڑے فرانسیسی کے ان دانش مندانہ الفاظ پر میں اس کتاب کو ختم کرتا ہوں اور رخصت چاہتا ہوں۔ خدا حافظ

ماخوذ از کتاب "نوع انسان کی کہانی"۔ مصنفہ ہنڈرک فان لون

ترجمہ پطرس

بچّے کا پہلا سال

ایک زمانہ ایسا تھا کہ لوگ بچے کی عمر کے پہلے سال کو تعلیم کے دائرے سے خارج سمجھتے تھے جب تک بچہ کم از کم بولنا شروع نہ کرتا۔ اسے صرف ماں یا دایہ کی زیر نگرانی رکھا جاتا تھا۔ اور یہ فرض کر لیا جاتا تھا کہ وہ فطرتاً ہی بچے کے نیک و بد کو ایسی اچھی طرح سمجھتی ہیں کہ انہیں سکھانے کی ضرورت نہیں لیکن فی الحقیقت لوگوں کا یہ خیال غلط تھا۔ اکثر بچے سال بھر کے بھی نہ ہونے پاتے کہ مر جاتے اور جو زندہ رہتے ان میں سے کئی ایک کی صحت ہمیشہ کے لئے خراب ہو جاتی۔ غلط تربیت کی وجہ سے خطرناک ذہنی عادات کی بنیاد پہلے ہی پڑ جاتی۔ یہ حقیقت حال ہی میں معلوم ہوئی ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ اکثر لوگ شیر خوار بچوں کی پرورش کے معاملے میں سائنس کا دخل پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ اس سے ماں کی ممتا اور بچے کے لاڈلے پن کا جو دلاویز تصور ان کے ذہن میں موجود ہے اسے صدمہ پہنچتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ اندھا دھند محبت اور لاڈ پیار اور چیزیں ہیں۔ اصل محبت اور چیز ہے جن والدین کو اپنے بچوں سے سچی اور اصلی محبت ہے وہ ان کی تربیت کے لئے سائنس کے اصولوں پر عمل کرنے سے نہیں گھبراتے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ضرر رساں قسم کی محبت انہی لوگوں میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ جن کے کوئی اولاد نہیں ہوتی۔ یا جو (روسو کی مانند) اپنے بچوں کو کسی یتیم خانے کے حوالے کر دینا چاہتے ہیں اکثر تعلیم یافتہ والدین سائنس کی معلومات سے متنفر ہونے کی بجائے استفادہ کرتے ہیں

نہ صرف یہ بلکہ ان پڑھ لوگوں میں بھی سائنس کا چرچا روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ بچوں کی اموات روز بروز کم ہوتی جاتی ہیں۔ اگر لوگ پوری احتیاط سے کام لیں تو نہ صرف اموات کی تعداد اور بھی کم ہو جائے گی بلکہ جو بچے زندہ رہیں گے ان کی دماغی اور جسمانی حالت بہت بہتر ہو گی۔

جسمانی صحت کے ماہر ڈاکٹر لوگ ہیں وہی ان مسائل کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ مسائل اس کتاب کے دائرے سے خارج ہیں۔ لیکن ہم یہاں جسمانی صحت کے مسائل پر اسی حد تک بحث کریں گے۔ جس حد تک ان کا تعلق ذہنی یا نفسیاتی زندگی سے ہے اور ان پر اس وقت بحث کرنا یوں ضروری ہے کہ اول تو عمر کے پہلے سال میں جسمانی زندگی اور ذہنی زندگی میں تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے دوسرے اگر شروع میں بچے کے جسم کا کما حقہ خیال نہ رکھا جائے تو چند ایسے نقائص کے پیدا ہونے کا احتمال رہتا ہے جو بڑے ہو کر تعلیم کے رستے میں حارج ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ہرچند کہ جسمانی صحت پر بحث کرنا ڈاکٹروں ہی کا حصہ ہے۔ تاہم اس موقعے پر ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے متعلق کچھ عرض کریں۔

نوزائیدہ بچہ کسی چیز کا عادی نہیں ہوتا۔ اس کی تمام حرکات کسی عادت کی وجہ سے نہیں بلکہ اضطراراً سرزد ہوتی ہیں۔ اگرچہ ماں کے پیٹ میں اس نے بعض عادتیں اختیار کر لی ہیں۔ تو وہ کم از کم ایسی نہیں کہ پیدا ہونے کے بعد بھی اس کے کام آ سکیں۔ یہاں تک کہ سانس لینا بھی اسے پیدائش کے بعد سیکھنا پڑتا ہے اور بعض بچے تو مر ہی اسی لئے جاتے ہیں کہ تنفس کا عمل دیر میں سیکھتے ہیں۔ ایک زبردست خواہش بچہ فطرت کی طرف سے اپنے ساتھ لاتا ہے اور وہ چوسنے کی خواہش ہے جب تک بچہ اس عمل میں مصروف ہے بہت خوش رہتا ہے۔ باقی تمام وقت وہ ایک تحیر کے عالم میں گزارتا ہے جس سے یوں نجات حاصل ہوتی ہے کہ دن اور رات کا بیشتر حصہ نیند میں گزر جاتا ہے۔ پندرہ دن کے بعد یہ حالت بدل جاتی ہے اور بعض باتیں (مثلاً دودھ پینا وغیرہ) تو اس کے ساتھ ظہور میں آنے لگتی ہیں۔ اس لئے بچے [illegible] کا موقع [illegible] ہے

یعنی یوں کہئے کہ اب وہ بعض چیزوں کا عادی ہو جاتا ہے اور جن باتوں کا عادی ہوا نہیں کو
پسند کرتا ہے۔ گویا قدامت پسند بن جاتا ہے اور قدامت پسند بھی ایسا کہ اغلباً پھر عمر بھر ایسا
نہیں ہوتا۔ ہر نئی چیز اسے ناپسند ہوتی ہے اگر بچہ اس عمر میں بولنے کے قابل ہوتا تو بڑے
بوڑھوں کی طرح اپنی پسندیدگی کا اظہار ان الفاظ میں کرتا کہ میاں جانے دو اس عمر میں اب
ہم بھلا نئی نئی باتیں کیوں کر سیکھ سکتے ہیں۔ تاہم شیر خوار بچے نئی عادتیں بہت جلد اختیار کر
لیتے ہیں۔ اس دوران میں اگر کوئی بری عادت سیکھ لیں تو وہ بعد میں اچھی تربیت کے رستے
میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔ اس لئے شیر خواری کے زمانے کی عادات کا خاص طور پر خیال رکھنا
چاہیئے۔ اگر شروع شروع کی عادات اچھی ہوں تو بہت سہولت ہوتی ہے۔ علاوہ برآں شیر خوارگی
کے زمانے کی عادت اتنی راسخ ہوتی ہے کہ بڑے ہو کر وہ بالکل جبلت معلوم ہوتی ہے۔ اس
لئے اعمال پر اس کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے جو عادات بعد میں سیکھی جائیں ان میں یہ پختگی کبھی
نہیں ہوتی۔ اس لئے زمانہ طفلی کی عادات خاص طور پر توجہ کی مستحق ہیں۔

اس سلسلے میں دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں۔ اول اور سب سے مقدم صحت،
دوم سیرت۔ ہم چاہتے یہ ہیں کہ بچہ بڑا ہو کر ایک ایسا انسان ثابت ہو جس کے اوصاف پسندیدہ
ہوں۔ اور جو اپنے گردوپیش سے بوجہ احسن عہدہ برآ ہو سکے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ صحت
اور سیرت دونوں کے مطالبات ایک ہیں۔ جو چیز ایک کے لئے مفید ہے وہی دوسرے
کے لئے مفید ہے۔ یہاں بحث سیرت سے ہے لیکن جو اصول ہم سیرت کی بہتری کے
لئے وضع کریں گے۔ وہی صحت کے لئے بھی مفید ہیں گویا یہ نہیں ہو سکتا کہ بچہ تنومند تو ہو
لیکن اس کے اخلاق برے ہوں۔ یا نیک سیرت تو ہو لیکن اس کا جسم امراض کا شکار ہو۔

آج کل ہر تعلیم یافتہ جانتی ہے کہ بچے کو صرف مقررہ اوقات پر دودھ پلانا چاہیے اس
سے بچے کا ہاضمہ درست رہتا ہے یہ بجائے خود ایک نہایت معقول وجہ ہے۔ لیکن اس
کے علاوہ اخلاقی نقطہ نظر سے بھی یہ بہت مفید ہے۔ شیر خوار بچہ اتنا بے عقل نہیں ہوتا جتنا

ہم اسے سمجھتے ہیں اسے ایک دفعہ یقین ہو جائے کہ رونے سے مطلب نکل آتا ہے تو وہ ضرور
روتا ہے لیکن جب بڑا ہو کر اس عادت کے زیر اثر وہ ہر وقت رونی صورت بنا کر لوگوں سے
گلے شکوے کرتا رہتا ہے تو لوگ اسے چمکارنے کی بجائے اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ لوگوں
کا یہ سلوک اسے از حد ناگوار گزرتا ہے اور وہ دنیا کو خود غرض اور ہمدردی کے جذبے سے
معرا سمجھ لیتا ہے اگر لڑکی ہو اور بڑی ہو کر خدا اسے [illegible] بنا دے تو لے جا تو [illegible] اور [illegible]
[illegible] طرفداری کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور یہ نقص اور بھی مستحکم ہو جاتا ہے [illegible]
بزرگوں کا ہوتا ہے کہ بچپن میں بگڑ جاتے ہیں تو پھر تمام عمر بگڑتے چلے جاتے ہیں جس شخص کی [illegible]
شیر خوارگی کے زمانے میں غلط طریقے پر ہو وہ بڑا ہو کر اگر ذی اقتدار ہے تو ضدی [illegible]
ہوتا ہے اور اگر بے بضاعت ہے تو لوگوں کی مفروضہ بے توجہی سے کڑھتا رہتا ہے [illegible]
لئے اخلاقی تعلیم روز اول ہی سے شروع کر دینی چاہیئے تاکہ غلط توقعات پیدا ہوں [illegible]
انہیں مجروح ہونا پڑے۔ اگر شروع میں اس کا تدارک نہ کیا جائے تو یہ ہیں بچے کی [illegible]
کو ٹھکرایا ہے اس کے دل میں غصہ اور رنج کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

گویا بچے کی تربیت اس طرح کرنی چاہیئے کہ نہ تو اسے لاڈ پیار اور چاؤ چونچلوں سے
بگاڑا جائے نہ اس کی طرف سے بالکل بے توجہی برتی جائے مثلاً جو بات صحت کے لئے
ضروری ہے اس میں کوتاہی نہ کرنی چاہیئے۔ بچے کو ہوا اور بارش سے تکلیف پہنچ رہی ہو تو
اسے اُٹھا لینا چاہیئے۔ تاکہ اسے سردی نہ لگے اور وہ بھیگ نہ جائے لیکن اگر بچہ بغیر کسی جسمانی
تکلیف کے رونا شروع کر دے تو اسے رونے دینا چاہیئے ورنہ وہ بے جا خدمت کرانے
کا عادی ہو جائے گا۔ جب اس کی دیکھ بھال کی جائے تو بہت زیادہ چاؤ اور تمام [illegible]
بلکہ مضر ہے جو بات مناسب ہو وہ کر دینی چاہیئے اور ضرورت سے زیادہ پیار محبت اور ہمدردی
کا اظہار نہ کرنا چاہیئے۔ بچوں کی پرورش چاؤ چونچلوں سے نہیں بلکہ متانت اور سنجیدگی سے
کرنی چاہیئے۔ گویا وہ بچہ نہیں بلکہ بڑی عمر کا انسان ہے۔

بچوں میں بڑوں کی سی عادتیں تو پیدا نہیں ہو سکتیں۔ لیکن ہمیں یہ خیال ضرور رکھنا چاہیئے کہ کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جو ان کی عادات کے رستے میں رکاوٹ ثابت ہو۔ مدعا یہ کہ بچہ مزاج دار نہ بن جائے۔ ورنہ بعد میں اسے سخت مایوسی کا سامنا ہوگا اور یوں دیکھئے تو وہ خود بھی اس قابل نہیں کہ اس میں اس قدر اہمیت کا احساس پیدا کیا جائے۔

بچوں کی پرورش میں سب سے مشکل بات یہ ہے کہ والدین کو غفلت اور لاڈ کے بین بین رہنا پڑتا ہے۔ بچے کی صحت کو درست رکھنے کے لئے ہر وقت اس کی نگہداشت کرنی پڑتی ہے اور اس کی خاطر بڑی بڑی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ والدین کو بچے سے بہت زیادہ الفت ہو لیکن مصیبت یہ ہے کہ جہاں والدین کو محبت زیادہ ہوتی ہے وہاں اکثر ان کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ جن والدین کو اپنے بچوں سے بہت محبت ہے ان کے نزدیک اولاد کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے اگر احتیاط نہ برتی جائے تو بچہ بھی اس بات کو محسوس کرنے لگتا ہے اور جتنا اہم اسے والدین سمجھتے ہیں اتنا ہی اہم وہ بھی اپنے آپ کو سمجھتا ہے جب اسے خود بینی کی عادت پڑ جاتی ہے اور بڑے ہو کر لوگ والدین کی طرح اس کی خوشامد و آمد نہیں کرتے تو اسے مایوس ہونا پڑتا ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ نہ صرف پہلے سال بلکہ بعد میں بھی جب کبھی بچہ بیمار ہو والدین خندہ پیشانی اور بظاہر بے فکری کے ساتھ اس کا علاج کریں اور بات کا بتنگڑ نہ بنائیں۔

پرانے زمانے میں بچوں کو جکڑ کر بھی بہت رکھا جاتا تھا اور ان سے لاڈ بہت کیا جاتا تھا۔ ان کے اعضاء کو حرکت کرنے کا موقع نہ دیا جاتا تھا۔ کپڑے ضرورت سے زیادہ گرم ہوتے تھے۔ فطری حرکات پر پابندیاں عائد کی جاتی تھیں۔ لیکن ساتھ ہی ان کو ہر وقت گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے ان کے سامنے گانے گاتے پھرتے تھے اور انہیں چوبیس گھنٹے چوپاچالی کا تختہ مشق بنائے رکھتے تھے۔ یہ بہت غلط طریقہ تھا۔ اس سے بچے بگڑ جاتے تھے اور ہر وقت ماں باپ کے گلے کا ہار بنے رہتے تھے۔ صحیح

ل یہ ہے کہ نہ بچے کی فطری حرکات و خواہشات پر پابندیاں عائد کیجئے نہ اسے ان سے تجاوز کرنے دیجئے۔ بچے کے لئے آپ جو تکلیف اٹھاتے ہیں اس سے بچے کو بے خبر رہنا چاہئے خدمت کرانے کا چسکا اسے نہ پڑنے دیجئے جہاں تک ممکن ہو ایسی کامیابی کا لطف اسے ضرور اٹھانے دیجئے جو خود اس کی اپنی کوشش کا نتیجہ ہو۔ جدید تعلیم کا مقصد یہ ہے۔ کہ جہاں تک ہو سکے بچے کو خارجی قواعد و ضوابط کی غلامی سے آزاد کیا جائے۔ لیکن اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ خود بچے کے دل میں انضباط کا احساس پیدا کیا جائے اور اس احساس کا پیدا کرنا عمر کے پہلے سال میں نسبتاً آسان ہوتا ہے مثلاً جب بچے کو سلانا ہو تو اسے گود میں نہ لینا چاہیئے، بازوؤں میں تھام کر "سوجا سوجا" نہ کرنا چاہیئے بلکہ اس کے پاس تک نہ ٹھہرنا چاہیئے۔ اگر آپ ایک مرتبہ یوں کریں گے۔ تو بچہ دوسری مرتبہ بھی یہی چاہے گا اور تھوڑے عرصہ میں بچہ کا سلانا ایک مصیبت بن جائے گا۔ بچے کو اڑھا لپٹا کر بستر میں سلا دینا چاہیئے اور ایک دو باتیں کر کے اسے اکیلا چھوڑ دینا چاہیئے۔ ممکن ہے وہ چند منٹ تک روتا رہے لیکن اگر وہ بیمار نہیں تو تھوڑی دیر میں خود بخود چپ ہو جائے گا۔ اس کے بعد جا کر دیکھئے تو مزے کی نیند سو رہا ہوگا۔ لاڈ پیار سے ایک تو اس کی سیرت بگڑ جاتی ہے۔ دوسرے وہ سوئے گا بھی کم۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ نوزائیدہ بچہ ماں کے پیٹ سے کوئی عادت ساتھ نہیں لاتا اس کی عادات فطری اور اضطراری ہوتی ہیں چنانچہ اسے اشیاء کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ اشیاء کے احساس کے لئے یہ ضروری ہے کہ بچہ اشیاء کو پہچانے اور اشیاء کو پہچاننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اشیاء کا بار بار تجربہ ہو۔ سو وہ رفتہ رفتہ ہی حاصل ہوتا ہے پیدائش کے تھوڑے عرصہ بعد بچہ پنگوڑے کے مس ماں کی چھاتی یا دودھ کی بوتل کے مس اور خوشبو اور ماں یا انا کی آواز سے مانوس ہو جاتا ہے۔ ماں یا پنگوڑے کو دیکھنے کی قابلیت بعد میں پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ نوزائیدہ بچے کی آنکھیں ابھی اس قابل نہیں ہوتیں کہ وہ اشیاء کی

شکلوں کو واضح طور پر دیکھ سکے۔ جب رفتہ رفتہ مختلف احساسات کے اختلاف سے بچے کے ذہن میں عادات وضع ہو جاتی ہیں تو مس اور بو اور نظر کی بدولت ذہن میں اشیاء کے تصورات شکل پذیر ہونے لگتے ہیں۔ خاص خاص احساسات اس کے دل میں خاص خاص اشیاء کی توقعات پیدا کرتے ہیں (دودھ کی بو آتی ہے تو چھاتی یا بوتل کے مس کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ ماں کی آواز آتی ہے تو ماں کی شکل دیکھنے کا منتظر ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ) تاہم کچھ عرصے تک اشخاص اور اشیاء میں تمیز نہیں کر سکتا جس بچے کو کبھی بوتل کا دودھ اور کبھی چھاتی کا دودھ پلایا جائے اس کے نزدیک کچھ عرصے تک ماں اور بوتل ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس تمام عرصے کے دوران میں تعلیم کا ذریعہ محض جسمانی ہونا چاہیئے۔ بچے کی تمام مسرتیں (جو زیادہ تر گرماہٹ اور خوراک تک محدود ہوتی ہیں) اور اس کے تمام دکھ محض جسمانی ہوتے ہیں۔ اس کے افعال اور اس کی عادات یوں شکل پذیر ہوتی ہیں کہ جو چیز اس کے ذہن میں مسرت سے تعلق رکھتی ہے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو دکھ سے متعلق ہو اس سے گریز کرتا ہے۔

بچے کا رونا ایک حد تک تو ایک اضطراری حرکت ہے جو دکھ کی وجہ سے ظہور میں آتی ہے اور ایک حد تک ایک ارادی فعل ہے جو بچہ مسرت حاصل کرنے کے لئے اختیار کرتا ہے۔ شروع شروع میں وہ محض دکھ کی وجہ سے روتا ہے لیکن جب اس دکھ کو دور کیا جائے (جیسا کہ کیا جاتا ہے) تو بچے کے دل میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ رونے کے نتائج خوشگوار ہوتے ہیں۔ چنانچہ رفتہ رفتہ بچے کو یہ عادت ہو جاتی ہے کہ نہ صرف دکھ دور کرانے کے لئے روتا ہے بلکہ مسرت حاصل کرنے کے لئے بھی اس حربے کو کام میں لاتا ہے یہ اس کی ذہانت کی پہلی فتح ہوتی ہے۔ لیکن باوجود بے انتہا کوشش کے جب تک اسے دکھ نہ پہنچ رہا ہو — وہ ویسا نہیں رو سکتا جیسا دکھ کے وقت روتا ہے۔ ہوشیار ماں اس قسم کے رونے اور اس قسم کے رونے میں بخوبی تمیز کر سکتی ہے۔ عقلمندی یہی ہے کہ جب بچہ کا رونا دکھ کا رونا ہو تو اس پہ بالکل توجہ نہ کی جائے۔ بچے کو لئے لئے پھرنا اور اس سے کھیلتے رہنا یا اس کے سامنے گانے گانا آسان بھی ہے اور پُرلطف بھی۔ لیکن بہت

جلد بچہ اس قسم کی تفریح کا عادی ہو جاتا ہے جو اس کی نیند میں خلل انداز ہوتی ہے۔ شیر خوار بچے کا بیشتر وقت (سوائے دودھ پینے کے اوقات کے) نیند میں گزرنا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ بعض والدین کو یہ باتیں سخت معلوم ہوں لیکن تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بچے کی صحت اور خوشی کے لئے یہ باتیں بہت مفید ہیں۔

بچے کے لئے جو تفریحات والدین مہیا کرتے ہیں ان کو تو ایک خاص حد کے اندر رکھنا چاہیئے لیکن جو تفریحات وہ خود اپنے لئے پیدا کرے ان کو ترقی دینے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ شروع ہی سے اسے اس بات کا موقع دینا چاہیئے کہ وہ آزادی سے ہاتھ پاؤں ہلا سکے اور اپنے اعصاب کو کام میں لا سکے۔ پرانے زمانے کے لوگ بچوں کو باندھ کر رکھا کرتے تھے اس کی وجہ سستی کے سوا اور کچھ نہ تھی کیونکہ جن بچوں کو کھلا رکھا جائے۔ ان کی نگہداشت زیادہ کرنی پڑتی ہے۔ حیرت ہے کہ ان لوگوں کی مامتا بھی ان کی سستی پہ غالب نہ آ سکتی تھی۔ جب بچے کی نظر ٹھیک ہو جاتی ہے۔ تو وہ متحرک چیزوں کو خصوصاً جو ہوا سے ہل رہی ہوں دیکھ کر خوش ہوتا ہے لیکن پھر بھی جب تک وہ اشیا کو پکڑنا نہ سیکھے اس کی دلچسپیوں کا دائرہ بہت محدود رہتا ہے جب پکڑنا سیکھ لے تو یہ دائرہ یک لخت وسیع ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصے تک محض گرفت ہی کی مشق اتنی مسرت انگیز ہوتی ہے کہ وہ گھنٹوں اس میں مشغول رہتا ہے جھنجھنے کا شوق بھی اسی زمانے میں پیدا ہوتا ہے۔ جھنجھنے کے زمانے سے ذرا پہلے وہ اپنے ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں پہ قابو حاصل کرتا ہے۔ شروع شروع میں پاؤں کی انگلیوں کی حرکات محض اضطراری ہوتی ہیں۔ بعد میں یہ دریافت کرتا ہے کہ میں انہیں اپنی مرضی سے بھی ہلا سکتا ہوں اس احساس سے وہ اتنا خوش ہوتا ہے گویا بہت بڑی مملکت حاصل کر لی ہے کیونکہ انگلیاں اب اجنبی نہیں رہتیں۔ بلکہ جسم کا جزو بن جاتی ہیں۔ اس کے بعد اگر بہت سی چیزیں بچے کے آس پاس ایسی ہوں جنہیں وہ پکڑ سکے تو اسے دل بہلاوے کا بہتیرا سامان مہیا ہو جاتا ہے۔ بچے کو تفریح بھی ایسی ہی حرکات سے ہوتی ہے۔ جو تعلیم کے نقطہ نظر سے ضروری ہیں البتہ گر جانے یا چوٹ لگ جانے یا کسی تکلیف دہ چیز مثلاً پن یا سلائی کے

نگلنے سے اسے بچانا ضروری ہے۔

پہلے تین مہینے کے عرصے میں بچہ دودھ پیتے وقت تو بہت خوش ہوتا ہے۔ لیکن باقی تمام وقت اس کی طبیعت اکتائی رہتی ہے جب وہ مزے میں ہو تو سو جاتا ہے جاگ رہا ہو تو کوئی نہ کوئی بے چینی اسے ضرور رہتی ہے۔ انسان کی خوشی کا انحصار اس کی ذہنی قابلیت پہ ہے۔ لیکن تین مہینے سے کم عمر کے بچے کو نہ تو کسی چیز کا کافی تجربہ ہوتا ہے نہ وہ اپنے اعصاب پر قادر ہوتا ہے اس لئے مسرتوں سے محروم رہتا ہے۔ جانوروں کے بچے نسبتاً بہت جلد زندگی سے لطف اُٹھانے کے قابل ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کی مسرتیں فطری ہوتی ہیں اور تجربے پر منحصر نہیں ہوتیں۔ انسان کا بچہ اگر محض جبلّت پر تکیہ کرے تو اس کی خوشیوں اور دلچسپیوں کا حلقہ تنگ رہتا ہے۔ بچہ اپنی عمر کے پہلے تین مہینے عام طور پر اکتایا رہتا ہے اس اکتائے رہنے میں بھی حکمت ہے۔ اس سے نیند پوری طرح آتی ہے۔ اگر بچے کو بہت زیادہ بہلایا جائے تو وہ سوتا کم ہے۔

جب بچہ دو تین مہینے کا ہو جاتا ہے تو مسکرانا سیکھتا ہے اور اشخاص کے متعلق اس کے جذبات اشیاء سے ممیز ہونے لگتے ہیں اس عمر کو پہنچ کر ماں اور بچے میں سوشل تعلقات کا امکان شروع ہو جاتا ہے۔ بچہ ماں کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کر سکتا ہے اور کرتا ہے اور [illegible] جانوروں کی مانند بلکہ اور طرح سے متاثر ہوتا ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد تحسین و تعریف کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ میرے اپنے بچے میں اس خواہش کے واضح آثار پانچ مہینے کی عمر میں ظاہر ہوئے میز پر ایک [illegible] گھنٹی پڑی تھی بڑی مشکلوں سے اس نے اسے [illegible] اُٹھا کر بجایا اور فخر پر مسکرا کر سب کو باری باری دیکھنے لگا۔ جب یہ خواہش پیدا ہو جائے تو گویا ایک زبردست حربہ معلم کے ہاتھ آ جاتا ہے۔ یہ حربہ تعریف اور مذمت کا حربہ ہے۔ بچپن کے تمام تر زمانے میں اس سے بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس حربے کو از حد احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا چاہیئے۔ عمر کے پہلے سال میں بچے کی مذمت بالکل نہ کرنی چاہیئے۔ بعد میں بھی اس سے بہت حد تک احتراز واجب ہے۔ تعریف نسبتاً کم مضر ہوتی ہے لیکن تعریف نہ تو اس فراخدلی سے کرنی

چاہیئے کہ اس کی قدر ہی باقی رہے اور نہ اس بخل کے ساتھ کہ بچے کو اس کے حاصل کرنے کے لئے بہت زیادہ زور لگانا پڑے۔ جب بچہ پہلی دفعہ قدم اٹھائے یا پہلی دفعہ الفاظ منہ سے نکالے تو کسی معقول شخص کو اس کی کارگزاری کو سراہنے میں تامّل نہ کرنا چاہیئے۔ جب کبھی بچہ بہت سی کوششوں کے بعد کسی مشکل کو حل کرے تو اس کی تعریف ضرور کرنی چاہیئے۔ بچے کو یہ احساس دلانا چاہیئے کہ ہمیں اس کی خواہش اکتساب کے ساتھ ہمدردی ہے۔

عام طور پر بچے میں خواہش اکتساب اتنی زبردست ہوتی ہے کہ اس کے لئے محض مواقع مہیا کر دینا ہی کافی ہوتا ہے۔ باقی سب کچھ وہ خود ہی کر لیتا ہے۔ مثلاً بچے کو گھٹنوں چلنے یا پاؤں پاؤں چلنے یا اسی طرح کی دیگر حرکات سکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ باتیں کرنا البتہ خود بول کر اسے سکھاتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ بالارادہ الفاظ سکھانے کی کوشش کرنا غیر ضروری ہے۔ بچے اپنی ترقی کی رفتار خود ہی معین کرتے ہیں۔ اسے تیز تر بنانے کی کوشش کرنا غلطی ہے۔ مرتے دم تک انسان کا یہ حال ہوتا ہے کہ مشکلیں پیش آتی ہیں۔ ان پر قابو پاتا ہے۔ اور اس سے مزید کوشش کے لئے حوصلہ بڑھتا ہے۔ اس سے بہتر طریقہ شوق کے بڑھانے کا اور کوئی نہیں۔ مشکلات نہ اتنی زیادہ ہونی چاہئیں کہ کام کرنے کا شوق ہی مر جائے اور نہ اتنی کہ طبیعت کو اکسا نہ سکیں ہم کچھ سیکھتے اسی بات سے ہیں جو ہم خود کرتے ہیں۔ بڑوں کو صرف یہ کرنا چاہیئے کہ ایک دفعہ جھنجھنا بجا دیں اور پھر بچے کو چھوڑ دیں کہ وہ خود اس کی نقل اتارنے کی کوشش کرے۔ جو کام دوسرے لوگ سرانجام دیں۔ وہ سمندِ شوق پر تازیانے کا کام کر سکتے ہیں۔ لیکن جب تک بچہ وہ کام خود نہ کرے اسے تعلیم نہیں کہا جا سکتا۔

باقاعدگی اور وقت کی پابندی شروع بچپن اور خصوصاً پہلے سال میں بہت ضروری ہیں نیند۔ خوراک اور رفع حاجت کے لئے شروع ہی سے باقاعدگی کی عادت ڈالنی چاہیئے گردوپیش کے حالات و واقعات کا مانوس ہونا ذہنی نقطہ نظر سے بہت ضروری ہے اگر ایک ہی بات باقاعدگی سے پیش آتی رہے تو بچے کو اس کے پہچاننے میں آسانی ہوتی ہے۔

ذہن پر ضرورت سے زیادہ زور نہیں ڈالنا پڑتا اور بچہ محسوس کرتا ہے کہ میں محفوظ ہوں۔ بچہ کمزور اور بے بس ہوتا ہے۔ اسے تسکین کی ضرورت ہے اگر اسے یہ احساس پیدا ہو جائے کہ ہر بات باقاعدگی کے ساتھ ہوتی ہے اور کوئی نئی بات یک لخت اس کی زندگی میں خلل نہیں ڈال سکتی تو وہ خوش رہتا ہے۔ ذرا عمر بڑی ہوتی ہے تو نئی نئی باتوں کا شوق پیدا ہوتا ہے لیکن زندگی کے پہلے سال میں ہر نئی بات میں بچے کو ڈر محسوس ہوتا ہے جس سے اسے جہاں تک ممکن ہو محفوظ رکھنا چاہیئے۔

اگر بچہ بیمار ہو اور آپ متفکر، تو اپنا فکر حتی الامکان اس پر ظاہر نہ ہونے دیجئے۔ ورنہ وہ بھی متفکر ہو جائے گا۔ کوئی ایسی بات نہ کرنی چاہیئے جس سے بچے کی طبیعت میں ہیجان پیدا ہو اگر بچے کو ٹھیک نیند نہ آئے یا اس کا پیٹ خراب ہو تو بچے کے سامنے بے پروائی ظاہر کرنی چاہیئے۔ اسے یہ احساس نہ ہونا چاہیئے کہ اس کی اہمیت کچھ بڑھ گئی ہے۔ ورنہ وہ معمولی باتوں میں بھی آپ کی خوشامد اور ترغیب کا خواہش مند ہوگا۔ اس بات کا خیال نہ صرف عمر کے پہلے سال میں بلکہ بعد میں بھی رکھنا چاہیئے۔ بچہ بڑا ہو تو اس اصول پر ہمیشہ از بیش کاربند ہونا چاہیئے۔ بچے کے دل میں یہ احساس کبھی نہ پیدا ہونے دینا چاہیئے کہ اس کے معمولی افعال مثلاً کھانا پینا جو خود اس کے لئے مسرت کا موجب ہیں آپ کی ممنونیت کا باعث ہیں۔ اگر اس میں یہ احساس پیدا ہو جائے تو وہ خوشامد کا متوقع رہتا ہے۔ حالانکہ اسے ایسی باتیں خود بخود بغیر ترغیب کے کرنی چاہئیں۔

یہ کبھی خیال مت کیجئے کہ بچے میں اتنی عقل کہاں جو ان باتوں کو سمجھے بچے کے قوائے کمزور ہیں اور اس کا علم محدود۔ لیکن جہاں یہ کوتاہیاں اس کے رستے میں حارج نہ ہوں۔ وہاں اس کی ذہانت بڑوں سے کم نہیں ہوتی۔ بچہ جو کچھ شروع کے ایک سال میں سیکھتا ہے۔ پھر عمر بھر ایک سال کے عرصہ میں اتنا نہیں سیکھ سکتا۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ بچے کی ذہانت بہت تیز ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ بچے کو یہ سمجھ کر پالو کہ ایک دن اسے بڑا ہونا ہے اور دنیا کے کاروبار میں حصہ لینا ہے اس کی موجودہ سہولتوں پر یا اپنی خوشی پر اس کی آئندہ بہتری کو قربان مت کیجئے۔ اس سے اسے بہت نقصان پہنچتا ہے۔ ٹھیک تربیت دینے کے لئے محبت اور علم دونوں کا ہونا ضروری ہے۔

ماخوذ از کتاب "تعلیم خصوصاً اوائل طفلی میں"
مصنفہ برٹرنڈ رسل ــــ مترجمہ پطرس

دیہات میں بوائے سکاؤٹ کا کام

مکھیوں کا بادشاہ

ایک دن سقراط گاؤں کے اسکول میں آیا۔ سب لوگ اسے جانتے تو تھے ہی۔ جونہی بچے بچیوں نے اس کی صورت دیکھی، ان کے چہرے خوشی سے چمک اُٹھے۔ پڑھنا لکھنا بھول گئے اور سب کی نظریں دروازے پر گڑ گئیں۔ جہاں بڈھے میاں کھڑے بڑے غور سے بچوں کی صورتیں دیکھ رہے تھے۔

سقراط نے کچھ کہے سنے بغیر کمرے کا ایک چکر لگایا پھر اپنے آپ سے منہ ہی منہ میں باتیں کرنے لگا۔ "نہ کسی کے کانوں میں مُرکیاں دیکھیں نہ ناک میں نتھ، نہ کسی کے چہرے پر میل نہ کسی کی ناک بہہ رہی ہے نہ ناخن بڑھے ہوئے ہیں (ایں یہ کیا؟ اس بچی کے ناخن تو بڑھے ہوئے ہیں۔ کیسے افسوس کی بات ہے! لیکن نہیں یہ کوئی نئی لڑکی ہوگی) اور یہاں نہ کسی کا پیٹ بڑھا ہوا ہے نہ چہرے پر زردی ہے، نہ آنکھیں خراب ہیں، نہ کپڑے میلے ہیں، سب کے چہروں پر خوشی اور مسکراہٹ ہے۔ معلوم ہوتا ہے اصلاح اور ترقی کے لئے جو ہم نے کوشش کی تھی وہ بے نتیجہ ثابت نہیں ہوئی۔"

چوتھی جماعت کے ایک شوخ لڑکے نے کہا "بڑے میاں یہ ہم پر منتر پڑھ پڑھ کر کیا پھونک رہے ہو؟"

سقراط بولا چونک اٹھی گویا وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ بولا "سلام اے لوگو، ہاں میں

ایک خواب دیکھ رہا تھا۔"

"تو بڑے میاں! اس میں حیرانی کی بات ہی کیا ہے۔ ابا جان کہتے ہیں کہ تم خواب دیکھنے کے عادی ہو۔ لیکن ہم تو خواب نہیں دیکھ رہے ہم تو سب جاگ رہے ہیں۔"

"تو پھر ضرور میرے خوابوں میں سے ایک خواب سچا ثابت ہوا ہے"

ایک ننھے سے لڑکے نے کہا "واہ واہ تو اب سقراط میاں ہمیں ایک کہانی سنائیں گے"

سقراط کے آنے سے ماسٹر صاحب کا چہرہ بھی اپنے شاگردوں کی طرح خوشی سے دمکنے لگا تھا۔ انہوں نے پوچھا "کہئے آپ کا کونسا خواب سچا ثابت ہوا؟"

"میں چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک ایسا سکول دیکھ رہا ہوں۔ جس میں گندگی نام کو نہیں۔ جہاں نہ کوئی بچہ بیمار ہے، نہ کسی نے سونے چاندی کے زیور پہن رکھے ہیں۔ یہی خواب سچا ثابت ہوا ہے۔"

ماسٹر صاحب نے کہا "یہ تو کچھ بھی بات نہیں۔ مہینوں سے ہمارے اسکول کی یہی حالت ہے۔ کبھی کبھی کوئی نیا بچہ اسکول میں داخل ہوتا ہے۔ تو ہمیں تھوڑی سی تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن ہم جلد ہی اسے بھی راہ پر لے آتے ہیں۔"

عین اس موقع پر ایک عورت داخل ہوئی۔ وہ چپ چاپ اور شرمائی ہوئی تھی لیکن تھی چست، چالاک اور اکثر یہاں آیا کرتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب اور کچھ کاغذ تھے۔ اسے دیکھ کر سب لڑکے اور لڑکیاں اٹھ کھڑے ہوئے اور جگہیں بدلنے لگے تھوڑی دیر میں سب لڑکے ایک طرف ہوگئے اور سب لڑکیاں دوسری طرف۔ تب اس عورت نے لڑکیوں کو سلائی کا ایک سبق پڑھانا شروع کر دیا۔ سقراط نے کمرے سے نکل جانا چاہا۔ مگر لڑکے اسے کب چھوڑنے والے تھے۔ سب کے سب چلا اُٹھے "ہیں، ہیں بڑے میاں کہاں چل دیئے ٹھہرو تم ابھی نہیں جا سکتے۔ تم پہروں بیٹھے بڑی عمر کے لوگوں سے باتیں کرتے رہتے ہو کیا ہم نے کچھ قصور کیا ہے؟

سقراط نے کہا "یہاں میری ضرورت بھی کیا ہے جو کچھ میں تمہیں بتا سکتا ہوں۔ تم اور تمہارے استاد اس سے بہت زیادہ جانتے ہیں۔ میں کسی ایسی جگہ جاؤں گا۔ جہاں میری ضرورت ہو۔"

استاد نے کہا۔ "نہیں آپ نہیں جا سکتے۔ ہم نے سب کچھ آپ ہی سے سیکھا ہے۔ کچھ دیر یہاں ٹھہریئے اور کوئی نئی بات بتایئے۔"

سقراط نے کہا "میں کیا بتا سکتا ہوں؟ میں استاد تھوڑا ہی ہوں۔"

اسی شوخ لڑکے نے پھر کہا "اچھا تو کوئی کہانی ہی سنا دو۔"

کہانی کا نام سننا تھا کہ سب لڑکے چلا اٹھے "ٹھیک ہے کہانی بھئی کہانی۔"

سقراط نے کہا "میں کہانیاں وہانیاں نہیں سنایا کرتا۔"

اس پر کئی لڑکے بول اٹھے "ہم نہیں مانتے۔ تم بچوں والے ہو۔ اپنے بچوں کو تو ضرور کہانیاں سناتے ہو گے۔"

سقراط نے کہا "یہ کام میرا نہیں۔ ان کی ماں انہیں کہانیاں سنایا کرتی ہے لیکن تمہاری ماؤں کو اُپلے تھاپنے ہی سے فرصت نہیں ملتی۔"

اس پر ننھی لڑکیوں نے ایک زبان ہو کر کہا "ہرگز نہیں۔ تمہیں ہماری ماؤں پر الزام لگاتے شرم نہیں آتی۔ انہوں نے تو یہ کام برسوں سے چھوڑ رکھا ہے۔"

سقراط نے کہا "خوب خوب! مجھے بہت ہی افسوس ہے کہ میں نے تمہاری ماؤں پر یہ جھوٹا الزام لگایا ہے مجھے امید ہے تم معاف کر دو گے۔"

"معاف تب کریں گے جب تم ہمیں کوئی کہانی سناؤ گے۔"

"اچھا تو سنو، ایک تھا مگر مچھ بہت ہی بڑا ــــــ"

"رہنے دو۔ ہم ایسی بے ہودہ کہانی نہیں سننا چاہتے۔ سنانی ہے تو کوئی کام کی کہانی سناؤ۔"

"دیکھو میاں سقراط! عقل کے ناخن لو اور ہمیں اچھی کہانی سناؤ جس میں بادشاہ ہوں، شہزادوں شہزادیوں کا ذکر ہو، اگر تم چاہو تو ایسی کہانی سنا سکتے ہو۔"

"اچھا تو سنو، ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمہارا خدا بادشاہ وہ ایک چھوٹی سی ریاست پہ حکومت کرتا تھا۔ رعایا اس سے بہت خوش تھی۔ جہاں بادشاہ کا پسینہ گرتا وہاں رعایا اپنا خون بہانے کو تیار ہو جاتی۔"

لڑکوں نے کہا "اب آئے نا راہ پہ، ہاں تو پھر کیا ہوا؟"

"اس چھوٹی سی ریاست سے ملی ہوئی ایک بہت بڑی ریاست تھی جس پہ ایک بہت ظالم بادشاہ حکمران تھا۔ اس بادشاہ کی بڑی آرزو یہ تھی کہ کسی طرح اس چھوٹی ریاست پر قبضہ جما لوں۔ اس چھوٹی ریاست کے بادشاہ کے ہاں کوئی بیٹا تو نہ تھا ہاں ایک بہت خوبصورت بیٹی تھی۔ بڑے بادشاہ نے اپنے دل میں سوچا کہ اگر میرے بیٹے کی شادی اس چھوٹے بادشاہ کی بیٹی سے ہو جائے تو بادشاہ کے مرنے کے بعد اس کی سلطنت پر میرا قبضہ ہو جائے گا۔

لیکن چھوٹا بادشاہ اور اس کی رعایا اس کی نیت سے واقف تھے چنانچہ انہوں نے اس کے بیٹے کے ساتھ اپنی شہزادی کی شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر بڑا بادشاہ بہت ہی جھنجھلایا اور اپنے امیروں وزیروں کو بلا کر ان سے صلاح مشورہ کیا۔ وزیروں نے کہا۔ اس چھوٹے بادشاہ نے ہماری ہتک کی ہے۔ ہمیں اس پر چڑھائی کر کے اس کی ریاست پر قبضہ کر لینا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے چڑھائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ جب چھوٹے بادشاہ کو اس کی خبر ہوئی تو وہ اپنے دل میں بہت ڈرا کیونکہ اس کی فوج بڑے بادشاہ کی فوج کے مقابلے میں ایک چوتھائی بھی نہ تھی۔

اس چھوٹے بادشاہ نے اپنے امیروں وزیروں کو بلایا اور کہا "اگر ہم لڑتے تو یہ بادشاہ ہماری سلطنت پر قبضہ کر لے گا اور اگر میں نے اپنی بیٹی اس کے بیٹے سے بیاہ دی

تب بھی وہ ہماری سلطنت پر قبضہ کرے گا۔ ہم کریں تو کیا کریں؟"

اس کی رعایا نے جواب دیا "ہم لڑیں گے اور اپنی جانیں حضور پر فدا کر دیں گے۔"

بادشاہ نے کہا "لیکن اس کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ غنیم کے مقابلے میں ہماری فوج بہت ہی تھوڑی ہے۔"

اس پر سب چپ ہوگئے لیکن اس ریاست کے تمام باشندے اپنے بادشاہ سے بے حد محبت رکھتے تھے۔ چنانچہ کیا دیہات میں اور کیا شہروں میں سب جگہ لوگوں کو یہی فکر تھی کہ ہم اپنے بادشاہ اور اپنے ملک کو غنیم کے ہاتھ سے کس طرح بچائیں۔ یہاں تک کہ جانوروں اور درندوں کو بھی اپنے بادشاہ کی امداد کی فکر ہوئی۔

جب بادشاہ نے دوسری مرتبہ اپنے امیروں وزیروں کو طلب کیا تو اس موقع پر شیر بھی آئے اور کہنے لگے "ہم دشمن کے گھوڑوں اور مویشیوں کو چیر پھاڑ ڈالیں گے۔"

بھیڑیے اور گیدڑ آئے اور کہنے لگے "ہم دشمن کے خیموں کے اردگرد گھومتے رہیں گے اور جو کوئی اکیلا دکیلا باہر نکلے گا اسے کھا جائیں گے۔"

کوّوں نے کہا "ہم ان کی ہڈیاں تک نہ چھوڑیں گے۔"

لیکن بادشاہ نے کہا "یوں کام نہ چلے گا۔"

عین اس موقع پر ایک مکھی بادشاہ کی ناک پر آکر بیٹھی۔ بادشاہ نے ہاتھ سے اڑا دی۔ مگر مکھی وہاں سے جانے کا نام نہ لیتی تھی۔ اس دفعہ وہ آکر بادشاہ کے کان پر بیٹھ گئی۔ بادشاہ جھنجھلا اٹھا اور کہنے لگا "اس مکھی نے تو ناک میں دم کر دیا۔ یہ مجھے کیوں تنگ کرتی ہے؟ میں پہلے ہی پریشان ہو رہا ہوں۔"

بادشاہ کے کان میں بھنبھناہٹ کی آواز آئی جیسے کوئی کہہ رہا ہو: "میں حضور کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

بادشاہ چونک اٹھا اور کہا "یہ کون بولا؟"

وزیر نے عرض کیا "حضور! کوئی بھی تو نہیں بولا۔"

بادشاہ کے کان میں پھر وہی باریک آواز آئی "میں بولا تھا۔"

اب تو بادشاہ اچھل پڑا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے اردگرد دیکھنے لگا۔ مگر اس کے آس پاس کوئی نہ تھا۔ ناچار پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ مگر دل ہی دل میں سخت حیران ہوتا اور کہتا تھا کہ میری پریشانیوں اور اندیشوں نے کہیں مجھے دیوانہ تو نہیں بنا دیا۔"

اتنے میں پھر وہی آواز سنائی دی کہ "میں حضور کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

امیر وزیر سب دم بخود کھڑے ہوگئے۔ کسی کے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔ مگر اب بادشاہ سمجھ گیا کہ یہ ضرور کسی ایسی ہستی کی آواز ہے، جو نظر نہیں آتی۔

بادشاہ نے پوچھا "تم کون ہو؟"

"میں مکھیوں کا بادشاہ ہوں اور آپ کی مدد کے لئے حاضر ہوا ہوں۔"

بادشاہ نے کسی قدر ناراضی سے کہا "جاؤ یونہی فضول وقت ضائع نہ کرو۔ بھلا تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟ تم مجھے پریشانیوں میں مبتلا دیکھ کر مجھ سے ٹھٹھا کرنے آئے ہو۔"

"نہیں، میں اس خیال سے ہرگز نہیں آیا ہوں۔ میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں اور اگر آپ وعدہ کریں کہ میں جو کچھ مانگوں آپ دیں گے تو میں آپ کی مدد سے دریغ نہ کروں گا۔"

"میں صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ مجھے آپ کے دسترخوان پر بیٹھنے کی اجازت مل جائے اور جہاں چاہوں اڑ سکوں۔"

بادشاہ نے ہنس کر کہا "جاؤ۔ تمہیں اجازت ہے میرے دشمن کو برباد کرنے میں اپنا سارا زور لگا دو لیکن مجھے یقین ہے کہ تم نہ تو میری کچھ مدد کر سکتے ہو، نہ میرے دشمن کو نقصان پہنچا سکتے ہو۔"

آس پاس جو لوگ بیٹھے تھے۔ جب انہوں نے بادشاہ کو آپ ہی آپ باتیں کرتے اور

ہنستے دیکھا تو انہیں بہت فکر ہوئی وہ سمجھے کہ پریشانیوں کی وجہ سے ہمارے بادشاہ کا سر پھر گیا ہے اور وہ دیوانوں کی طرح آپ ہی آپ ہنس رہا ہے۔ لیکن بادشاہ نے سارا واقعہ ان سے بیان کر دیا۔ اس بات کا تو کسی کو بھی یقین نہ تھا کہ مکھیاں ہماری کچھ امداد کر سکتی ہیں۔ البتہ اس خیال پر انہیں بہت ہنسی آئی کہ مکھیاں ہماری سلطنت کی حفاظت کرنا چاہتی ہیں اس موقع پر ایک بڈھا جو سب سے پیچھے بیٹھا تھا اٹھ کھڑا ہوا اور مکھی کی شرطیں مان لینے کے خلاف دھائی دینے لگا۔ اس نے چلا کر کہا "بادشاہ سلامت! آپ نے اپنے مغرور اور ظالم ہمسائے سے بھی زیادہ خطرناک دشمن کے ہاتھ اپنی سلطنت بیچ ڈالی ہے۔"

اس پر چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں "چپ رہ بڈھے، کیا بکتا ہے؟" اور بے چارے بڈھے کو زبردستی خاموش کر کے اپنی جگہ پر بٹھا دیا گیا اس کے تھوڑی دیر بعد مجلس ختم ہو گئی اور سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ مگر اس عرصے میں بڈھا منہ ہی منہ میں بڑبڑا تا رہا۔"

ایک لڑکے نے کہا "خدا جھوٹ نہ بلوائے تو وہ بڈھا ضرور سقراط ہی ہوگا۔"

سقراط نے کہا "اگر تم یوں میری بات ٹوکو گے تو میں باقی کہانی تمہیں نہ سناؤں گا۔"

ایک ننھی سی لڑکی نے کہا "یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ اس خوب صورت شہزادی کا کیا حال ہوا؟"

سقراط نے چپکے سے اسکول سے باہر نکلتے ہوئے کہا "یہ پھر کبھی بتاؤں گا۔ آج صبح میں نے پہلے ہی تمہارا بہت سا وقت ضائع کر دیا ہے۔"

کچھ دنوں کے بعد سقراط اپنی کہانی کا باقی حصہ سنانے پھر اسکول میں آیا۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے وہ اسکول کے احاطے میں اِدھر اُدھر اوپر نیچے بڑے غور سے دیکھتا رہا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی کوئی چیز کھو گئی ہے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد وہ اسکول کے

کمرے میں داخل ہو گیا۔

لڑکوں نے پوچھا "احاطے میں تمہاری جو چیز کھو گئی تھی وہ ملی یا نہیں؟"

سقراط نے جواب دیا "نہیں"

ایک لڑکے نے کہا "مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا لیکن یہ تو بتاؤ تمہاری کیا چیز گم ہوئی ہے؟"

"میری کوئی چیز گم نہیں ہوئی اور جو چیز میں تلاش کر رہا تھا وہ مجھے نہیں ملی اور مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ وہ نہیں ملی۔"

کئی لڑکوں نے زچ ہو کر پوچھا "تمہاری کوئی چیز گم بھی نہیں ہوئی اور تم دیر تک اِسے اِدھر اُدھر تلاش بھی کرتے رہے اور جب وہ تمہیں نہیں ملی تو تمہیں خوشی بھی ہوئی یہ تو پہیلی ہے پہیلی۔"

"اچھا۔ اگر تم اسے پہیلی کہتے ہو تو پہیلی ہی سہی۔"

ماسٹر صاحب نے کہا "مجھے معلوم ہے آپ کو کس چیز کی تلاش تھی آپ کوڑا کرکٹ تلاش کر رہے تھے لیکن وہ اب آپ کو یہاں نہیں مل سکتا۔"

سقراط نے کہا "بجا فرمایا آپ نے اور اس کے لئے میں آپ کو دلی مبارک باد دیتا ہوں گرد کا ایک ذرّہ بھی تو احاطے کے آس پاس کہیں نظر نہیں آیا۔ تمام گندگی اور کوڑا کرکٹ اسکول سے گڑھے میں پھینکا جاتا ہے۔ یقین جانو مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی حاصل ہوئی۔"

اس کے بعد سقراط چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں کو مخاطب کر کے بولا "مجھے امید ہے کہ جب تم بڑے ہو جاؤ گے اور اسکول چھوڑ دو گے تو اپنی ان تمام اچھی عادتوں کو کبھی نہ بھولو گے۔"

استاد نے کہا "اس کی طرف سے آپ بے فکر رہئے اب صفائی ان کی فطرت کا جزو

بن گئی ہے اور غلاظت سے انہیں دلی نفرت ہے اور یہ نفرت ان کے دل سے کبھی نہیں نکل سکتی۔ سبق پڑھنے سے پہلے یہ ہر روز اپنے اسکول کی صفائی کرتے ہیں اور مجھے پورا یقین ہے کہ اگر یہ جگہ کوڑے کرکٹ سے اَٹی رہے تو اس کے خیال سے بھی انہیں یہاں بیٹھنا دوبھر ہو جائے۔"

یہ سن کر سقراط کے منہ سے بے اختیار "مرحبا" نکل گیا۔

اب کئی لڑکوں نے پوچھا "ہاں بڑے میاں! اب وہ کہانی بھی تو سناؤ، ہم جانتے ہیں کہ تم بات ٹالنے کی کوشش کر رہے ہو!"

سقراط نے کہا "لو بھئی سنائے دیتا ہوں۔" اچھا تو کہاں چھوڑی تھی کہانی؟ ہاں ہاں یاد آگیا۔ خوبصورت شہزادی باغ میں بیٹھی جراب بن رہی تھی۔"

"نہیں یہاں تو نہیں چھوڑی تھی۔"

تو پھر یہاں چھوڑی ہوگی۔" بہادر نوجوان شہزادہ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور نیام سے تلوار نکال لی۔"

"نہیں، یہاں بھی نہیں چھوڑی۔ سقراط تم جان بوجھ کر انجان بنے جلتے ہو۔ خیر ہم تمہیں بتلائے دیتے ہیں۔ تم نے کہانی وہاں چھوڑی تھی۔ جہاں مکھیوں کے بادشاہ نے چھوٹی سلطنت کو بچانے کا وعدہ کیا تھا۔"

"ہاں ہاں۔ یہیں چھوڑی تھی۔ لو صاحب! یہاں سے رخصت ہو کر مکھیوں کا بادشاہ بھن بھن کرتا ہوا سیدھا بڑے بادشاہ کی سلطنت کی طرف روانہ ہو گیا۔ جس وقت وہ وہاں پہنچا وہ بڑا بادشاہ چڑھائی کے لئے اپنی فوجوں کو تیار کر رہا تھا۔ اس نے دل میں سوچا کہ اپنی راجدھانی میں ایک بہت شاندار جشن منانا چاہیے۔ جس میں ہمارے تمام نوجوان شامل ہوں اور دنگل میں سب اپنے اپنے جوہر دکھائیں اور اس طرح ان میں سے تمام بہادروں اور سورماؤں کو چن کر اپنی ایک زبردست فوج تیار کر لوں جو میرے گستاخ ہمسائے کو

تباہ و برباد کر ڈالے۔

چنانچہ بادشاہ کے حکم سے ایک شاندار جشن منایا گیا اور ملک کے کونے کونے سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ آکر اس میں شامل ہوئے۔ جس جگہ نظر پڑتی تھی لوگوں کے خیمے ہی خیمے دکھائی دیتے تھے۔ ان لوگوں کا جب جی چاہتا۔ بادشاہ کے خزانے سے کھاتے پیتے اور رنگ رلیاں مناتے۔ انہوں نے بادشاہ کی راجدھانی کی تمام زمین اور پانی کو گندہ اور نجس بنا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یکایک وبا پھیل گئی اور دھڑا دھڑ موتیں ہونے لگیں بہیترے جتن کئے گئے مگر مرنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی ہی جاتی تھی۔ ناچار بادشاہ نے سب کو حکم دیا کہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاؤ۔ میرے افسر تم سب کے پاس خود آئیں گے اور تم میں سے بہادروں کو چن چن کر فوج میں بھرتی کر لیں گے۔ یہ سن کر سب لوگ اپنے اپنے دیہات اور شہروں کو لوٹ گئے اور اپنے ساتھ بیماری کو بھی لیتے گئے اور اس طرح بڑے بادشاہ کی تمام سلطنت میں وبا پھیل گئی اور چند ہی روز میں ہزاروں لوگ موت کے گھاٹ اتر گئے تب بادشاہ نے اپنی سلطنت کے بڈھوں، امیروں، وزیروں کو بلایا۔ انہوں نے کہا "بادشاہ سلامت! ہمارے تمام نوجوان مر چکے ہیں۔ ہمارے گھر ویران ہو گئے ہیں۔ ہم اب جنگ نہیں کر سکتے۔ آپ نے بہادر سورماؤں کی فوج تیار کرنے کے لئے جو جشن کیا تھا اس نے نہ صرف اس فوج ہی کو برباد کر ڈالا بلکہ ہمارے ملک میں بھی تباہی پھیلا دی۔"

بادشاہ نے کہا "افسوس! اب کئی سال تک ہم جنگ نہیں کر سکتے۔" اور سب بڈھے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

اس خوفناک وبا کا حال چھوٹے بادشاہ کے کانوں تک بھی پہنچا اور اس کے امیر وزیر ایسے طاقت ور دشمن کے حملے سے بچ جانے پر اسے مبارکباد دینے آئے جس وقت وہ بادشاہ کے آس پاس بیٹھے تھے تو مکھیوں کا بادشاہ بھی بھن بھن کرتا ہوا ان کے

پاس آیا اور اپنی ننھی سی ترئی بجا کر اتنی اونچی آواز میں جو سب کے کانوں تک پہنچ جائے چلا کر کہنے لگا۔ "بادشاہ سلامت لائیے میرا انعام! میں نے اپنا کام انجام دے دیا ہے۔"

اس کی یہ بات سن کر سب لوگ ہنسنے لگے۔ "اے مکھیوں کے ننھے بادشاہ! ذرا ہمیں بھی معلوم ہو تم نے کیا کام سرانجام دیا ہے؟ ہمارے دشمن اگر مرے ہیں تو وبا سے مرے ہیں اس میں تیری کوشش کو کیا دخل ہے؟ تو جھوٹا اور دغاباز ہے۔"

مکھیوں کے بادشاہ نے کہا: "میں ہرگز دغاباز نہیں۔"

بادشاہ نے کہا "ثابت کر۔"

مکھیوں کے بادشاہ نے کہا "میں ثابت کرتا ہوں سنیئے۔ جب اس ملک کے دیہات اور شہروں سے نوجوان بادشاہ کی راجدھانی کی طرف روانہ ہوئے تو ہم بھی ان کی پیٹھوں، ان کے اسباب اور ان کے ٹٹوؤں اور بیلوں پر بیٹھ کر ان کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے وہاں ہر جگہ اپنے خیمے گاڑ دیئے اور بڑی بے احتیاطی سے رہنے سہنے لگے۔ وہ اور ان کے بیل اور گھوڑے جہاں جی چاہتا پاخانہ اور لید کر دیتے اور کوئی شخص زمین صاف نہ کرتا۔ اتفاق سے ان میں ایک شخص ایک ایسی جگہ سے آیا تھا۔ جہاں ہیضہ پھیلا ہوا تھا وہ اپنے ساتھ اس بیماری کے جراثیم بھی لیتا آیا تھا۔ ہم سب یعنی میں اور میرا لشکر پہلے تو گندگی اور کوڑے کرکٹ پر بیٹھتے اس کے بعد ان لوگوں کے کھانوں اور مٹھائیوں اور ان کے ہونٹوں اور آنکھوں پر جا بیٹھتے ہم گندی جگہوں پر بیٹھنے کے بعد نہ تو اپنے پاؤں صاف کرتے اور نہ جوتے اتارتے۔ پہلے تو ہم نے دستوں کی بیماری پھیلائی پھر جب ہم نے سنا کہ کوئی شخص اپنے ساتھ ہیضہ کے جراثیم یہاں لایا ہے تو ہم نے ہیضہ بھی پھیلا دیا۔" یہ کہہ کر مکھیوں کے بادشاہ نے پھر اپنی ترئی بجائی۔ "اے عادل اور انصاف پسند بادشاہ! اب میں اپنا انعام مانگتا ہوں۔"

یہ سن کر سب لوگ خوف سے تھرا اٹھے اور بادشاہ نے کہا: "بے شک تم انعام کے حقدار ہو۔ میں اپنے قول کے مطابق تمہیں انعام دوں گا اور تمہیں میری مٹھائیوں پر بیٹھنے اور

جہاں جی چاہے اڑنے کی اجازت ہوگی۔"

اب وہی بڈھا جس نے بادشاہ کے مکھی کی شرطیں مان لینے کی مخالفت کی تھی اپنی جگہ سے اٹھا بولا: "بادشاہ سلامت! میری التجا ہے کہ آپ نے مکھیوں کے بادشاہ سے جو اقرار کیا ہے اس سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھیے۔"

بادشاہ نے پوچھا: "بڑے میاں یہ کیوں؟"

اس کے جواب میں وہ بڈھا جو بلاشبہ سقراط ہی تھا اور اس دن تم لڑکوں نے ٹھیک بوجھ لیا تھا کہنے لگا۔ "جب آپ نے مکھیوں کے بادشاہ کے ساتھ اتحاد کیا تھا تو آپ نے انسان کے سب سے خطرناک دشمن کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ بادشاہ سلامت آپ کو معلوم ہونا چاہیئے ہمیں آئے دن جو طرح طرح کی بیماریاں گھیرے رہتی ہیں۔ ان میں سے زیادہ بھی مکھیاں پھیلاتی ہیں۔"

بادشاہ نے پوچھا "تو اب میں کیا کروں؟"

سقراط بولا: "حضور! آپ نے یہ وعدہ کیا تھا کہ مکھیوں کو آپ کی مٹھائیوں پر بیٹھنے کی اجازت ہوگی اور وہ جہاں چاہیں گی اڑ سکیں گی۔"

بادشاہ نے کہا "ہاں! اور اس قول کو نبھانا میرا فرض ہے۔"

سقراط بولا "تو اپنے قول کو نبھایئے لیکن خبردار رہیئے کہ مکھیوں کا بادشاہ کہیں آپ کے دشمن کی سلطنت کی طرح آپ کی سلطنت کو بھی تباہ نہ کر ڈالے۔ مکھیاں گندگی میں پرورش پاتی اور بچے دیتی ہیں اور آپ نے یہ تو وعدہ نہیں کیا کہ آپ ان کے لئے گندگی بھی مہیا کرتے رہیں گے۔"

بادشاہ نے کہا "نہیں میں نے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا! اور نہ یہ اجازت دی ہے کہ وہ بادشاہ کے سوا کسی اور کے دسترخوان پر بھی بیٹھ سکیں۔"

یہ سن کر ایک چھوٹے قد کا شخص جو ڈرپوک تھا۔ بول اٹھا "بادشاہ سلامت! خدا کے

لئے اس طاقت ور دشمن کو ناراض نہ کیجیے" لیکن بادشاہ نے اس کی بات کی کچھ پروا نہ کی اور کہا "ہمیں اپنی جانوں کی حفاظت کرنی چاہیے۔ ورنہ مکھیوں نے جس طرح ہمارے ہمسایہ بادشاہ کی فوج میں وبا پھیلا کر اسے تباہ کر ڈالا ہے اسی طرح ہمیں بھی تباہ کر ڈالیں گی۔"

مکھیوں کے بادشاہ نے اپنا ننھا سا پاؤں زمین پر مارا اور بڑی بے صبری سے پوچھا "اے بادشاہ! مجھے انعام کب ملے گا؟"

بادشاہ نے جواب دیا "اسی وقت لیکن میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اس سے ذرا بھی تم قدم نہ بڑھا سکو گے۔"

یہ سن کر مکھیوں کا بادشاہ اُڑ گیا اور تھوڑی دیر میں اپنا لاؤ لشکر لیے آیا۔ تمام مکھیاں بادشاہ کی مٹھائیوں کے دسترخوان پر جا جا کر بیٹھتیں اور جہاں چاہتی اڑتی پھرتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ تھوڑے ہی دنوں میں بیمار پڑ کر مر گیا لیکن چونکہ اور کسی نے مکھیوں کو اپنے کھانے پینے کی چیزوں کے قریب نہ پھٹکنے دیا تھا اس لئے اور کسی کو کچھ ضرر نہ پہنچا۔ وہ اپنی کھانے پینے کی چیزیں یا تو باریک کپڑوں کے نیچے ڈھک کر یا الماریوں، برتنوں اور بکسوں میں بند کر کے رکھتے اس طرح مکھیوں کا کچھ بس نہ چلتا اور وہ وبا نہ پھیلا سکتیں اور چونکہ مکھیاں گندگی میں انڈے دیا کرتی ہیں۔ انہوں نے غلاظت اور کوڑے کرکٹ کے لئے الگ گڑھے کھود لئے۔ وہ ان میں تمام کوڑا کرکٹ پھینک دیتے اور کسی جگہ گندگی وغیرہ کا نام تک نہ رہنے دیتے۔ وہ اپنے گھروں اور دیہات کو ایسا صاف ستھرا رکھتے کہ مکھیوں کو انڈے دینے کے لئے کوئی جگہ ہی نہ ملتی۔ پہلے تو وہ لوگ جہاں جی چاہتا پاخانہ کر لیتے تھے لیکن اب انہوں نے خاص طور پر اس کام کے لئے گڑھے بنوائے تھے اور کسی جگہ رفع حاجت نہ کر پاتے۔ اور وہ اپنے اصطبلوں اور مویشی خانوں کو بھی بہت صاف ستھرا رکھتے۔ لید اور گوبر وغیرہ گڑھوں میں پھنکوا دیتے وہ ان گڑھوں کو پانی سے تر کرتے رہتے تاکہ وہ گرم رہیں اور ان میں خمیر اٹھتا رہے اور مکھیاں وہاں بھی انڈے نہ دینے پائیں۔ جب گڑھے بھر جاتے اور تمام کوڑا کرکٹ اور گندگی مٹی میں گھل مل کر نہایت

عمدہ کھاد بن جاتی۔ تو وہ اسے اپنے کھیتوں میں استعمال کرتے اب انہیں مکھیوں کا کچھ اندیشہ نہ رہا۔ انہیں نہ صرف بیماریوں اور مکھیوں ہی سے چھٹکارا مل گیا۔ بلکہ ان کی کھیتیاں بھی پہلے سے زیادہ ہری بھری ہو گئیں اور ان کی جسمانی صحت بھی پہلے کی نسبت اچھی ہو گئی۔

اس طرح انہوں نے اپنی سلطنت کو نہ صرف اپنے ظالم ہمسایہ بادشاہ ہی سے بچا لیا بلکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک دشمن یعنی مکھی کے شر سے بھی محفوظ ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی چھوٹی سلطنت کی رعایا نے بڑی سلطنت کی رعایا سے دوستی بھی پیدا کر لی اور دونوں نے آپس میں عہد کر لیا کہ ہم بجائے ایک دوسرے سے لڑنے کے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گندگی مکھی اور وبا کے خلاف جنگ کرتے رہیں گے اور چھوٹی سلطنت کی شہزادی نے بڑی سلطنت کے شہزادے سے شادی کر لی اور وہ اور اُن کی رعایا ہمیشہ ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے رہے۔"

سقراط نے ننھی لڑکی سے کہا "کیوں ننھی اب تو تم خوش ہو؟ اب تو تمہاری شہزادی پھر خوش رہنے سہنے لگی ہے۔"

پھر وہ بڑی عمر کے لڑکوں کو مخاطب کر کے بولا "لڑکو! اب جب سالانہ جلسہ ہو تو تم اس کہانی کو جو میں نے تمہیں سُنائی ہے ناٹک تیار کر کے دکھانا۔ اس میں شیر بھی لانا اور بھیڑیے وغیرہ بھی اور مکھیوں کے بادشاہ کے لئے کوئی اچھا سا لباس تیار کرنا اور اس کے شانوں پر پر بھی لگانا جب تمہارے والدین اور دوست اس ناٹک کو دیکھیں گے تو ان کی سمجھ میں آ جائے گا کہ تم نہانے دھونے اور صفائی کا اس قدر خیال کیوں رکھتے ہو اور تمہیں اپنے اسکول، احاطے اور دیہات کو صاف ستھرا رکھنے کی اتنی فکر کیوں ہوتی ہے؟"

(دیہات میں بوائے سکاؤٹ کا کام)

از الیف۔ ایل۔ برین، ایم۔ سی، آئی۔ سی۔ ایس

مترجمہ: پطرس

ویلٹن صاحب اور مَیں

نتھیا گلی شمال مغربی سرحدی صوبے کا تابستانی دارالخلافہ ہزارے کی سرسبز پہاڑیوں میں ۸ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور کئی پہلوؤں سے ایک نہایت معمولی پہاڑی مقام ہے اور سب سے زیادہ یہی وجہ ہے کہ میں نتھیا گلی کا گرویدہ ہوں۔ وہاں کے گھنے جنگل بہت حد تک تہذیب کے جنونِ تعمیر کی دست درازیوں سے محفوظ ہیں۔ قدرت کی شان و شوکت کے علمبردار آسماں بوس عظیم الشان درخت لاکھوں کی تعداد میں اپنی مہیب خاموشی میں کھڑے ہیں۔ ندی نالے اپنے قدرتی آبریزوں میں اُچھلتے کودتے بہہ رہے ہیں۔ وہاں کی آبادی سو ڈیڑھ سو سے زیادہ نہیں۔ اس لئے کشمکشِ حیاتِ انسانی کے وہ روح فرسا مناظر جو بڑے بڑے شہروں میں بہت عام ہوتے ہیں، وہاں بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ شملہ کی فضا کو متلون فیشن کی رنگ آمیزیوں نے میرے سادگی پسند دماغ کے لئے کثیف اور میرے حساس دل کے لئے زہر یلا غبار کھا ہے۔ مری جسامت کے لحاظ سے تو نہیں لیکن لوغاً بعینہٖ شملہ ہے۔ اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ میں اسے شملہ پر ترجیح دوں۔ ایبٹ آباد میں میرے آشناؤں کی کثرت میری تنہائی پسند طبیعت کی خواہشات کے مانع ہے۔ لیکن گزشتہ گرمیوں کے موسم میں اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی تھی جس نے مجھے نتھیا گلی جانے پر مجبور کر دیا۔

میں نے مجبور کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مگر میں یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ جبر مجھے کسی طرح ناگوار نہ تھا۔ ویلٹن صاحب جن کو میں دوست کہنا تھوڑی سی لاف زنی اور دوست کے

علاوہ کسی اور نام سے پکارنا غلط بیانی سمجھتا ہوں۔ گزشتہ موسم گرما میں باندہ گلی مقیم تھے اور انہی کے قرب کی خواہش مجھے کشاں کشاں نتھیا گلی لے گئی۔ باندہ گلی نتھیا گلی سے پانچ ساڑھے پانچ میل کے فاصلے پر ایک اور چھوٹا سا پہاڑی مقام ہے۔ جس میں ایک ہوٹل، تحصیل، خزانہ، کچہری اور ڈاک بنگلے کی موجودگی نے اسے تھوڑی سی اہمیت دے دی ہے۔ ویلٹن صاحب اسی ہوٹل میں رہتے تھے اور میں نتھیا گلی میں خواجہ محمد حسین کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ نتھیا گلی کا بازار بمشکل پانچ چھ دکانوں پر مشتمل ہے جو ضروریاتِ زندگی مہیا کر سکتی ہیں اور بس۔ یہ دکانیں ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی سڑک کے ایک موڑ پر کھڈ کی طرف واقع تھیں اور ڈاکخانے سے شاید اس کی عمارت سرکار دیت، سے مرعوب ہو کر ذرا فاصلے پر تھیں۔ سڑک کے دوسری طرف اسی موڑ پر ڈاکخانے اور دکانوں کے مقابل بازار بھی ہے ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر دس بارہ قدم چڑھنے کے بعد خواجہ محمد حسین کی کوٹھی تھی۔ جس کی سرخ چھت اور برآمدے کے خوشنما پتھر کے ستون اپنی بلندی پر سے کم مایہ دکانوں اور بیکار ڈاکخانے کو حقارت کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔

ہفتے کے دن دو بجے کے قریب میں برآمدے میں بیٹھا خواجہ صاحب کے دفتر سے واپس آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ صبح سات بجے سے بارش بہت زور شور کی ہو رہی تھی اور میں اس کی روح افزا کیفیت کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ لطیف سحاب پارے اوپر نیچے دائیں بائیں تگ و تاز میں مصروف تھے۔ بارش کے چلمن میں سے مَیں سامنے کی دکانوں کو دیکھ رہا تھا۔ جن کے مالک اس شدید بارش میں خریداروں سے مایوس بیٹھے تھے۔ بارش کے مسلسل شور سے میرے دماغ میں ایک عجیب نیند سی چھا گئی اور میں خواب بیداری میں ویلٹن صاحب اور اپنے باہمی تعلقات پر غور کرتا رہا۔ وہ عیسائی ہیں مسلمان۔ وہ انگریز میں ہندوستانی، ان کی زندگی آزاد اور خود مختار میں نئی نئی ڈگری حاصل کرنے کے بعد روزگار کا متلاشی۔ ہمیں جاننے والی دنیا حیران تھی اور میں خود بھی حیران تھا کہ باوجود اس قدر تفاوت کے ان کی میری کیونکر نبھتی ہے۔ پانچ سال کی باہمی آشنائی نے ہمیں ایک دوسرے

بہت مانوس کر دیا تھا۔ مجھے اپنی نسبت تو یقین ہے کہ انہوں نے مجھے کسی عجیب طریقے سے مسحور کر رکھا ہے۔ اس قدر کہ بعض اوقات ان کے متعلق میرے جذبات میں صاف نسوانیت کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ان کی نسبت میں یہ کہوں گا کہ میں اب تک فیصلہ نہیں کر سکا کہ اُن کا مجھے شرف بخشنا میری کسی صفت کی بدولت ہے یا محض ان کی فیاض دلی کا نتیجہ ہے وہ مجھ سے عمر میں چند سال بڑے ہیں۔ لیکن کبھی تو میں ان کے سامنے اس طرح سہم جاتا ہوں جیسے شاگرد استاد کے سامنے اور کبھی اس قدر بے تکلف ہو جاتا ہوں۔ جیسے شاگرد اُستاد کے سامنے۔ اور کبھی اس قدر بے تکلف ہو جاتا ہوں جیسے وہ اور میں بچپن میں برسوں اکٹھے کھیلتے رہے ہوں۔

میرے خیالات یہاں تک پہنچے ہوں گے کہ ان کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور میں نے دیکھا کہ میرے بائیں ہاتھ میں سگریٹ بجھ گیا۔ مجھے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز نے زیادہ بیدار کر دیا اور سگریٹ جلاتے جلاتے میں نے کنکھیوں سے باندہ گلی کی سڑک کی طرف دیکھا۔ پتھریلی سڑک پر ایک سوار بارانی ٹوپی اور بارانی کوٹ میں چھپا ہوا تیز دُلکی پر نتھیا گلی کی طرف آرہا تھا۔ جب وہ قریب پہنچا تو اس کے سیاہ ننگے پاؤں مجھے رکابوں میں نظر آئے۔ معلوم ہوتا تھا کوئی سائیس ہے۔ بازار میں پہنچ کر وہ گھوڑے پر سے اترا اور باگ کو اس کی گردن پر سے اتار کر ہاتھ میں ڈال لیا اور ہماری کوٹھی کی طرف چڑھنے لگا۔ میں پہلے سے زیادہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

قریب آکر اُس نے مجھے ایک خط دیا جس کا بڑا میلا لفافہ صاف کہہ رہا تھا کہ باندہ گلی ہوٹل سے کوئی پیغام آیا ہے۔ خط بلا شبہ ویلٹن صاحب کا تھا۔ میں فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور سگریٹ کو پھینک کر اسے جلدی جلدی کھولا۔ ویلٹن صاحب انوکھے خط لکھا کرتے تھے۔ مگر یہ سب سے نرالا تھا۔ یہ میرے پاس اب تک محفوظ ہے اور اس وقت میں اس کو سامنے رکھ کر اس کا ترجمہ کر رہا ہوں:۔

باندہ گلی

پیارے امجد!

سواری کا لباس پہن کر فوراً یہاں آجاؤ اور اپنے ساتھ بھرا ہوا پستول، چھ فالتو کارتوس، میرے کمرے کی چابی اور پانچ چھ نوٹ پیپر لیتے آؤ۔

تمہارا مخلص

"ایچ۔ ڈبلیو۔ ویلٹن"

میں فوراً اندر گیا اور جلدی جلدی اپنا لباس تبدیل کیا۔ ٹرنک کھول کر اس میں سے چھ کارتوس نکالے۔ تکیے کے نیچے سے اپنا بھرا ہوا پستول اٹھا کر برجس کی جیب میں ڈال لیا۔ نوٹ پیپروں کے دستے سے چھ کاغذ پھاڑ کر تہ کئے۔ پاس ہی سے ویلٹن صاحب کے کمرے کی چابی اُٹھائی (ویلٹن صاحب نے اپنے کمرے کی ایک چابی مجھے اس لئے دے رکھی تھی کہ میں بعض اوقات جب پہاڑیوں میں پھرتے پھرتے باندہ گلی کے قریب جا نکلتا اور تھک کر آرام کی ضرورت محسوس کرتا تو ان کی غیر حاضری میں ان کا کمرہ کھول کر وہاں بیٹھ جایا کرتا) سب چیزوں کو جیبوں میں ڈال کر احتیاطاً پھر پڑتال کی اور بارانی کوٹ پہنتا پہنتا باہر نکلا۔ نوکر کو خواجہ صاحب کے نام پر ایک رقعہ اس مضمون کا لکھ کر دیا کہ "خدا جانے میں کس وقت واپس آؤں۔ آپ چائے اور کھانے پر میرا انتظار نہ کریں"۔ یہ سب کچھ کر کے گھوڑے پر سوار ہو سرپٹ باندہ گلی کو روانہ ہو گیا۔

تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد اس چھوٹی سی سطح مرتفع پر پہنچ گیا۔ جہاں باندہ گلی کا ایک رویہ بازار، ہوٹل، ڈاک بنگلہ وغیرہ ایک مسلسل سا نصف دائرہ بنائے کھڑے ہیں۔ باندہ گلی کا بازار بالکل نتھیا گلی کا سا ہے۔ دائیں ہاتھ کو ایک درزی کی چھوٹی سی دکان، اس کے ساتھ

سیٹھ فیروز جی کا شراب، تمباکو، قلم، کاغذ، پنسل وغیرہ کا سٹور، پھر اس کے ساتھ ایک کنجڑے اور پھر شاید ایک بنئے کی دکان تھی۔ اسی قطار میں کچھ فاصلے پر تحصیل، خزانہ، کچہری اور سامنے ڈاک بنگلے کی چھوٹی سی چوکور عمارت تھی۔

بائیں ہاتھ کو باندہ گلی ہوٹل بھوکے پیاسوں کے لئے اپنی آغوش شفقت کھولے بغیر کسی تکبر اور غرور کے کھڑا تھا۔ باندہ گلی میں داخل ہوتے ہی میں نے ہوٹل کا رُخ کیا گھوڑے کو اصطبل میں سپرد کر کے سیدھا ۳۱۵ نمبر کمرے کی طرف گیا۔ دروازے کو دھکیلا لیکن دروازے کا تالا بند تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ویلیٹن صاحب نے کیوں مجھے چابی ساتھ لانے کو کہا تھا۔ خیر دروازہ کھول کر میں اندر گیا۔ سب سے پہلے جس چیز پر میری نظر پڑی وہ ایک سفید رنگ کا کارڈ تھا۔ جو انگیٹھی کے اوپر طاق پر ایک پھولدان کے سہارے کھڑا تھا اور جس پر سرخ پنسل سے ویلیٹن صاحب کے ہاتھ کے دو فقرے لکھے تھے:۔

”میرا پتہ مینجر سے پوچھ لو ـــ یہ کارڈ جلا دو“

میں نے ان دو فقروں کو شاید چھ دفعہ پڑھا۔ جیب سے دیا سلائی کا بکس نکال کر کارڈ جلا دیا۔ اور دروازے کا تالا پھر بند کر کے مینجر کے کمرے کی طرف آیا۔

میں نے جلدی سے مینجر کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ لیکن جس تیزی سے میں نے اسے کھولا، ہرگز اس تیزی سے اسے بند نہ کر سکا۔ جان ولیم باندہ گلی ہوٹل کا مالک اور مینجر اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے دونوں بازو میز پر اور اس کا چہرہ اس کے بازوؤں میں چھپا ہوا تھا۔ میں جان ولیم کو دو تین سال سے جانتا تھا۔ کسی نامعلوم وجہ سے ویلیٹن صاحب کو اس سے خاص اُنس تھا جس کی بدولت مجھے جان ولیم سے ہزار دفعہ ملنے کا اتفاق ہوا تھا میں اس سے جب ملا اُسے مسکراتا ہوا پایا۔ جب اُس نے مجھ سے بات کی مجھے ہنسا کر ہی گیا۔ آج اس کو اس قدر مغموم دیکھ کر مجھے ترس سا آیا۔ میں نہایت آہستہ سے دروازہ بند کر کے آگے بڑھا۔ کمرے کے بیچ میں ایک چھوٹی سی گول میز تھی۔ اس پر اپنی ٹوپی اور برانی کوٹ

کو پھینک دیا اور نہایت نرم آواز میں پکارا ”ولیم!“

ولیم نے میز پر سے اپنا سر اٹھایا اور اگر مجھے اس کے غمزدہ ہونے میں کوئی شک تھا۔ تو وہ سب رفع ہو گیا۔ اس کا چہرہ غم سے بالکل ناآشنا معلوم ہوتا تھا اور اس کے ہونٹ ایک رحم طلب انداز میں ذرا نیچے کو جھکے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا ـــ

”ویلیٹن صاحب ۱۷ نمبر کمرے میں ہیں“

میں نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے اور پوچھا:۔

”ولیم! تم آج اس قدر غمگین کیوں ہو؟“

کچھ دیر تو وہ خاموش رہا۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا:۔

”کچھ نہیں اپنے کاروبار کے متعلق بیٹھا سوچ رہا تھا۔“

اور سر نیچا کر لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نے مجھے ٹال دیا ہے۔ میں نے اُس سے کہا:۔

”ولیم! تمہیں غمزدہ دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے کہ تم مجھے اس قابل نہیں سمجھتے کہ اپنی تکلیف مجھ سے بیان کرو۔“

شاید میرے خلوص اور صداقت نے اس پر اثر کیا۔ ایک آدھ منٹ تک وہ کچھ نہ بولا اور دائیں ہاتھ کے ساتھ اپنے کوٹ کے ایک بٹن سے غافلانہ کھیلتا رہا۔ پھر سر اُٹھا کر کہا:۔

”آپ کسی سے کہئے نہیں۔“

”مجھ پر یقین رکھو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں کسی سے نہیں کہوں گا۔“

”ہوٹل میں ایک قتل ہوا ہے۔“

”قتل؟ کب؟ کس کا قتل؟“

میں حیران تھا کہ آج دو بجے سے جو بات ہو رہی ہے غیر معمولی، جو واقعہ پیش آتا

ہے۔ فوق العادت۔ پہلے ولیٹن صاحب کا پراسرار خط پھر اس کارڈ پہ وہ پراسرار تحریر اور اب یہ قتل کی خبر میں نے میز پر سے اپنی ٹوپی اٹھا کر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لی۔ میرے دل میں پریشانی، میری انگلیوں کی مضطربانہ حرکات سے ظاہر تھی۔ ولیم کی آواز نے آخر کار مجھے اس طرف متوجہ کیا۔

"۱۲ نمبر میں براؤن نامی ایک شخص دو مہینے سے یہاں رہتا تھا۔ کل شام کو چار بجے ہوٹل میں چائے پینے کے بعد وہ سیر کو نکلا اور کھانے کے وقت تک واپس نہ آیا۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ واپس کس وقت آیا۔ کیونکہ نہ تو اس نے آکر کھانا مانگا اور نہ رات کے دس بجے تک اس کے کمرے میں کسی نے لیمپ ہی جلتے دیکھا۔ جیسا کہ عام دستور ہے۔ صبح سات بجے وہ چائے پیا کرتا تھا۔ آج صبح حسبِ معمول نوکر اس کے کمرے میں چائے لے کر گیا تو دیکھا کہ خواب گاہ از حد بدنظمی اور بے ترتیبی کی حالت میں ہے۔ تمام چیزیں اُلٹ پلٹ پڑی ہیں اور براؤن اپنے بستر پر بغیر کسی اوڑھنے کے ڈریسنگ گون پہنے بظاہر سویا پڑا ہے۔ وہ اسے جگانے کی غرض سے نزدیک گیا تو معلوم ہوا کہ اس کی دائیں کنپٹی پر ایک بڑا سا مہیب زخم ہے۔ اس کا رنگ بالکل زرد اور اس کی آنکھیں کھلی اور پتھرائی ہوئی ہیں۔ دفعتاً نوکر پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ اس کے سامنے ایک سویا ہوا آدمی نہیں بلکہ ایک مرا ہوا آدمی پڑا ہے۔ نوکر بھاگا ہوا میرے پاس آیا اور ٹوٹے پھوٹے فقروں میں براؤن کی موت کی خبر سنائی۔ میں اس کے ساتھ بارہ نمبر کمرے میں گیا اور حالات کو بعینہٖ ویسے پایا۔ جیسا کہ اس نے مجھ سے بیان کیا تھا۔ مسٹر امجد! آپ خیال فرمائیے کہ اس ناگوار واقعہ سے میری اور میرے ہوٹل کی نیک نامی پر کس قدر بُرا اثر پڑے گا۔ اس وقت میرے ہوٹل میں سو کے قریب آدمی رہتے ہیں مگر اس واقعہ کے طشت ازبام ہو جانے کے بعد آپ یقین رکھیے کہ ایک شریف آدمی بھی یہاں قدم نہ رکھے گا وہ کیوں رہیں؟ اس ہوٹل میں جہاں لوگ بلا وجہ قتل کر دیئے جاتے ہیں؟ جہاں مال کا نہیں جان کا خطرہ ہوتا ہے؟ میں کچھ ہوں ہی

بدقسمت اور مجھے نہیں معلوم میری بدقسمتی کا زمانہ کب تک رہے گا۔ آپ کو علم ہوگا جب میں اور میرا بھائی ہندوستان آتے تو پہلے پہل ہم نے بریلی میں مشترکہ سرمایہ سے ایک ہوٹل کھولا۔ لیکن تھوڑے عرصے کے بعد میں اس بات پر مجبور ہو گیا کہ چارلس کو علیحدہ کر دوں۔ اس کی عادات مجھے پسند نہ تھیں، اس کی سرکشی اور فضول خرچی ہوٹل کے کاروبار کے لئے از حد مضرت رساں تھی۔ بھائی کو اس طرح علیحدہ کر دینا مجھے سخت ناگوار تھا۔ مگر اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ بریلی کے ہوٹل کا کام بہت زیادہ تھا اور میں اکیلا اس کا متحمل نہ ہو سکا۔ اسے چھوڑ کر میں نے اس جگہ ہوٹل کھولا اور اب یہاں یہ قتل ہو گیا ہے۔ اب یہ ہوٹل بھی ٹوٹ جائے تو بتائیے میں جہنم میں جاؤں؟"

ولیم کی داستان درد سے میں از حد متاثر ہوا مگر باوجود اس کے یا شاید اسی وجہ سے میں اس کے پاس سے بہت جلد جانا چاہتا تھا۔ ہزاروں طرح کے سوالات میرے دل میں اٹھے مگر میں نے سب کو دبا کر کہا۔

ولیم! تم ناحق اس قدر فکر کر رہے ہو۔ امید ہے قاتل کا پتہ بہت جلد مل جائے گا۔ تم ذرا حوصلہ کرو۔ تم نے کیا کہا؟ ولیٹن صاحب ۱۲ نمبر میں ہیں؟"

"ہاں۔ مگر آپ ۱۲ نمبر کمرے میں غسل خانے کے رستے جائیے۔"

میں "کیوں؟" کہنے کو تھا۔ مگر "اچھا" کہہ کر باہر نکل آیا۔ بارش ختم ہو چکی تھی اور پھٹتے ہوئے سفید بادلوں میں سے نیلا نیلا آسمان کہیں کہیں سے نظر آ رہا تھا۔

غسل خانے کی طرف سے ۱۲ نمبر کمرے میں داخل ہوا تو پہلے سونے کے کمرے میں پہنچا۔ بستر پہ براؤن کی لاش ایک سفید چادر سے ڈھکی پڑی تھی۔ یہاں سے میں نشست گاہ میں عین اس وقت داخل ہوا جس وقت ولیٹن صاحب کونے میں میز کے سامنے ایک کرسی پہ بیٹھے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے سگریٹ کیس

میری طرف بڑھایا۔ سگرٹ کو ہونٹوں میں دباتے ہوئے میں دیا سلائی جلا رہا تھا کہ ولیٹن صاحب بولے:۔

"اچھا۔ تو تم سارا قصہ ولیم سے سُن آئے ہو؟"

"ہاں۔ مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

وہ سگرٹ جلا چکے تو دیا سلائی کو انگیٹھی میں پھینک کر کہا:۔

"جس وقت تم تھیا گلی سے چلے تو بارش ہو رہی تھی نا؟"

"موسلا دھار"

"تو تمہارا باران کوٹ کہاں ہے؟"

"وہ تو...... میں منیجر کے کمرے میں بھول آیا ہوں"

"اور تم وہاں ہرگز نہ بھول آتے۔ اگر تم منیجر سے فقط میرا پتہ پوچھ کر چل دیتے۔ اچھا۔ یہ دیکھو۔ سیٹھ فیروز جی اپنے بل فارم کس قدر خوبصورت چھپواتا ہے"

یہ کہہ کر انہوں نے میرے ہاتھ میں فیروز جی کی دکان کا ایک بل دیا۔ بل اسی قسم کا تھا۔ جس قسم کے [illegible] چیزیں خریدنے والوں کو دیئے جاتے ہیں اور جو بطور ایک رسید کے ہوتے ہیں۔ بل پہ خریدار کا نام ندارد تھا۔ صرف اس قدر لکھا ہوا تھا:۔

ایک ڈبہ پانامہ سگار	.	——	۲۵
ایک چھوٹا وسکی	.	۶	..
	.	۶	۲۵

فارم پر سیٹھ فیروز جی کا نام وغیرہ رنگدار روشنائیوں میں واقعی نہایت خوبصورت چھپا ہوا تھا۔

میں مسلمان مشرب، شراب نوشی کی اصطلاحات سے ناواقف۔ میں نے پوچھا۔

"اس چھوٹا وسکی کا کیا مطلب؟ معمولی درجہ کی؟"

"نہیں۔ ایک چھوٹا وسکی کے معنی وسکی کا ایک چھوٹا پیگ۔ اب یہ دیکھو۔ ہمارے ہوٹل کے فارم اگرچہ سائز میں اس سے بڑے ہیں مگر چھپائی میں کس قدر خراب ہیں"

اب کے انہوں نے باندہ گلی ہوٹل کا بل فارم میرے ہاتھ میں دیا۔ میں حیران تھا۔ کہ ولیٹن صاحب نے مجھے تھیا گلی سے اس لئے بلایا ہے کہ انہیں بل فارموں کی چھپائی کے سے اہم مسئلے پر میری رائے کی ضرورت تھی۔ خیر میں نے بل کو دیکھا۔ چھپائی واقعی کچھ قابل تعریف نہ تھی۔ باقی تحریر عام بلوں کی سی تھی:۔

بل بنام ٹی براؤن صاحب کمرہ نمبر ۱۲ بابت ماہ جولائی

	پائی	آنہ	روپیہ
خوراک وغیرہ	.	.	۱۱۰
کرایہ	.	.	۳۰
	.	.	۱۴۰

سیٹھ فیروز جی کا بل میرے دائیں ہاتھ میں تھا اور ہوٹل کا بل بائیں ہاتھ میں۔ میں باری باری دونوں کو دیکھ رہا تھا کہ ولیٹن صاحب بولے:۔

"یہ دونوں بل مجھے براؤن کے اس کوٹ کی جیب سے ملے ہیں جو وہ کل شام کو پہن کر باہر گیا تھا۔ پہلا سوال جو ان بلوں کو دیکھتے ہی میرے دل میں اٹھا وہ یہ تھا کہ میری خوراک کا خرچ ایک سو پچاس روپے ماہوار ہوتا ہے۔ براؤن کا ایک سو دس روپے کیوں تھا؟ منیجر سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ براؤن شراب نہیں پیا کرتا تھا نہ کھانے پر نہ کسی اور وقت۔ اس لئے وہ شراب کے چالیس روپے جو ہوٹل والے ہم سے چارج کرتے ہیں۔ اس سے تیس

لئے جاتے تھے۔"

(میں نے دل میں براؤن صاحب مرحوم کو آخر میں کہا کہ نیکی کا کام تو کرتا تھا) ولیٹن صاحب نے سلسلہ کلام پھر شروع کیا:۔

" اگر وہ شراب نہیں پیا کرتا تھا جیسا کہ مصدق ہے تو دوسرا سوال یہ ہے کہ اس نے کل کیوں سیٹھ فیروز جی کی دکان سے وسکی کا ایک پیگ پیا؟"

(افسوس براؤن مرتے مرتے یہ گناہ کر ہی بیٹھا)

" اب تم دیکھو۔ یہ طاق پہ پانچ چھ سگاروں کے ڈبے پڑے ہیں۔ ایک میں تو کچھ سگار ہیں۔ باقی سب خالی ہیں۔ مگر سب ڈبوں پر سگاروں کا نام "سلطانہ" لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ براؤن کو "سلطانہ" سگار پینے کی عادت تھی۔ باوجود اس کے سیٹھ فیروز جی کا بل کہہ رہا ہے کہ کل اس نے "پانامہ" سگاروں کا ایک ڈبہ خرید لیا۔ یہ کیا تعجب کی بات نہیں کہ ایک شخص جس کی نسبت ہوٹل کے جو لوگ اسے جانتے ہیں، وہ گواہی دیتے ہیں کہ اس کی زندگی نہایت سنجیدہ و متین اور اس کی عادات نہایت سادہ اور باقاعدہ تھیں۔ اپنی موت کے دن اپنے مقررہ معمول سے اس قدر انحراف کرے کہ شراب نہ پیتا ہو تو اس دن شراب پی لے اور سگار جو وہ غالباً برسوں سے پی رہا ہے۔ چھوڑ کر ایک اور قسم کے نہایت قیمتی سگاروں کا ڈبہ خرید لے۔ پھر وہ ڈبہ بھی تو اس کمرے میں کہیں نہیں ملتا۔ کیا اس نے وہ کسی دوسرے شخص کے لئے خریدا تھا؟ ممکن نہیں۔ انگیٹھی کے پاس سے مجھے یہ دو جلے ہوئے سگاروں کے باقی ماندہ ٹکڑے ملے ہیں۔ جن کا تمباکو "سلطانہ" سگار کے تمباکو سے بہت مختلف اور اعلیٰ ہے۔ (غالباً پانامہ سگار یہی ہیں (چونکہ میں خود سگار نہیں پیتا۔ اس لئے میری واقفیت اس بارے میں محدود ہے) تو گویا اس کمرے میں دو پانامہ سگار پئے گئے لیکن باقی کا ڈبہ غائب ہے۔ اب چلو خواب گاہ کا معائنہ کریں۔"

یہ کہہ کر ہم دونوں خواب گاہ میں گئے۔ ولیٹن صاحب نے براؤن کی لاش پر سے چادر اٹھائی۔ براؤن ستر پچھتر برس کی عمر کا ایک پتلا دبلا قریباً چھ فٹ دو انچ قد کا آدمی تھا اس کے چہرے سے بے انتہا شرافت ٹپکتی تھی اور تعجب ہوتا تھا کہ ایسے آدمی کو کوئی کس طرح قتل کر سکتا ہے۔ اردگرد کی سب چیزیں درہم برہم تھیں جیسے کوئی دو شخص ایک دوسرے سے کشتی لڑتے رہے ہوں۔

" کنپٹی کے زخم کے علاوہ براؤن کا دایاں بازو بھی ٹوٹا ہوا ہے اور یہ دونوں ضربیں معلوم ہوتا ہے کسی کندوزنی چیز سے آئی ہیں۔ اس قسم کی کندوزنی چیز دونوں کمروں میں کوئی نہیں۔ لیکن قابلِ غور ایک اور بات ہے وہ سامنے کھونٹی پہ براؤن کا وہ کوٹ لٹکا ہوا ہے۔ جسے وہ کل پہن کر سیر کرنے گیا تھا۔ یہ کوٹ ایک دو جگہ بالکل تازہ پھٹا ہوا تھا۔ اب اگر یہ کوٹ اس کشمکش میں پھٹا ہے جس کشمکش کا نتیجہ براؤن کے لئے موت تھا تو کیا براؤن میں باوجود ایک مہلک زخم اور ایک ٹوٹے ہوئے بازو کے اس قدر ہمت تھی کہ وہ کوٹ اتار کر نہایت سلیقے سے کھونٹی پہ لٹکاتا۔ پھر اس کی جگہ یہ ڈریسنگ گون پہنتا جس کی ڈوری کی گانٹھ تم غور کرو نہایت احتیاط سے دی ہوئی ہے۔ عقل کہتی ہے کہ یہ سب کچھ براؤن کا کام نہیں۔ اس کے علاوہ براؤن کے شام کے وقت پہننے کی ٹوپی جو کل شام ضرور اس کے سر پہ تھی۔ یہاں کہیں نہیں ملتی۔"

یہ کہہ کر ولیٹن صاحب نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ میں بڑے انہماک سے ان کی باتیں سن رہا تھا اور ساتھ ہی بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔ فی الحقیقت اس قتل کے گرد ایک ایسی تاریکی محیط تھی جس میں میرے متجسس دماغ کو کوئی راہ دکھائی نہ دیتی تھی جب میں ولیم سے قتل کا ماجرا سن رہا تھا تو میرا دل قتل اور قاتل کی نسبت ولیم کی مصیبت کی طرف زیادہ متوجہ تھا اور اب قتل مجھے ایسا اہم واقعہ معلوم ہو رہا تھا کہ میں ولیم کی تکلیف کو بالکل بھول گیا۔

ولیٹن صاحب مجھے ساتھ لے کر غسل خانے کے دروازے سے باہر نکلے۔ میں نے ان سے پوچھا:۔

" یہ ہم چوروں کی طرح غسل خانے کے دروازے سے کیوں آتے جاتے ہیں؟"

وہ بولے۔

" ولیم نے جب تمہیں سارا حال سنایا تو اس نے تم سے یہ وعدہ نہیں لیا کہ تم کسی کو نہ کہو گے؟"

" لیا تھا!"

" ہوٹل میں تین چار آدمیوں کے سوا اور کسی کو اس واقعے کا علم نہیں اور حتی الوسع کوشش کی جا رہی ہے کہ جب تک تفتیش کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچے اس کا ذکر نہ کیا جائے جو نوکر صبح براؤن کی چائے لے کر آیا تھا اور جس نے سب سے پہلے اس ہوٹل میں براؤن کو مرا ہوا دیکھا اس کو ولیم نے شاید کچھ روپے دے کر چند دن تک اس معاملے پر زبان بند رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ سب انسپکٹر صاحب بھی شریف آدمی تھے۔ انہوں نے بھی وعدہ کیا ہے کہ جب تک انہیں کسی خاص شخص کے مجرم ہونے کا پورا یقین نہ ہو جائے وہ کسی سے ذکر نہ کریں گے۔"

" اچھا تو پولیس کو اطلاع دی گئی ہے؟"

" اوہو۔ ولیم نے تم سے نہیں کہا۔ صبح سب انسپکٹر صاحب خاکی کاغذوں کا ایک دستہ اور قلم دوات لے کر یہاں آئے تھے۔ مینجر کے کمرہ میں گھنٹہ بھر بیٹھ کر بیانات قلمبند کرتے رہے پھر ایک نوکر کو گرفتار کر کے ساتھ لے گئے۔ مگر وہ بالکل بے گناہ ہے۔"

" تو انہوں نے اسے کیوں گرفتار کیا؟"

" پولیس کی تفتیش کے ڈھنگ نرالے ہیں۔ سب انسپکٹر صاحب نے پہلے تو براؤن کے کمرے کا سرسری معائنہ کیا۔ اس قدر سرسری کہ تم اب ان سے جا کر پوچھو تو انہیں اس کمرے کی شاید ایک چیز بھی یاد نہ ہوگی۔ پھر ولیم سے پوچھا کہ کل رات یہاں کون کون آدمی فالتو آئے تھے۔

وہ صرف ایک فیروز خاں بیرہ تھا جو کل مری سے ولیم کے بھائی چارلس کے ہمراہ یہاں آیا تھا۔ چارلس تو کل شام پانچ بجے ولیم کے کمرے میں ایک چٹ چھوڑ گیا کہ میں مری واپس جا رہا ہوں میرا نوکر فیروز خاں رات یہیں رہے گا۔ فیروز خاں اپنے آقا کی مرضی کے مطابق رات باندہ گلی ہوٹل میں رہا اور آج صبح گرفتار کر لیا گیا۔

" چارلس یہاں کیا کرنے آیا تھا؟ اس کی بھائی کے ساتھ ناچاقی سی ہے"

" ناچاقی سی تھی۔ جان ولیم شریف خصلت انسان ہے۔ چارلس مغرور اور عیاش ہے۔ مگر آخر جان کا بھائی ہے۔ جان کو اس پر ترس آیا اور ان میں پھر رابطہ محبت قائم ہو گیا۔ چارلس نے مری میں ایک ہوٹل کھولا ہوا ہے۔ کل یہاں سیر کے لئے آیا تھا۔"

یہاں میں یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مری باندہ گلی سے پندرہ میل کے فاصلے پہ ہے اور گھوڑے پر تین گھنٹے کا راستہ۔

یہ باتیں ہم ہوٹل کے ٹینس کے چمن میں کھڑے ہوئے کر رہے تھے۔ یہاں سے ہم مینجر کے کمرے کی طرف گئے۔ جان ولیم نے ولیٹن صاحب کو دیکھا تو بیم ورجا کے لہجے میں پوچھا۔

" آپ کسی نتیجے پر پہنچے ہیں؟"

" ابھی تو نہیں۔ مگر بہت جلد پہنچنے والا ہوں .... ہم چائے ڈاک بنگلے میں پئیں گے۔"

میں نے اپنا باران کوٹ مینجر کے کمرے سے اٹھایا اور ہم نے ڈاک بنگلے کی پہاڑی پر چڑھنا شروع کر دیا۔ میں نے اپنی کلائی کی گھڑی کو دیکھا تو چار بجنے میں سات منٹ تھے۔

ولیٹن صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ آج شام کو کھانا شاید نصیب نہ ہو۔ چائے کے

ساتھ ہی جو کچھ کھانا ہو کھالو مجھے دوست یوں بھی دستر خوان کا غاصب سمجھتے ہیں اور رات کو کھانا نہ ملنے کے ڈر سے تو خدا جانے میں نے کس قدر کھایا۔ جیب میں رات کی فاقہ کشی کا خاطر خواہ انتظام کر چکا تو میں نے ٹانگیں پھیلا کر سامنے کی خالی کرسی پر رکھ دیں۔ ویلنٹن صاحب میرے پاس برآمدے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہل رہے تھے۔ مجھے پیٹ کی فکر سے فراغت پاتے دیکھا تو میرے سامنے آکھڑے ہوئے۔

میں اکثر ان کے موزوں قد اور اعضا کے تناسب کو دیکھ کر رشک کے مارے جلا کرتا تھا۔

لیکن اس وقت سواری کے لباس میں وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت معلوم ہوتے تھے انہوں نے برجس کی جیب میں سے پستول نکال کر اسے کھولا اور میری طرف ہاتھ بڑھا کر کارتوس مانگے۔ میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ میں چھ فالتو کارتوس بھی ساتھ لایا ہوں۔ اب جو انہوں نے مجھ سے ان کا ذکر کیا تو مجھے نوٹ پیپر بھی یاد آئے۔ میں کہنے کو تھا کہ وہ نوٹ پیپر بھی میرے پاس ہیں مگر کسی خیال سے چپ رہا اور جیب سے کارتوس نکال کر ان کے ہاتھ میں رکھ دیئے انہوں نے ایک ایک کر کے سب کو پستول میں بھر دیا۔ پستول بند کر کے پھر جیب میں ڈال لیا اور مسکرا کر کہنے لگے :۔

"میرے کارتوس ختم ہو گئے تھے۔ اس لئے میں نے تمہیں لانے کو کہا تھا۔ میں تمہارا چھ کارتوسوں کا قرضدار رہوں۔"

ان کا یہ بظاہر تکلف فی الحقیقت عین بے تکلفی تھا۔ لیکن مجھے کچھ عجیب گھبراہٹ سی ہوئی۔ میں اس کے جواب میں خدا جانے کیا کہتا۔ لیکن انہوں نے مجھے اس کی فرصت نہ دی اور دفعتاً پوچھا :۔

"تو تمہاری براؤن کے متعلق کیا رائے ہے ؟"

"میں تو سب سے پہلے سیٹھ فیروز جی کے بل کا معما حل کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے۔ میں سیٹھ کے پاس جا کر کسی ڈھنگ سے پوچھ آؤں کہ یہ پانامہ کا ڈبہ اور ایک چھوٹا وسکی کس نے

خریدا تھا۔"

"بہت خوب۔ بہت خوب۔ تم اب روز بروز عقلمند ہوتے جاتے ہو اور چونکہ معلوم ہوتا ہے تمہیں تفتیش جرائم میں خاص ملکہ حاصل ہے اس لئے ساتھ ہی تحصیل سے یہ بھی پوچھتے آنا کہ چارلس نے کل شام کے پانچ بجے مری جانے کے لئے گھوڑا کرایہ پر لیا تھا ؟"

مجھے پھر کچھ گھبراہٹ سی ہوئی۔ لیکن پھر کچھ جواب بن نہ پڑا۔ کھسیانا ہو کر میں ڈاک بنگلہ سے باہر نکل آیا۔

پانچ منٹ کے بعد میں دور ہی سے مسکراتا ہوا ڈاک بنگلے کے برآمدے میں داخل ہوا۔ ویلنٹن صاحب ٹہلتے ٹہلتے رُک گئے اور ایک منتظر انہ انداز میں کھڑے ہو گئے۔

میں نے نہایت بے تکلفی سے کہا۔ "کل مورخہ ۳ اگست کو شام کے پانچ بجے چارلس ولیم صاحب مری ہوٹل کے مالک اور مینجر نے سیٹھ فیروز جی اینڈ برادرس کی دکان سے ایک ڈبہ پانامہ سگار کا خریدا اور ایک پیگ وسکی کا پیا۔ تحصیل سے کل صبح کے سات بجے سے لے کر شام کے آٹھ بجے تک انہوں نے کوئی گھوڑا کرائے پر نہیں لیا۔ پہلی بات مجھے سیٹھ فیروز جی کی زبانی اور دوسری بات گھوڑوں کے ٹھیکیدار کی زبانی معلوم ہوئی۔ مگر اس ڈھنگ سے کہ انہیں شاید محسوس بھی نہیں ہوا کہ ان سے یہ باتیں کوئی پوچھ گیا ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے اپنے ہاتھ پہلوؤں پر رکھ لئے اور نہایت بے پروائی سے دو تین قدم برآمدے کے پتھر کے فرش پر ٹہلا۔ پھر مڑ کر میں نے ویلنٹن صاحب سے کہا۔

"وہ سگاروں کے جلے ہوئے ٹکڑے جو آپ نے براؤن کے کمرے میں سے اٹھائے تھے۔ وہ تو ذرا دکھائیے۔"

انہوں نے فوراً میرے "ارشاد" کی تعمیل کی۔ میں نے ایک ٹکڑا لے کر اسے کھولا پھر ان چھ پانامہ سگاروں میں سے جو میں سیٹھ کی دکان پر سے خرید کر لایا تھا۔ ایک سگار لے کر اس کے تمباکو کے پتے کو کھولا اور دونوں کا مقابلہ کیا۔ مربیانہ لہجے میں ویلنٹن صاحب سے کہا۔

"آپ کا قیاس ٹھیک تھا۔ یہ جلے ہوئے سگار بے شک پانامہ سگار ہیں"۔

انہوں نے جھک کر کہا "آپ کی عین نوازش"۔

"تو اب ہم مری چلیں گے نا؟"

"جس طرح حضور حکم کریں"۔

میں بے اختیار کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ وہ بھی مسکرا دیئے۔ وہ پانامہ سگار سلگا کر ہم ڈاک بنگلہ سے تحصیل کی طرف آئے۔ دو گھوڑے لئے۔ اپنے باران کوٹ وہاں باندھے جہاں سنگینیں نے ہرن کے بچے کو باندھا تھا اور اپنے پستولوں کو جیبوں میں ٹٹول کر گھوڑوں پر سوار ہو کر مری کی طرف روانہ ہو گئے۔

باندہ گلی سے آدھ میل نکل کر ہم نے گھوڑوں کو دلکی پر چھوڑ دیا۔ چپ چاپ جنگلوں کی مہیب عظمت، چیڑ، تر، کھنڈ اور بن کھوڑ کے اونچے اونچے درخت ایک طرف پہاڑوں کی پُر شکوہ بلندی، دوسری طرف کھڈ کی پُراسرار گہرائیاں تنگ پیچیدہ سڑک، اس پر گھوڑوں کے ٹاپوں کی مسلسل آواز، آبشاروں کا شور، کوکوں کی دردناک کوکو میں تو بے خود ہو گیا۔ درختوں کے بیچ میں سے غروب آفتاب کے ہر لحہ بدلتے ہوئے نظارے کبھی چھپ کر کبھی ظاہر ہو کر مجھے بے قرار کر رہے تھے۔ آبشاروں کا سفید پانی بڑے بڑے پتھروں پر گر کر تحت الثریٰ میں موتی پھینک رہا تھا۔ میرا دل بار بار کھڈ میں کود پڑنے کو چاہا۔

میرے کانوں نے ایک غیر مانوس آواز سے رنجیدہ ہو کر مجھے چونکا دیا۔ ویلٹن نے جو مجھ سے دس گز آگے جا رہے تھے، اپنا گھوڑا روک لیا تھا اور گھوڑے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھے مڑ کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے قریب جا کر ٹھہر گیا۔ وہ بولے:۔

"مری بائیسکوپ کا تماشا کس وقت شروع ہوتا ہے؟"

"شاید پونے آٹھ بجے"۔

"اور اب ساڑھے چھ بجے ہیں اور مری یہاں سے پانچ میل ہے تو گویا ہم بائیسکوپ کا تماشا دیکھ سکتے ہیں۔ اب ذرا ہلکے ہلکے نہ چلیں؟"

"میں خود یہی کہنے والا تھا"

ہم نے گھوڑوں کو قدم قدم سے جانا شروع کیا۔ کچھ دیر تو ہم خاموشی سے ایک دوسرے کے ساتھ چلتے رہے۔ پھر ایک دم ویلٹن صاحب نے قمار بازی کی اقتصادی، روحانی و اخلاقی قباحتوں پر ایک پُر زور لیکچر دینا شروع کر دیا اس شد و مد سے کہ میں سمجھا اس فعل مذموم کے اختراع کا مجرم وہ مجھے سمجھتے ہیں۔ دس منٹ تک لگاتار وہ اس موضوع پر ایک پُر مغز تقریر کرتے رہے۔ میں خاموشی سے سنتا رہا۔ پھر انہوں نے دفعتہً باگیں کھینچ کر گھوڑے کو ٹھہرا لیا اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگے:۔

"اور مجھے شرم کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ قبیح عادت اہل فرنگ میں کثرت سے ہے۔ وہ لوگ جو مہذب گھرانوں کی اولاد اور سوسائٹی کے معزز افراد شمار ہوتے ہیں، بلا تکلف شام کو کھانے کے بعد اپنی بیٹیوں، بہنوں اور بھابیوں کے ساتھ جوا کھیلتے ہیں۔ شاید ہی کوئی ہم صحبت دوست ایسے ہوں جو شام کو کلب میں تاش کھیلے بغیر رہ سکیں اور سارے کلب میں تاش کی ایک بازی ایسی نہیں ہوتی جس کی ہار جیت کے ساتھ روپے کی ہار جیت وابستہ نہ ہو اور اس کو یہ لوگ شغل سمجھتے ہیں۔ اس کو روحانی انبساط کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ ساتھ ہی پھر یہ دعویٰ ہے کہ تہذیب جدید بنی نوع انسان کی ترقی کا باعث ہوئی ہے۔ غلط اور سراسر غلط کہتے ہیں۔ تہذیب جدید نے کئی نئی خرابیاں ایجاد کی ہیں۔ مردہ عیوب کو از سر نو زندہ کیا ہے اور کئی پرانی قباحتوں کو پہلے سے زیادہ ہر دلعزیز کر دیا ہے"۔

میں حیران تھا کہ اس شخص نے اپنا دماغ کس قدر قابو میں رکھا ہے۔ مجھے ہرگز اس بات کی توقع نہ ہو سکتی تھی کہ چار گھنٹے براؤن کی موت پر دقیق غور و خوض کرنے کے بعد وہ یکایک اس طرح لاتعلق باتیں کرنے لگ جائیں گے۔ جیسے وہ اس سے محض بے خبر ہوں اور پھر

اس وقت جب کہ کم از کم میرا دماغ خیالات کے عدم اظہار کی وجہ سے پیش از بیش اسی سوچ میں مصروف تھا۔ ویلیٹن صاحب میں مَیں نے بڑی خاصیت دیکھی ہے۔ کہ وہ یک لخت اپنے خیالات کو بغیر کسی تکلیف کے ایک طرف سے دوسری طرف منتقل کر سکتے ہیں۔ وزیر اعظم انگلستان کے کیرکٹر پر بحث کو ختم کئے ابھی دو منٹ نہیں گزرتے کہ وہ چین کی ریشم کی تجارت کے متعلق باتیں کرنے لگ جاتے ہیں۔ ہزار آدمیوں کے ساتھ نہایت انہماک سے متواتر تین گھنٹے تک وہ اصلاحات ہند پر ملک کے ایک مشہور اسپیکر کی دھواں دھار تقریر سنتے رہتے ہیں۔ اور لکچر ہال سے باہر نکلتے ہی ہسپانیہ کی آب و ہوا کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

ارد گرد عظیم الشان پہاڑ اور اونچے اونچے درخت اس شاندار انسان کو دیکھ کر خاموش تھے۔

ویلیٹن صاحب ان سے بالکل غافل، چپ چاپ گھوڑے پر چلے جا رہے تھے۔

مری بائیسکوپ سے ہم دس بجے نکلے۔ ویلیٹن صاحب برجس کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سگرٹ کے پیہم کش لگا رہے تھے۔ میں نے معمول کے مطابق اپنی گھڑی کو کوک کرنا شروع کیا۔

ویلیٹن صاحب بولے :۔

"یہ بھی گھڑی کو کنے کا وقت ہے؟"

"میں سونے سے پہلے گھڑی کو کوک دیا کرتا ہوں۔ دن کے وقت اور کاموں کی وجہ سے یہ کام بھول جاتا ہوں۔ اب خدا کرے خواجہ محمد حسین وہاں میرے ٹائم پیس کو کوک رکھیں :"

"تو تم ٹائم پیس اور کلائی کی گھڑی کو ایک ہی وقت کوک دیتے ہو؟"

"اُس میں کیا حرج ہے، بلکہ یہ تو اچھی بات ہے۔"

"میرا بھی یہی قاعدہ ہے اور ــــ شاید... ہر ایک... عقلمند......

اگر میرے حواس نے مجھے دھوکا نہیں دیا تو میرا خیال ہے کہ ویلیٹن صاحب نے اتنا کہہ کر اگلا قدم ذرا آہستہ اٹھایا اور ایک لمحے کے لئے ان کے رویے میں نمایاں تبدیلی ظاہر ہوئی۔ لیکن پھر وہ پہلے کی طرف لاابالیانہ طریقے میں چلنے لگے۔ آدھ منٹ کے بعد ایک معمولی فقرے کی صورت میں انہوں نے مجھ پر ایک بم گرا دیا۔

"اگر تم ٹائم پیس اور کلائی کی گھڑی کو ایک ہی وقت کوک دیتے ہو۔ تو براؤن کل شام کے چار بج کر ۵۲ منٹ پر مرا ہے۔"

مجھے ہرگز یقین نہ آیا کہ میں نے ٹھیک سنا ہے۔ چونک کے میں نے پوچھا :۔

"کیا کہا آپ نے ؟"

"میں نے کہا ہے کہ اگر تم دونوں گھڑیوں کو ایک ہی وقت کوک دیا کرتے ہو تو براؤن کل شام کے چار بجکر ۵۲ منٹ پر مرا ہے اور چونکہ چار بجکر ۵۲ منٹ پر وہ یقیناً ہوٹل سے باہر تھا۔ اس لئے اس کی موت اس کے کمرے میں نہیں بلکہ باہر کہیں واقع ہوئی ہے۔ اس کے بعد اعلیٰ بارات کے وقت اس کی لاش اٹھا کر اس کے کمرے میں لائی گئی۔ وہاں اس کا کوٹ اتار کر اسے ڈریسنگ گون پہنایا گیا اور بستر پر لٹا دیا گیا۔ اور پھر اس کی خوابگاہ کی چیزوں کو درہم برہم کر دیا گیا۔

میں تحیر، استعجاب، استفہام اور اسی طرح کی بیس تیس چیزوں کا معجون مرکب' ان کے چہرے کی طرف منہ کھولے باولا کرنے والی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ ویلیٹن صاحب بالکل پاگل ہو گئے ہیں۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے، سگرٹ کو منہ سے نکال کر ہوا کی تاریکی میں کہیں اچھال دیا اور بولے :۔

"جب میں نے براؤن کے کوٹ کی تلاشی لی تو اس میں سیٹھ فیروز جی کے بل اور ہوٹل کے علاوہ مجھے براؤن کی جیبی گھڑی بھی ملی تھی۔ جو مجھے یاد ہے کہ چار بجکر ۵۲ منٹ پر ٹھہری ہوئی تھی۔ میں نے کوتاہ بینی سے یہ خیال کیا کہ گھڑی اس لئے ٹھہر گئی کہ اسے کوکنے والا مر

گیا ہے مجھے اس وقت یہ نہ سوجھا کہ گھڑی کی چابی پھیر کر دیکھ لیتا) براؤن کی نشست گاہ میں میز پر اس کا ٹائم پیس بھی ٹھہرا ہوا تھا اور اس کے ٹھہر جانے کی وجہ بھی میں نے یہ خیال کیا۔ لیکن اب مجھے یاد آیا ہے کہ ٹائم پیس کی سوئیاں پونے دس بجے پر ساکن تھیں۔ ٹائم پیس کے ساتھ تو کسی غیر معمولی واقعہ کے پیش آنے کا گمان نہیں ہو سکتا۔ اس لئے وہ تو اسی وقت ٹھہرا ہے جس وقت اس کی کوک ختم ہو گئی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ براؤن اپنے ٹائم پیس کو ـــــ اور اگر دونوں گھڑیوں کو ایک ہی وقت کوک دینا احسن ہے تو دونوں گھڑیوں کو قریباً نو بجے (اغلباً رات کے نو بجے) کو کام کرتا تھا۔ جیبی گھڑی جو چار بجکر ۲۵ منٹ پر ٹھہری ہے تو اس کا ٹھہر جانا اس جسمانی کشمکش کا ایک نتیجہ ہے جو براؤن کو موت کے وقت اپنے قاتل کے ساتھ یقیناً کرنی پڑی۔ اگر تم اور میں جو شاید بہت باقاعدہ زندگی بسر کرنے کا دعوے نہیں کر سکتے۔ اپنی دونوں گھڑیوں کو ایک ہی وقت کوک دیتے ہیں تو براؤن جس کی زندگی کی ہر ایک حرکت پنی تلی اور ہر ایک عادت باقاعدہ اور مقرر کردہ تھی۔ کیا یہ اغلب بلکہ یقینی نہیں کہ وہ اپنی دونوں گھڑیوں کو ایک ہی وقت کوک دیا کرتا تھا؟"

جوں جوں وہ یہ کہتے گئے براؤن کی موت کی ہر ایک تفصیل مجھ پر آشکارا ہوتی گئی ایک دو باتوں کے متعلق پھر بھی میرے دل میں الجھن باقی رہی۔ وہی ولیمز صاحب کے دماغ میں بھی پھر رہی تھیں۔ وہ کہنے لگے:۔

"سیٹھ فیروز جی کا بل اور دو یا نامہ سگاروں کے جلے ہوئے باقی ماندہ ٹکڑے صاف بتا رہے ہیں کہ چارلس ولیم نہ صرف براؤن کے کمرے میں داخل ہوا ہے بلکہ وہاں کم از کم تین چار گھنٹے ٹھہرا ہے (دو سگاروں کے پینے کے لئے کچھ وقت چاہیئے) سو یہ تو تم بغیر خوف و تردید فرض کر لو کہ براؤن کی نعش کو باہر سے اٹھا کر لانے والا چارلس ولیم ہی تھا۔ اور براؤن کی تبدیلی لباس اور خواب گاہ کی بدنظمی کا ذمہ دار بھی وہی ہے۔ اب صرف دو چار حل طلب باتیں باقی ہیں:۔

اول: یہ کہ کیا چارلس ولیم صرف براؤن کی نعش کو باہر سے اٹھا کر کمرے میں لایا۔ یا کہ قتل بھی اسی نے کیا ہے؟

دوم: یہ کہ اگر اس نے قتل نہیں کیا، تو قاتل کون ہے؟

سوم: یہ کہ اس نے دیکھنے والوں کے دلوں میں یہ غلط خیال ڈالنے کی کوشش کیوں کی کہ یہ قتل براؤن کے کمرے میں ہوا ہے؟

چہارم: یہ کہ سیٹھ فیروز جی کی دکان کا بل براؤن کی جیب میں کیسے چلا آیا؟

براؤن مارا کہاں گیا ہوگا؟ اغلباً ادھر ادھر کہیں جنگلوں میں؟"

"شاید۔ لیکن جہاں کہیں بھی وہ مارا گیا ہو وہاں اس کی موت کی ایک یادگار باقی ہے۔ بشرطیکہ جنگلی جانوروں نے اسے وہاں رہنے دیا ہو۔"

"وہ کیا؟"

"اس کی شام کے وقت پہننے کی ٹوپی"

اس حیرت انگیز انکشاف نے مجھے اس قدر متحیر کر دیا کہ میں گرد و نواح کی سب چیزیں بھول گیا۔ ولیمز صاحب جدھر جدھر مڑتے تھے میں بھی ان کے ساتھ ساتھ چلتا جاتا تھا۔ آخر کار وہ ایک ہوٹل کے سامنے جا ٹھہرے اور کہنے لگے:۔

"یہ چارلس ولیم صاحب کا ہوٹل ہے۔ میرے خیال میں ان کی ملاقات ہمارے لئے فخر اور مسرت کا باعث ہوگی۔"

اس وقت شاید ساڑھے دس بجے ہوں گے۔ سڑک کے لیمپوں کی روشنی رات کی محیط تاریکی کے ساتھ ایک ناکامیاب سا خاموش مقابلہ کر رہی تھی۔ ہوٹل کے کمروں کے باہر کہیں کہیں کوئی نوکر پھرتا ہوا نظر آتا تھا۔ ہم ہوٹل کی سیڑھیوں پر چڑھنے کے بعد ہوٹل کی ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ دفتر کا دروازہ کھلا تھا اور میز کے سامنے دو بابو بیٹھے حساب

کر رہے تھے۔ ہم نے ان سے منیجر کا پتہ پوچھا تو معلوم ہوا منیجر صاحب ساتھ کے کمرے میں ہیں۔ منیجر کے کمرے کا دروازہ کھول کر ہم اندر گئے۔ چارلس ولیم ایک آرام کرسی پر بیٹھا نہایت اطمینان سے سگار پی رہا تھا۔ اور سامنے ایک چھوٹی سی میز پر ایک خوش نما کنسٹر اور ایک گلاس اس کی عیش پرست طبیعت کی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے پڑے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی چارلس اُٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اس کی شکل اچھی طرح یاد ہے۔ اس کے خط و خال صاف بتا رہے تھے کہ وہ جان ولیم کا بھائی ہے۔ لیکن اس کے تبسّم اور جان ولیم کے تبسم میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ جان ولیم جب مسکراتا تھا۔ اس کے چہرے سے صاف گوئی اور نیک نیتی ٹپکتی تھی۔ برخلاف اس کے چارلس کی مسکراہٹ میں انقباض اور جبر کے عنصر غالب تھے جو اس کے تبسّم کو مصنوعی اور ناقابل اعتبار بنا دیتے تھے۔

وہ رسمی لہجے میں کہنے لگا۔

"صاحبان! میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

ولیٹن صاحب نے نہایت بے پروائی سے کہا:۔

"ہم یہاں صرف رات گزارنا چاہتے ہیں۔ اگر تم ہمیں دو سونے کے کمرے دے سکو تو تمہاری بہت مہربانی ہوگی۔"

"بہت خوشی سے" یہ کہہ کر چارلس نے ایک نوکر کو بلا کر کہا "ان کو نمبر ۲۲ نمبر ۲۳ میں لے جاؤ" پھر ہم سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:۔

"آپ کو کھانا تو نہیں چاہیئے؟"

ولیٹن صاحب بولے:

"نہیں صرف کافی کے دو پیالے بھیج دو۔"

ہم دونوں نمبر ۲۲ میں بیٹھے تھے کہ نوکر ایک طشتری میں کافی کے دو پیالے لایا۔ ولیٹن صاحب نے اس سے کہا:

"منیجر کو یہاں بھیج دو" یہ کہہ کر ہم دونوں کافی پینے لگے۔ میں نے پوچھا:۔

"آپ نے منیجر کو کیوں بلایا ہے؟"

خدا جانے مجھے خاطر خواہ جواب ملتا یا نہ کہ اتنے میں دروازہ کھلا۔ چارلس ولیم اندر داخل ہوا۔ اور ہمارے سامنے آ کر ایک خالی کرسی پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

ولیٹن صاحب نے مُسکرا کر کہا:۔

"مسٹر چارلس ولیم! میں تمہارے ہوٹل کی کافی کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کم از کم بانڈہ گلی ہوٹل میں اور بھی بہت سی قباحتیں ہیں۔ وہاں کا انتظام کئی پہلوؤں سے ناقص ہے۔ کل ہی وہاں ایک آدمی کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ لیکن میں تو ہوٹل کی بدانتظامی کی نسبت قاتل کی شرافت سے زیادہ متاثر ہوا ہوں کہ ایک تو وہ قتل کرنے کی تکلیف اُٹھائے پھر نعش کو اپنے کندھے پر ڈال کر محفوظ جگہ میں لا کر رکھے۔ پھر اس خیال سے کہ نعش کو رات بھر سردی نہ لگے۔ اسے ڈریسنگ گون پہنائے اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ سیٹھ فیروز جی کی دکان کا ایک بل مقتول کی جیب میں چھوڑ جائے۔ تاکہ اس کا پتہ لگانے میں کوئی وقت نہ ہو۔ مسٹر چارلس ولیم! مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کی کافی کے علاوہ آپ کی شرافت کی داد دوں۔"

میرے کان ولیٹن صاحب کی باتوں پر اور میری نگاہ چارلس کے چہرے پر تھی۔ چارلس کا چہرہ اس طنز آمیز اور پُر حقارت تقریر سے تمتما اُٹھا اس نے اپنے ماتھے پر ایک پیچ در پیچ تیوری ڈال لی۔ منہ کو زور سے بند کر کے کرسی کو اپنے ہاتھوں سے مضبوط پکڑ لیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ولیٹن صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔

میں نے ایک لمحے کے لئے بھی اپنی نگاہ چارلس کے چہرے سے نہ ہٹائی غصے کے آثار دیکھ کر میں نے جلدی سے پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔

ولیٹن صاحب نے نہایت بے پروائی سے کافی کے پیالے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

دفعتہً چارلس نے کرسی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور اگر میں ایک لمحہ بھی توقف کرتا تو کرسی پورے زور میں ولیٹن صاحب کے سر پر آ پڑتی۔

چارلس نے میرے پستول کی سیاہ نالی کو اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیکھا اور بہتر یہی سمجھا کہ اپنے ارادے کو کم از کم ملتوی کر دے۔

ولیٹن صاحب کی آواز میرے کان میں پڑی:۔

"امجد چارلس صاحب کو اسی طرح رکھنا۔ میں ذرا کافی پی لوں" ولیٹن صاحب باقی کی کافی پی کر کرسی پر سے اٹھے اور دروازے کی طرف گئے۔ دروازے کے تالے میں چابی پڑی تھی۔ اسے پھرا کر تالا بند کر دیا اور چابی نکال کر جیب میں ڈال لی۔

دروازہ بند کر کے وہ ہماری طرف واپس آئے اور میرے پستول کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے:۔

"اسے جیب میں ڈال لو۔ میں چارلس صاحب سے لڑنے تو نہیں آیا۔"

چارلس کی طرف مخاطب ہو کر بولے:۔

"مسٹر چارلس ولیم! ہم نہ تو پولیس کے بھیجے ہوئے آدمی ہیں۔ نہ پولیس کو اطلاع دے کر یہاں آئے ہیں۔ نہ اب تک ہمارا ارادہ پولیس کو اطلاع دینے کا ہے (تم اس کرسی پر بیٹھ جاؤ) تم قدرتی طور پر پوچھو گے کہ میرا اس قتل سے کیا تعلق ہے؟ میرا تعلق صرف اس قدر ہے کہ جان ولیم باندہ گلی ہوٹل کا مالک۔ تمہارا بڑا بھائی میرا دوست ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اس کو اس سے پہلے زندگی میں کتنے صدمے اٹھانے پڑے ہیں کس قدر مصیبتوں کا مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ تمہاری طرف اور اپنے کاروبار کی طرف سے کس قدر تکالیف اور رنج برداشت کرنے پڑے ہیں۔ پہلے بریلی میں تم نے اپنی برائیوں کی وجہ سے اس کو اس بات پر مجبور کیا۔ کہ وہ تمہیں علیحدہ کر دے۔ اکیلا رہ جانے کی وجہ سے وہ اپنے نوکروں کی بددیانتی کا تختۂ مشق بن گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ متواتر دو سال تک وہ ہوٹل سے نقصان اٹھاتا رہا اور اسی وجہ سے

اس نے بریلی کا ہوٹل چھوڑ کر باندہ گلی میں اپنے سرمائے سے یہ ہوٹل جاری کیا۔ پھر اس کو معلوم ہوا کہ تم لکھنؤ میں شرمناک طرح پر زندگی گزار رہے ہو۔ وہ تمہارا بڑا بھائی تھا۔ اسے رنج ہوا۔ اس کا دل تمہاری ذلیل زندگی کو دیکھ کر کڑھتا تھا۔ وہ لکھنؤ جا کر تمہیں وہاں سے لے آیا اور اپنے پاس سے روپیہ دے کر مری میں تم سے یہ ہوٹل کھلوایا اور شکر کیا کہ بالآخر تم نے از سر نو شریفانہ رویہ اختیار کر لیا ہے اور اب اس قتل کی وجہ سے اس کے ہوٹل کی جو بدنامی ہوگی۔ اس کے ذمہ دار بھی تم ہو۔ اس کے علاوہ تمہارا نوکر فیروز خاں قتل کے الزام میں گرفتار ہے۔ گویا تم میں شرافت اور صداقت اس درجہ مر چکی ہے کہ تم ایک بے گناہ کو اپنے سامنے پھانسی پر چڑھتے دیکھ لو گے۔"

چارلس کا چہرہ اس تقریر کے زیر اثر بتدریج بدلتا گیا اور اس کے چہرے پر مختلف جذبات ظاہر ہوتے گئے۔ انتقام، غضب، استفہام، توجہ، نرم دلی، ندامت و افسوس سب باری باری اس کی آنکھوں میں سے جھانک جھانک کر چلے گئے۔ لیکن ولیٹن صاحب نے اپنی تقریر اس وقت ختم کی جب انہیں چارلس کے ماتھے پر اور اس کے کندھوں کے پیچھے ہلنے میں ہمت اور مردانگی کے آثار نظر آئے۔

چارلس نے کھڑے ہو کر کہا:۔

"فیروز خاں ہرگز پھانسی نہ پائے گا۔ آپ اطمینان رکھئے جو کچھ میں نے کیا، بہت برا کیا اور میں از حد شرم و ندامت کے ساتھ اس وقت اپنی ذلیل حرکت کا اعتراف کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے قتل نہیں کیا اور شاید میں کبھی قتل نہیں کر سکتا۔"

"اہا۔ تو میں نے اچھا کیا کہ میں تمہارے پاس آیا۔ اگر تم سارے حالات ہمیں سنا دو، تو میرے یہ دوست ساتھ ساتھ لکھتے جائیں گے۔"

ولیٹن صاحب نے میری طرف دیکھا میں نے جیب میں سے نوٹ پیپر ادھی جو میں

نتھیا گلی سے ساتھ لایا تھا، نکال کر پھیلائے اور ویلنٹن صاحب سے ان کا قلم لے کر جو جو چارلس کہتا رہا، لکھتا گیا۔

وہ تحریر تو اس وقت مجھے لفظ بہ لفظ یاد ہے اور نہ اس کا یہاں ہو بہو نقل کرنا ہی ضروری ہے۔ اس کا مطلب صرف اتنا تھا کہ چارلس جب جمعہ کے دن باندہ گلی گیا تو شام کو چائے پینے کے بعد براؤن کی طرح وہ بھی سیر کرنے نکلا۔ پہاڑیوں میں وہ ایک چھوٹی پگڈنڈی پہ جا رہا تھا کہ سامنے سے اس نے ایک انگریز کو آتے دیکھا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے اس انگریز کا پاؤں پھسلا اور وہ لڑھکتا لڑھکتا پگڈنڈی سے سات آٹھ گز نیچے جا پڑا۔ چارلس بھاگا بھاگا اس کے پاس گیا اور اسے زمین پر سے اُٹھایا۔ لیکن اس کا سر ایک بڑے پتھر کے ساتھ ٹکرانے کی وجہ سے اس کی کنپٹی کو ایک مہلک ضرب آئی تھی۔ اور وہ مر چکا تھا چارلس کو معلوم نہ تھا۔ کہ یہ کون ہے۔ اس کا نام ونشان معلوم کرنے کی غرض سے اس نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ ایک جیب میں سے باندہ گلی ہوٹل کا بل ملا جس سے چارلس کو معلوم ہوا کہ اس انگریز کا نام ٹی براؤن ہے اور یہ باندہ گلی کے ۱۲ نمبر کمرے میں رہتا ہے پہلے تو اسے خیال ہوا کہ باندہ گلی میں جا کر اس کی موت کی اطلاع دے۔ لیکن کچھ دیر سوچنے کے بعد اس کے دل میں ایک بڑا ذلیل خیال آیا اور اس نے اپنا پہلا ارادہ ترک کر دیا۔ باندہ گلی آکر اس نے پانامہ سگاروں کا ایک ڈبہ خریدا اور وسکی کا ایک پیگ پیا۔ اور پھر ہوٹل میں آکر بھائی کے نام چٹ چھوڑ گیا کہ میں مری واپس جا رہا ہوں۔ لیکن خود اِدھر اُدھر پہاڑیوں میں رات کی تاریکی کا انتظار کرتا رہا قریباً گیارہ بجے براؤن کی نعش کو اُٹھا کر وہ ہوٹل کی طرف لایا اور موقع پا کر نعش سمیت براؤن کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں براؤن کا کوٹ اتار کر اسے ڈریسنگ گون پہنایا اور خواب گاہ کی چیزیں الٹ پلٹ کر دیں۔ تاکہ معلوم ہو قتل اسی کمرے میں ہوا ہے اور یہ سب باتیں اس نے بھائی سے حسد کے مارے کیں۔ اس کا مدعا باندہ گلی ہوٹل کو بدنام کرنے کا تھا۔ پھر وہ رات بھر براؤن کے کمرے میں رہا۔ جہاں وہ سویا بالکل نہیں اور صبح پو پھٹتے ہی بیشتر

اس کے کہ باندہ گلی کا کوئی آدمی جاگے وہ پیدل ہی مری کو چل دیا۔

میں اس کا سارا بیان لکھ چکا تو ویلنٹن صاحب نے کاغذ مجھ سے لے کر چارلس کے آگے رکھ دیئے اور کہا ”ان پر دستخط کر دو۔“ کچھ دیر تو چارلس ساکن رہا۔ پھر قلم اٹھا کر دستخط کر دیئے اس کے بعد ہوٹل کے دفتر سے ایک بابو کو بلا کر اسے تحریر کا مطلب بتلائے بغیر اس کے دستخط بھی بطور گواہ کے کرائے گئے۔ پھر ویلنٹن صاحب نے ان کاغذوں کو لفافے میں بند کر کے لفافے کے اوپر مجھ سے پتہ لکھوایا:۔

سب انسپکٹر پولیس۔ باندہ گلی

معرفت سپرنٹنڈنٹ پولیس۔ ضلع ہزارہ۔ ایبٹ آباد

لفافے کو ہاتھ میں لے کر چارلس سے کہا:۔

اس لفافے کو میں ابھی ڈاک میں ڈال دوں گا۔ یہاں سے ایبٹ آباد اور ایبٹ آباد سے باندہ گلی یہ تین دن میں پہنچے گا۔ تب تک تم اگر چاہو تو کہیں سے کہیں پہنچ سکتے ہو۔ میں تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کرنا چاہتا۔ تمہاری یہ تحریر فیروز خاں کی رہائی کے لئے کافی ہوگی۔

دوسرے دن صبح ہم باندہ گلی پہنچے۔ گیارہ بجے کے قریب ہوٹل کے ۳۵ نمبر کمرے میں، میں اور ویلنٹن صاحب آرام کرسیوں پہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ویلنٹن صاحب اخبار کا تازہ پرچہ دیکھ رہے تھے۔ میں سامنے بیٹھا خاموشی سے سگریٹ پی رہا تھا اور دل میں کل کے واقعات کو ایک ایک کر کے دہرا رہا تھا

”ویلنٹن صاحب نے اخبار کو سامنے سے ہٹایا۔ تو میں نے پوچھا:

”وہ سیٹھ فیروز جی کا بل براؤن کی جیب میں کس طرح آ گیا؟“

”سیٹھ فیروز جی کا بل؟ وہ تو معمولی بات ہے۔ جب چارلس نے براؤن کی جیب سے ہوٹل کا

بل نکالا تو اسے پڑھ کر پھر جیب میں ڈال لیا۔ اس جیب میں جہاں بعد میں اس نے فروز جی کا بل رکھا۔ مری جانے سے پہلے اس نے ہوٹل کا بل اپنی جیب سے نکال کر پھر براؤن کی جیب میں ڈال دیا اور غلطی کے ساتھ فروز جی کا بل بھی چلا گیا۔"

"اور ہاں۔ آپ نے خاص مجھے نوٹ پیپر لانے کو کیوں کہا تھا؟"

"میرے اپنے پاس تو وہی نوٹ پیپر ہیں جن پر ہوٹل کا نام چھپا ہوا ہے وہ میں نے اس لئے استعمال نہ کئے سمجھے کہ کوئی اگر چاہتا تو ان کے ذریعے سے میرا پتہ لگا سکتا تھا اور میں نہیں چاہتا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس صاحب میری اس حقیر سی خدمت کے لئے مجھ ناچیز کے شکر گزار ہوں۔ بازار سے نئے نوٹ پیپر خریدنا قرینِ مصلحت نہ تھا۔ اس لئے میں نے تمہیں تکلیف دی۔"

"مگر وہ چارلس کا بیان تو نہ صرف میرے نوٹ پیپروں پر بلکہ میرے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اگر سپرنٹنڈنٹ پولیس صاحب آپ کی بجائے میرے شکر گزار ہوں تو میں کیا کروں؟"

جو جی میں آئے کرنا۔ لیکن خدا کے لئے میرا نام نہ لینا۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب پولیس یوں تو مجھے اچھی طرح جانتے ہیں لیکن مجھے یہ یقین نہ تھا کہ وہ میرے ہاتھ کی تحریر پہچان لیں گے۔ ایک ہفتے کے بعد ان کا ایک نیم سرکاری خط میرے نام آیا۔

ڈیر مسٹر امجد!

میرے پاس اس بات کے یقین کرنے کے لئے زبردست وجوہات ہیں کہ مسٹر جی براؤن ساکن باندہ گلی ہوٹل کی موت کے متعلق پولیس کو نا انصافی اور گمراہی سے بچانے میں آپ نے بہت ساحصہ لیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ پولیس کو اس مقدمے میں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ سب آپ ہی کی بدولت ہے۔ آپ مجھے اس بات کی اجازت دیں کہ میں تمام محکمہ کی طرف سے آپ کی بے غرضانہ مساعی کے لئے آپ کا شکریہ ادا کروں۔

مجھے یقین ہے کہ آپ کے طریقۂ تفتیش کی تفصیل خالی از دلچسپی نہ ہوگی۔ اگر آپ ہمیں اس سے آگاہی بخشیں تو سب حالات کو پولیس جنرل میں شائع کر دیا جائے۔ اُمید ہے آپ میری اس درخواست کو قبول فرما کر مجھے فخر بخشیں گے۔

آپ کا مخلص

"........"

میں نے اسی وقت اس کا جواب لکھ کر ڈاک میں ڈال دیا۔

جناب عالی۔

مسٹر براؤن کی موت کے متعلق میں نے سوائے چارلس ولیم کا بیان لکھنے کے اور کچھ نہیں کیا۔ یہ سب انکشافات مجھ سے ایک بدرجہا اعلیٰ دماغ کے غور و خوض کا نتیجہ ہیں۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ کہنے کا حق حاصل نہیں۔"

شاید سپرنٹنڈنٹ صاحب اسے کسرِ نفسی ہی سمجھیں مگر میں اور کیا لکھتا۔

"پطرس"

(کہکشاں۔ اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر ۱۹۱۹ء)

قدیم یونانی حکما اور اُن کے خیالات

(۱)

مصنفین فلسفے کی تاریخ کو عام طور پر حکما کے اُس گروہ سے شروع کرتے ہیں جو چھٹی صدی قبل مسیح میں ایشیائے کوچک کے کنارے یونانیوں کے بسائے ہوئے شہر میلاطیس میں آباد تھا۔

یہ حکما مسئلہ تغیر کے متعلق بہت کچھ سوچتے رہے وہ دیکھتے تھے کہ یہ دنیا عالم کون و فساد ہے اشیا بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ تعمیر کے ساتھ تخریب اور تخریب کے ساتھ تعمیر ہمیشہ کے لئے وابستہ ہے مگر باوجود اس کے کوئی چیز بھی عدم مطلق سے وجود میں نہیں آتی اور نہ وجود سے عدم مطلق ہی میں چلی جاتی ہے۔ دنیا کی کوئی چیز بالکل از سر نو شروع نہیں ہوتی اور نہ کبھی دائمی اختتام ہی پر پہنچتی ہے۔ ہر ایک چیز کے لا متناہی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ مگر آخر یہ تغیر کس چیز کا ہے وہ ایک چیز کیا ہے جو مختلف ہیئتوں میں آ کر مختلف اشیاء اور اجسام بن جاتی ہے؟ وہ کونسا ایک مادۂ بنیادی ہے جو متغیر ہو ہو کر مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے؟ یہ ایک معمہ تھا جس کو حل کرنے پر قدیم یونانی حکما نے اپنی کمر ہمت باندھی۔

سب سے پہلے تھیلس نے پانی کو کائنات کا مادۂ بنیادی قرار دیا۔ اس کے بعد این اکسی مینڈر آیا اور اس نے کہا کہ یہ مادہ بنیادی ایک غیر محدود مادہ ہے جس میں سے مختلف اجسام بنتے ہیں۔ این اکسی مینیز نے اس کو ابخرات سمجھا جو رقیق حالت میں حرارت پا کر آگ بن جاتے ہیں۔ یا منجمد حالت میں ٹھنڈے ہو کر پانی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

مسیح سے ۴۹۴ سال پہلے ایرانیوں نے حملہ آور ہو کر میلاطیس کو تاراج کر دیا اور حکما،

کے اس گروہ کا اپنے مرز و بوم میں ہی خاتمہ ہو گیا۔ مگر انہی ایام میں میلاطیس سے کچھ فاصلے پر شہر افیس میں ایک فلاسفر ہرقلاطیس نامی موجود تھا جو میلاطیس کے فلسفیوں کا جانشین سمجھا جاتا تھا۔ ہرقلاطیس کو دنیا کی سب باتیں قابل ماتم و افسوس معلوم ہوتی تھیں۔ اس لئے بعد میں وہ "حکیم باکی" کے نام سے مشہور ہو گیا جس طرح سے کہ دی مقراطیس کو لوگ "حکیم ضاحک" کے نام سے پکارتے تھے کیونکہ اس کے لئے زندگی کی سب باتیں ذریعہ فرحت و انبساط تھیں۔

ہرقلاطیس کے نزدیک کائنات کا مادہ بنیادی آگ ہے وہ تو یہ کہتا تھا کہ ہماری قوت فکر بھی اس ابدی آگ کا ایک حصہ ہے جس سے سرعت سے شعلہ متغیر ہوتا رہتا ہے۔ وہ کسی طرح بھی خیال کی سرعت سے کم نہیں۔ اور شعلے کا آخر الامر دھواں بن جانا خیال کی اس بے ترتیبی اور بے نظمی کو ظاہر کرتا ہے جو شراب کے نشے کی حالت میں واقع ہوتی ہے۔

مگر تاریخ فلسفہ میں ہرقلاطیس کی اہمیت اس وجہ سے نہیں کہ اُس نے بھی اور حکماء کی طرح کسی چیز کو کائنات کا مادۂ بنیادی قرار دیا۔ جس مسئلہ پر اُس نے بہت زور دیا ہے وہ خود مسئلہ تغیر ہے تمام دنیا ایک بہتی ہوئی ندی کی طرح ہے جو ہر وقت اپنے آب رواں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی رہتی ہے وہ کہتا تھا کہ ہم ایک ہی دریا میں دو دفعہ داخل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جس پانی میں ہم نے ایک دفعہ پاؤں ڈالا۔ دوسری دفعہ پاؤں ڈالتے وقت وہ کہیں کا کہیں بہ جاتا ہے۔ اس مسئلے کو مان لینے کے بعد فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارے تمام علوم بے سود ہیں؟ جب اشیاء کی حالت ہر لحظہ بدلتی رہتی ہے۔ تو جو بات ہم کسی چیز کے متعلق اس وقت بیان کرتے ہیں۔ وہ ہمارے منہ سے نکلتے ہی غلط ہو جاتی ہے کیونکہ وہ چیز بذاتِ خود اس وقت تک بدل کر کچھ اور ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہرقلاطیس کے بعض معتقدوں نے اسی لئے کلام کرنا ترک کر دیا تھا۔ اس کے بجائے وہ اشاروں سے باتیں کرتے تھے۔ کیونکہ جتنے وقت میں ایک جملہ تکمیل کو پہنچتا ہے اتنے وقت میں اُس جملے کا مقصود غلط ہو جاتا ہے۔ بعض معتقد تو یہاں تک کہتے تھے کہ ہرقلاطیس کا یہ کہنا کافی نہیں کہ ہم کسی دریا میں

دو دفعہ پاؤں نہیں ڈال سکتے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ہم کسی دریا میں ایک دفعہ بھی داخل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ایک لمحے کے لئے بھی کوئی دریا سکون کی حالت میں نہیں ہوتا اور ہمارے پاؤں ڈالتے ڈالتے وہ بظاہر ایک دریا ہر آن ایک نیا دریا بن کر ہمارے سامنے سے گزر جاتا ہے۔

ہرقلاطیس کے مسئلہ تغیر کے مندرجہ بالا نتائج کو قرطائیس نامی ایک فلاسفر سے منسوب کیا جاتا ہے۔ قرطائیس ہرقلاطیس سے سو سال بعد میں ہوا ہے اور افلاطون اپنے بچپن کے زمانے میں اسی قرطائیس کا شاگرد تھا۔ افلاطون کی پیدائش مسیح سے ۲۷۴ سال پیشتر ہوئی۔ اُس نے اوائل عمر میں جو کچھ اپنے استاد سے اس ہمہ گیر تغیر کے متعلق سُنا اُس نے اسے اس بات کی ترغیب دلائی کہ وہ ایسی چیز ڈھونڈے جو اس گردش سے بالاتر ہو۔ جو ازل میں جیسی تھی ابد تک ویسی ہی رہے اور جس کی نسبت اگر انسان کوئی واقفیت حاصل کرے تو وہ واقفیت اور وہ علم بھی ہمیشہ کے لئے درست اور کارآمد ہو۔ یہاں ہم کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ہرقلاطیس اور اُس کے پیرو مسئلہ تغیر کا اطلاق محض محسوسات پر کرتے تھے کیونکہ محسوسات کے علاوہ وہ اور کسی قسم کی حقیقت یا وجود کے قائل ہی نہ تھے اس لئے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ ان معنوں میں قائلین مادیات تھے جن معنوں میں کہ آج کل مادیات کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ انہوں نے محسوسات اور غیر محسوسات کے درمیان خط تفریق کبھی کھینچا ہی نہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ قوتِ خیال بھی اسی طرح جگہ گھیر سکتی ہے۔ جس طرح مادہ اور مادہ بھی اپنے اندر قوتِ خیال رکھتا ہے۔ افلاطون عرصے تک کسی غیر متغیر و غیر محسوس حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہا اور آخر میں اُس نے منزل پر پہنچنے کے لئے وہ راہ اختیار کی جو ایتھنز کے نامور حکیم سقراط نے اُس کو بتائی۔

دنیا میں بہت سی شاندار ہستیاں ایسی ہوئی ہیں جنھوں نے اخلاف کے لئے ورثے میں اپنی کوئی تحریر یا مکتوب یا تصنیف نہیں چھوڑی۔ اُن کا حال اُن کے ہمعصروں کی روایتوں سے ہی معلوم ہوتا ہے۔ سقراط بھی انہی ہستیوں میں سے ایک تھا۔ اُس کے حالات زیادہ تر یا

تو ارسطوفانیس نامی شاعر کے ایک ڈرامے سے ملتے ہیں جس میں سقراط کا مضحکہ اڑایا گیا ہے اور جب سقراط پچاس برس کی عمر کا تھا تو پہلی دفعہ وہ ڈراما اسٹیج پر کھیلا گیا اور اس کے کچھ حالات نامور جرنیل زینوفون کی اس تصنیف سے بھی کچھ ملتے ہیں۔ جو سقراط کی موت کے بعد لکھی گئی اور یا افلاطون کے مشہور و معروف "مکالمات" سے کچھ پتہ چلتا ہے۔ ارسطوفانیس۔ زینوفون اور سقراط کی طرح افلاطون بھی ایتھنز کا باشندہ تھا۔ جوانی کی عمر ہی میں وہ سقراط کا شاگرد ہو گیا۔ بعد میں جب اُس نے وہ "مکالمات" لکھے جن کے اندر ڈرامے کی شکل میں اسکے اپنے استاد سقراط اور سقراط کے معترضین کے مباحثے مندرج ہیں تو اُس نے سقراط کے ذاتی خیالات کے علاوہ وہ نتائج بھی اُسی کے نام کے ساتھ منسوب کر دیئے جن پر وہ سقراط کے بتائے ہوئے راستوں پر چل کر خود پہنچا تھا۔

ارسطوفانیس نے اپنے ڈرامے میں قدامت پسند اہلِ ایتھنز کا نمائندہ بن کر سقراط کے نئے نئے عقیدوں کی ہنسی اڑائی ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ نئے نئے خیالات اور یہ منطقی بحثیں مذہب اور اخلاق کے لئے از حد مضرت رساں ہیں، برخلاف اس کے زینوفون سقراط کو ایک کامل رہنما۔ روحانی مددگار، پرہیزگاری اور نفس کشی کا ایک سچا نمونہ اور اُن تمام لغو اور بیہودہ خیالات کا جو قوم کی اور گھرانوں کی اصلاح کا باعث نہیں ہو سکتے دشمن بیان کرتا ہے۔ افلاطون نے اپنے استاد کی جو تصویر کھینچی ہے اُس کے مطالعے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کن کن مختلف زاویہ ہائے خیال سے ایک ہی شخصیت کو اُن دو طریقوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس دماغی ترقی کے زمانے میں اس زبردست ہستی کے اندر ایک ایسی روحانی تڑپ تھی جو اُس کے ہم صحبتوں کے دلوں میں برقی رو کی طرح سرایت کر جاتی تھی۔ اس کی شکل و صورت اگرچہ حسین نہ تھی۔ لیکن اس میں وہ مقناطیسی کشش تھی۔ جو شکل و صورت کی محتاج نہیں۔ وہ ایتھنز کے نوجوانوں کے دلوں کو اس کی طرف کھینچ لے آتی تھی۔ جن کو اُس کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع حاصل ہوا۔ وہ جانتے تھے کہ سقراط کی گفتگو محض منطقی ڈھکوسلے ہیں۔ سقراط منطقی یا وہ گو نہ تھا۔ اس کے دل میں یہ خیال جاگزیں تھا کہ اُس کو الہام ہوتا ہے اور خدا نے اُس کو ہدایت بنی نوع انسان

کے اہم کام پر مقرر کیا ہے۔ یہ خیال اس کے دماغ کو ایک نئی قوت اور اس کی زبان کو ایک انوکھی بلاغت بخشتا تھا۔ اُس کی آزاد زندگی اُن تمام بندشوں سے رہا تھی جن کی وجہ سے ایک دنیادار پابہ زنجیر ہوتا ہے اُس کی روش میں غضب کی سادگی اور اس کی عادات میں اعلےٰ درجے کا ضبط تھا۔ ارسطوفانیس جو سقراط اور اس کے عقائد کو ایتھنز کے نوجوانوں کے لئے مخرب اخلاق سمجھتا تھا۔ اپنے ڈرامے میں سقراط کی زندگی کا وہ درخشاں پہلوئے حیات ہرگز نہیں بتا سکتا تھا۔ جس پہلوئے حیات نے افلاطون اور افلاطون کی طرح اور سینکڑوں کو سقراط کا گرویدہ کر رکھا تھا۔ ۳۹۹ قبل مسیح میں جب سقراط کی عمر ۷۰ سال سے کچھ زیادہ تھی۔ اہلِ حکومت نے اس پر دو الزام لگائے اول یہ کہ وہ نوجوانوں کے اخلاق کو خراب کر دینے کا باعث ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ اُس نے اپنے ملک کے دیوتاؤں کو ماننے سے انکار کیا ہے۔ حکم دیا گیا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے زہر کا پیالہ پی کر ہمیشہ کے لئے اپنی غیر مفید ہستی کو مٹا دے۔ سقراط اگرچہ چاہتا تو جیسا کہ قانون اُس کو اجازت دیتا تھا۔ اپنے جرم کے کچھ حصے کا اعتراف کر کے اپنی سزا میں تخفیف کر سکتا تھا۔ اگرچہ خود نادار تھا۔ مگر اُس کے پیروؤں میں سے اکثر ایسے متمول تھے۔ جو اُس کے لئے بڑے سے بڑا جرمانہ ادا کر سکتے تھے اور صرف یہی نہیں بلکہ اگر وہ چاہتا تو اُس کی ایک جنبشِ ابرو کی تعمیل میں اُس کے بے شمار دوست اُس کو قید سے نکال لے جاتے اور وہ اپنی باقی ماندہ عمر اپنے وطن سے باہر آرام و آسائش میں کاٹتا۔ مگر مرتے دم تک اس کو اپنی بے گناہی کا یقین رہا۔

قانون کی خلاف ورزی کو وہ گناہ سمجھتا تھا اور قید سے بھاگ جانے کا اس کے دل میں کبھی خیال تک بھی نہ آیا۔ جو الزام اُس پر لگائے گئے۔ ان میں سچائی صرف اتنی ہے کہ سقراط کا بعض ایسے گروہوں سے میل جول تھا جنھوں نے مذہب میں نئی نئی رسمیں اور بدعتیں پیدا کیں اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اس نے بذاتِ خود مذہب کی علانیہ مخالفت کی ہو۔ اگرچہ اُس کا کبھی کبھی الہام وغیرہ کے متعلق ذکر کرنا یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ اپنے زمانے کے عقیدوں

کا چنداں قائل نہ تھا۔ سقراط کی تعلیم کا نوجوانوں پر یہ اثر ہوا کہ ان میں راست روی اور ضبط نفس کا مادہ پیدا ہو گیا۔ مطلق العنان زندگی کی بد اخلاقیوں اور بدعنوانیوں سے کنارہ کش ہو کر وہ اپنے استاد کے نقش قدم پر چلنے لگے اور پاکیزگی اور نیکوکاری کو اپنی زندگی کا مقصد اعظم سمجھ کر اُسے ہمیشہ اپنے مدِنظر رکھنے لگے۔ تخریب اخلاق کا شبہ بعض اس وجہ سے پیدا ہوا کہ ایام جوانی میں سقراط کی دوستی چند ایسے اشخاص سے تھی جو بعد میں اپنی باغیانہ حرکتوں کے لئے بدنام ہو گئے۔ سقراط اپنی حکومت کی کمزوریوں سے پوری طرح آگاہ تھا۔ پھر بھی مرتے دم تک قانون کا پابند رہا۔ اُس کے مشہور شاگردوں میں سے افلاطون تو سپارٹا کی حکومت کو ایتھنز پر ترجیح دیتا تھا اور زینوفون ایتھنز کو چھوڑ کر سپارٹا کی فوج میں داخل ہو گیا۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ہرقلیطس کے عقیدۂ تغیر کی وجہ سے افلاطون کا دل مذبذب کی حالت میں تھا۔ وہ سوچتا تھا۔ کہ اگر ہر ایک چیز ہر لحظہ بدلتی رہتی ہے تو علم کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ اشیائے تغیر کی وجہ سے اُن کا علم بھی ہر لحظہ متغیر ہونا چاہیئے اور متغیر علم کا حاصل کرنا بے سود ہے۔ ان خیالات سے اُس کے دل میں کسی ایسی چیز کی جستجو پیدا ہوئی جس کی حالت ابدی ہو اور جس کا علم ہمیشہ کے لئے درست ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کس طرح سے وہ سقراط کے بتلائے ہوئے راستوں پر چل کر اس علم صحیح پر پہنچا۔

سقراط ایتھنز میں فرقہ سوفسطائی کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ اُن دنوں میں "سوفسطائی" محض دانا یا حکیم کے معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ دنیا سقراط کو "سوفسطائی" سمجھتی تھی۔ مگر سقراط کے پیرو اس کو ان لوگوں کا دشمن خیال کرتے تھے جن کو "سوفسطائی" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

یہ لوگ اپنی تعلیم سے اس بات کی اشاعت کرتے تھے کہ نیکی اور بدی میں تمیز قدرت کی مقرر کردہ اور ابدی نہیں ہے۔ اس تمیز کا انحصار محض رسم و رواج پر ہے جس فعل کو ایک حالت میں "نیکی" کہا جاتا ہے۔ وہی فعل بعض اور واقعات کے ماتحت "بدی" بن جاتا ہے جس پُرخطر زمانے میں ایسے بے ہودہ خیالات سے راست رو زندگیوں کے عقیدے متزلزل

ہونے کو تھے اور اخلاق انسانی ایسی کج بحثوں سے معرضِ خطر میں تھا۔ اُس وقت سقراط آگے بڑھا اور اُس نے اپنی نیک نیتی اور صحیح الدماغی سے لوگوں کی رہنمائی کی۔ اُس نے کہا: "ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ایک کام جو ایک حالت میں ٹھیک ہوتا ہے، کسی اور حالت میں برا ہو اور اس صورت میں ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ فعل "نیک" یا "بد" ہے مگر ہمارے ان فقروں سے کم از کم یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ نیک و بد کچھ معنی اور حقیقت ضرور رکھتے ہیں۔ مثلاً جب ہم کسی شخص کی دیانتداری بیان کرتے ہیں تو ممکن ہے کہ ہم کو اس کی نیت کا حال معلوم نہ ہو یا ہم حالات سے پوری طرح واقف نہ ہوں اور ہماری رائے اس کی دیانتداری کے متعلق غلط ہو۔ ہم کہیں گے "میرا خیال تھا کہ وہ دیانتدار ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ میں غلطی پر ہوں"، مگر ہم یہ بھی نہ کہیں گے "کہ ہم جانتے ہی نہ تھے کہ دیانتداری کیا چیز ہے"۔ کیونکہ ہم اگر دیانتداری ہی سے ناواقف تھے تو غلط یا صحیح رائے کس طرح قائم کر سکتے۔ اس لئے سب سے مقدم یہ ہے کہ ان الفاظ سے جن کو منطق میں موضوعات کہا جاتا ہے۔ پوری طرح واقف ہوں۔ مثلاً سچا منصف بہادر وغیرہ اور ہر ایک کی تعریف کر سکے کہ اس کے معنوں کی توضیح کریں۔"

سقراط کے ان خیالات سے کہ انصاف بہادری وغیرہ وغیرہ حقائقِ ابدی ہیں اور اُن کے معنوں کی تحلیل اُن کی تعریفوں سے ہو سکتی ہے۔ افلاطون کو اندھیرے میں شمع ہدایت دکھائی۔ ہرقلاطیس کے عقیدت مند نے علم صحیح کے روئے تاباں کے آگے شک و گمان کی ایک دھندلی سی نقاب ڈال رکھی تھی۔ جس کو سقراط نے اپنے انوارِ ادراک سے تار تار کر دیا۔ یہ حقائق محسوسات کے زمرے سے باہر ہیں۔ جن اشیاء کا احساس ہمیں اپنے حواسِ خمسہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اُن موضوعات میں سے کسی نہ کسی کی محمول ہوتی ہے۔ مگر اس موضوع کو بذاتِ خود ادراک سے تعلق ہے۔ نہ کہ حواس سے۔ سقراط ان باتوں سے اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمِ محسوسات کے علاوہ جس میں اشیاء ہمیشہ انتقال و تغیر کی حالت میں رہتی ہیں اور جہاں کسی چیز کا علم کوئی حقیقت نہیں رکھتا ایک اور دنیا حقائق ابدی

کی بھی ہے اور ان حقائق کا علم بھی اُن ہی کی طرح ابدی ہے۔ عالمِ متغیر کی ہر ایک چیز کے ساتھ ایک حقیقتِ ابدی ملحق ہے اور جو رائے ہم عالمِ متغیر کی کسی چیز کی نسبت دیتے ہیں اُس میں اس حقیقتِ ابدی کا علم صحیح مضمر ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ "فلاں شخص دیانتدار ہے۔" تو اس فقرے میں اس بات کا اقرار ہوتا ہے کہ ہمیں دیانتداری کی حقیقت کا علم ہے۔

سقراط نے اس بارے میں اپنے خیالات اخلاقیات کے زمرے تک ہی محدود رکھے مگر افلاطون بہ آسانی اس سے بہت آگے چلا گیا اور اُس نے ان متغیر اور ابدی حقائق کا اطلاق ہر ایک چیز پر کیا۔ مثلاً یہ کہنا کہ خط اب خط ج د کے مساوی ہے۔ مساوات کے علم کو تسلیم کرتا ہے تو مساوات گویا ایک ایسی حقیقتِ ابدی ہے۔ جس کا احساس حواسِ خمسہ سے نہیں بلکہ ادراک سے ہو سکتا ہے۔ "مساوات" بذاتِ خود جو کل تھی وہ آج بھی ہے اور کل بھی رہے گی۔ گو کل ہمیں معلوم ہو جائے کو خط اب اور خط ج د درحقیقت آپس میں برابر نہیں۔

یہ مسئلہ حقائق ابدی افلاطون کی تعمیر فلسفہ کا سنگِ بنیاد ہی ہے۔ افلاطون ان حقائق کو اپنی زبان میں IDEAS کہا کرتا تھا۔ یہ لفظ اب تک انگریزی زبان میں موجود ہے۔ مگر اس کے معنی اب ان معنوں سے بہت مختلف ہیں۔ جن معنوں میں افلاطون نے اس کو استعمال کیا۔

(۲)

بیکن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی مشعلِ حکمت ہر ایک شخص کی شمع سے روشن کر لیا کرتا تھا۔ افلاطون کی نسبت بھی یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہرقلاطیس اور سقراط کے علاوہ اور بھی بہت سے قدما کی تعلیم نے اس کے دل و دماغ کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کیا اور گمراہ خیالات کو ہدایت بخشی۔ اس نے بہت سا اقتباس فیثا غورسیوں سے کیا۔ جن کے ساتھ اُس کے آقا کے دوستانہ تعلقات تھے۔ فیثا غورس مسیح سے قریباً ساڑھے پانچ سو سال پہلے جزیرہ ساموس

میں پیدا ہوا یہ جزیرہ ایشیائے کوچک کے ساحل کے ساتھ ہی واقع ہے۔ جہاں سب سے پہلے وہ یونانی علما تدریس کیا کرتے تھے۔ جو بعد میں اُن یونانی نوآبادیوں میں جا بسے اور جن کی وجہ سے جنوبی اٹلی "یونان اعظم" کے نام سے مشہور ہے۔

فیثاغورس نے ایک مذہبی جماعت کی بنیاد ڈالی۔ جس نے کچھ عرصے کے لیئے قرطانا کی حکومت پر غلبہ پا لیا۔ ملطی علما نے اپنے فلسفے کو مذہب کے ساتھ تعلق دینے کا خیال نہیں کیا۔ یہ درست ہے اُن کی مراد کوئی ذی شعور لائق عبادت ہستی نہ تھی بلکہ اس فلسفے ان کا مقصد محض نظام مادی کا ایک بڑا عنصر تھا۔ فیثاغورسی مذہب نے اگرچہ ایک طرف اُن وحشیانہ توہمات اور رسوم کو جن سے لوگوں کے اعمال اور خیالات کنارہ کش ہو چکے تھے از سر نو رواج دے دیا۔ مگر دوسری طرف اپنے تناسخ اور عقیدۂ دوام روح سے عظمت مذہب اور انسانی زندگی کی ذمہ داریوں کے احساس کو لوگوں کے دلوں میں بڑھا دیا۔ اُس نے یہ بات دنیا کے دل نشین کرا دی کہ انسانی ہستی قابلِ وقعت اور لائق عزت ہے۔ اس کو سطح آب پر محض ایک حباب نہ سمجھنا چاہیئے۔ انسان ایک ایسی حقیقت ہے۔ جس کے لیئے حسن آتش سوار یا چشمک برق کی تمثیل کسی طرح سے نمایاں نہیں ہو سکتی۔ ملطیوں کی طرح فیثاغورس علاوہ حکیم ہونے کے عالم بھی تھا۔ اب تک اس کو ہندسے کا بانی سمجھا جاتا ہے اور علم موسیقی میں سپتک کا موجد بھی اسی کو بتایا جاتا ہے۔ افلاطون کے زمانے میں فیثاغورسیوں کی شہرت نہ صرف بحیثیت عالی دماغ حکما کے تھی۔ جو انسانی روح کے انتقالات پر غور و خوض کیا کرتے تھے بلکہ ساتھ ہی وہ جید ریاضی دان اور موسیقی کے ماہر بھی شمار کیئے جاتے تھے۔

ریاضی اور مذہب دونوں میں فیثاغورسی عقائد نے افلاطون پر بہت سا اثر ڈالا۔ افلاطون خود بھی بڑا ریاضی دان گنا جاتا ہے۔ اس کی درسگاہ کے دروازے پر لکھا ہوا تھا کہ جو شخص ہندسہ نہ جانتا ہو اس کو اندر آنے کی اجازت نہیں۔ علاوہ فانی مادی حقائق کے ابدی حقائق کے

موجود ہونے کا مسئلہ فیثاغورسی بھی اپنے عقیدے میں ظاہر کر چکے تھے کہ کائنات کی اصلی بنیاد اعداد میں پائی جاتی ہے۔ پہلے پہل فیثاغورس کو اس بات کا خیال اس وقت آیا جب اس نے یہ دریافت کیا کہ موسیقی میں نغمے کا انحصار سُروں کے تناسب پر ہے ساتھ ہی ساتھ جب طبیعات کے دائرے کے وسیع ہو جانے سے بہتیرے مظاہر قدرت کو ریاضی کی پیمائشوں اور عرض و طول کے مسائل سے تطابق دیا گیا تو اُس خیال کو اور بھی تقویت مل گئی۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ افلاطون کے دریافت کردہ حقائق ابدی میں علاوہ اعداد کے اور بھی باتیں شامل ہیں۔ مگر افلاطون اور افلاطون سے بڑھ کر اُس کے پیرووں کی یہ عادت تھی کہ وہ ان حقائق کا ذکر جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا۔ فیثاغورسیوں کی طرح ریاضی کی اصطلاحات میں کیا کرتے تھے۔ جس طرح کا تعلق افلاطون کے عقیدۂ حقائق ابدی اور فیثاغورس کے عقیدہ اعداد میں پایا جاتا ہے۔ اسی طرح کا تعلق ان دونوں حکیموں کے عقائد روح میں بھی ہے۔ افلاطون کے مطابق روح ایک ایسا رشتہ ہے جو حقائق ابدی کی غیر فانی دنیا (جس میں کہ روح اپنی عقل و ادراک سے سب چیزوں کو سمجھتی جانچتی ہے) اور فانی تغیر پذیر مادی دنیا کے درمیان قائم ہے۔ عالم ادنیٰ یعنی موخر الذکر دنیا کے مختصات۔ حرکت اور انتقال سب روح کی بدولت ہیں۔ روح ہی تمام حرکت کا منبع ہے۔ یہی ایک ایسی چیز ہے۔ جو بذاتِ خود حرکت کر سکتی ہے۔ اجسام صرف اُسی حالت میں حرکت کر سکتے ہیں۔ جب یا تو اُن کو کوئی دوسری چیز حرکت دے یا (جیسا کہ تمام جانداروں کی کیفیت ہے) خود اُن کے اندر روح موجود ہو۔ جب روح کی سب سے بڑی کارپردازی اُس کی وہ کیفیت نفسی ہے۔ جس کی بدولت وہ ہر ایک حقیقت ابدی کو سمجھتا ہے۔ تو افلاطون اس کے سوا اور کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔ کہ روح بھی اُن حقائق کی طرح غیر فانی ہے۔ اور کون و فساد کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتے اور اُن کے لیئے غیر فانی ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا جا

سکتا۔ مگر زندگی اور موت کا یہ تسلسل اور روح جو اس انتقالِ لامتناہی کا سبب ہے دونوں ابدی ہیں۔ اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ اس ابدی روح سے افلاطون کی مراد روحِ کائنات تھی۔ نہ زید۔ عمر۔ بکر کی روح۔ کیونکہ کسی ایک فرد کی روح تو خود اس فرد کی طرح موت اور زندگی کے سلسلے میں بندھی ہوئی ہے اور نہ صرف حقائق ابدی کی فہیم ہے۔ بلکہ اُن اوہام اور خواہشات کا مصدر بھی ہے جو ہمارے فانی جسم کے ساتھ وابستہ ہیں تو پھر کسی ایک فرد کی روح کہاں سے آتی ہے اور کہاں چلی جاتی ہے؟ افلاطون کے دفترِ خیالات میں سے اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لئے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ افلاطون کے نزدیک فلسفہ صرف اُن نتائج کا نام ہے۔ جو غیر ہستیوں کے متعلق غور و تدبر کرنے کے بعد مرتب ہوتے ہیں اور اگر فلسفہ سے کسی سوال کا جواب طلب کیا جا سکتا ہے تو صرف ایسے سوال کا جس کا تعلق اُن غیر متغیر ہستیوں سے ہو اور بس۔ یوں تو تغیر پذیر حقائق کی نسبت کوئی سوال اگر کئے جائیں تو اُن کا جواب کہیں نہ کہیں سے ضرور مل سکتا ہے مگر فلسفہ ان جوابات کے متعلق اپنے علم حقائق ابدی کے ساتھ مقابلہ کر کے صرف یہ بتا سکتا ہے کہ وہ ٹھیک ہیں یا غلط۔ اس لئے جہاں پر ہمیں کوئی ایسا مورخ یا پیشین گو نہ مل سکے جو ہمیں کسی چیز کے ماضی یا مستقبل کے حالات سے آگاہ کر سکے۔ تو ایسی حالت میں ہمیں اپنے فہم کے موافق ایک افسانہ گھڑ لینا چاہیئے۔ جس کی کوئی بات حقائق ابدی کی مخالفت نہ کرتی ہو اور اس افسانے پر ہی اکتفا کرنی چاہیئے۔ افلاطون کے مقالات میں کئی ایسے افسانے ہیں جن میں مختلف سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کی گئی ہے مثلاً دنیا کہاں سے پیدا ہوئی؟ تمدن کا آغاز کس طرح ہوا؟ افراد کی ارواح کیا ہیں؟ وغیرہ وغیرہ یہ بات درجہ یقین تک پہنچ چکی ہے کہ افلاطون بحیثیت ایک معمولی انسان کے ایک فرد کی روح کو بھی کسی حد تک ابدی مانتا ہے۔

اگرچہ وہ اپنی اس ذاتی رائے کو فلسفے میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا جب کسی ریاضی کے سوال کا نتیجہ حل کسی کے سامنے پہلی دفعہ پیش کیا جاتا ہے تو وہ اس حل کے صحیح ہونے کو

فوراً پہچان لیتا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ افلاطون کا خیال تھا کہ اغلباً یہ بات اُس شخص کو کسی پہلے جنم میں معلوم تھی۔ مگر وہ اُسے بھولا ہوا تھا۔ جب اُس کے سامنے وہ حل لایا گیا تو اُس کی یاد تازہ ہو گئی اور اُس نے فوراً صحت حل کو پہچان لیا۔ اس بات کے ممکن اور اغلب ہونے میں افلاطون کو کوئی شک نہ تھا کہ ہر ایک روح جون بدلتی رہتی ہے۔ اور اس کے ہر ایک جنم کی نوعیت اُس کے پہلے جنم کے اعمال پر منحصر ہوتی ہے۔ اسی طرح کا ایک عقیدہ بدھ مذہب کا بھی ایک رکن ہے۔ بدھ مذہب اپنے پیروؤں کو مختلف جنموں میں نیکیاں جمع کرنے کے بعد آواگون سے رہائی اور اس زندگی کے رنج و کرب سے نجات کی امید دلاتا ہے۔ مگر افلاطون چونکہ بدھ کی طرح اس زندگی کو سراسر عذاب نہیں سمجھتا تھا۔ اس لئے اُس نے کبھی ایسی مکتی کا خیال نہیں کیا۔

فیثاغورسیوں کے علاوہ افلاطون اپنے خیالات کے لئے ایک اور فرقے کا بھی ممنون تھا۔ اس فرقے کو فرقہ ایلیاٹی کہا جاتا ہے اس کا بانی فرمانیدیس نامی ایک حکیم اٹلی کے جنوب میں شہر ایلیا کا باشندہ تھا۔ افلاطون نے اس حکیم کا ذکر اپنے ایک مکالمے میں کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سقراط کی جوانی کی عمر میں اُسے ملنے کے لئے ایتھنز آیا تھا۔ ہرقلیطس کے مسئلہ تغیر کے متعلق فرمانیدیس کے خیالات ہرقلیطس سے بالکل ہی متضاد جانب کو ہیں۔ ہرقلیطس کو اس دنیا میں ہر جگہ تغیر و حرکت کے آثار نظر آتے تھے اور فرمانیدیس اس کو محض نظر کا دھوکا سمجھتا تھا۔ وہ سرے سے حرکت و تغیر کے امکان کا قائل نہ تھا وہ کہتا تھا اگر ہم ذرا غور کریں تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ جب کبھی کوئی چیز حرکت کرے تو یہ ضروری ہے کہ وہ اس مقام سے جہاں وہ پہلے تھی کسی ایسے مقام میں جائے جہاں پر اس کے جانے سے پہلے کچھ نہ تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مقامِ ثانی پر اگر کوئی چیز پہلے موجود ہو تو وہ اس کو دھکیل کر وہاں سے باہر نکال دے اور خود اس کی جگہ لے۔ مگر جب شروع سے کوئی خلائے لاموجود فیہ ہی نہیں تو حرکت کا آغاز ہی ناممکن ہے۔ فرمانیدس کا یہ خیال تھا کہ کسی ایسے

خلائے لاموجود فیہ یعنی نیست کے محل وقوع کی ہستی کا ذکر کرنا یہ کہنا ہے کہ نیست بھی ہست میں شامل ہے جو نتیجے کے سراسر خلاف ہے۔ نیست کا محل وقوع تصور میں آنے سے انکار کرتا ہے اور جس چیز کو تصور سے گریز ہو۔ اس کی حقیقت فرمانیدیس تسلیم نہیں کرتا۔ ان خیالات نے اس کو یہ کہنے کی جرأت دلائی کہ کسی قسم کی حرکت انتقال یا تغیر سب ہماری آنکھوں کا فریب ہے۔ دراصل جو کچھ اس دنیا میں ہے وہ ایک غیر متغیر غیر متحرک ناقابل انتقال حقیقت ہے۔ جس کی نوعیت ہر سمت اور ہر حصے میں یکساں ہے اور جس کے وجود کی سالم ناشکستہ وحدت میں کہیں تقسیم حصص یا تفریق وتمیز ممکن نہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ دنیا کا جو متلون نقشہ ہمارے حواس ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ وہ اس یکرنگ مرقع سے بہت مختلف ہے۔ مگر ہمارے حواس جیساکہ سب کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اکثر ہمیں دھوکا دیتے ہیں۔ جو علم ہمیں ان کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اس کو ہمیشہ اپنے فہم وادراک سے پرکھ لینا چاہیئے اور فرمانیدیس کے ادراک کا یہی فیصلہ تھا کہ حواس غلطی پر ہیں اور ہم فریب خوردہ ہیں۔

افلاطون جس کی بلند پرواز طبیعت کی خواہشات کو یہ خیال کہ اس دنیا کو تغیر وگردش سے رہائی اور مکمل سکون واستقلال کبھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ بیدردی سے پامال کر دیتا تھا۔ قدرتی طور پر فرمانیدیس کے ساتھ ہم خیالی پر رضامند تھا اور اس کے فلسفیانہ عقائد کی رو سے ہر ایک حقیقتِ ابدی کو ان بے شمار محسوسات سے جن میں وہ مخلوط ہے اور جن میں گویا اس کا تکرار پایا جاتا ہے۔ وہی نسبت ہے جو فرمانیدیس کی واحد الوجود اور سالم الوجود حقیقت کو اس متلون اور سراپا فریب نظر دنیا سے ہے جس کی حواس ہمیں تلقین کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فرمانیدیس وحدتِ حقیقت کا مبلغ ہے اور افلاطون کثرتِ حقائق کا قائل۔ یعنی افلاطون کے خیال کے مطابق عالمِ حقائقِ ابدی اور عالمِ محسوسات ان دونوں میں سے ہر ایک میں کثرت وتفریق ضرور ہے۔ علاوہ بریں افلاطون عالمِ صوری کو بالکل ہی موہوم نہ سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک عالمِ صوری ہست ونیست کے درمیان ایک برزخ ہے

[illegible] ہے مگر اس کی شکل وہ نہیں جو ہمیں محسوس ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے فرمانیدیس اس کو بالکل خالی از حقیقت عاری از وجود اور نیست محض خیال کرتا تھا۔

فرمانیدیس کا حرکت جیسے امر الواقع سے انکار اس کے ہم عصروں کو اس کی سمجھ کا بجز معلوم ہوتا تھا اور وہ عدم حرکت کو خلافِ قیاس سمجھتے تھے۔

فرمانیدیس کے ایک مشہور شاگرد زینو نے اپنے آقا کے اس بظاہر خلاف قیاس نظریہ کی حمایت یہ کرنی چاہی کہ جب ہم اس (بقول معترضین "اظہر من الشمس حقیقت الامر") یعنی حرکت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ بھی (اگر زیادہ نہیں تو کم از کم فرمانیدیس کے عقیدے جتنی) خلافِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر محاصرہ ٹرائے کا نامور جانباز اقلیس جو اپنی سرعتِ رفتار کے لئے مشہور تھا ایک کچھوے کے ساتھ دوڑے تو یہ کہہ دینا بڑا ہی آسان معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھوے سے آگے بڑھ جائے گا۔ اب فرض کرو کہ اقلیس کی رفتار کچھوے سے دس گنا ہے اور کچھوے کو شروع سے سوگز کی رعایت دی گئی ہے۔ یعنی وہ پہلے ہی سے سوگز آگے کھڑا ہے۔ دونوں ایک ہی وقت دوڑنا شروع کرتے ہیں۔ جب اقلیس وہ سوگز کا فاصلہ جو اس کے اور کچھوے کے درمیان ہے طے کرے گا۔ تو کچھوا اتنے وقت میں دس گز آگے بڑھ جائے گا۔ اب اقلیس اور کچھوے کے درمیان دس گز کا فاصلہ ہے۔ پھر جب اقلیس وہ دس گز طے کرے گا تو کچھوا اقلیس سے ایک گز آگے ہوگا جب اقلیس وہ ایک گز طے کرے گا تو کچھوا ۱/۱۰ گز آگے ہوگا علیٰ ہذا القیاس ابدالآباد تک کچھوا اقلیس سے آگے ہی رہے گا۔ زینو کا ایک اور بھی اسی طرح کا معمہ ہے جس کو معمائے پروازِ تیر کہتے ہیں۔ جدید متحرک تصاویر کے اصول سے آشنا حضرات اس کو اچھی طرح سمجھ لیں گے۔ تیر کا جب کہ وہ حالتِ پرواز میں ہو کسی خاص معین وقت پر فوٹو لیا جا سکتا ہے جس کا مطلب یہ کہ وہ اس نقطۂ وقت پر جب کیمرے کے روزن کو کھولا گیا ساکن تھا اور چونکہ ہم جس وقت چاہیں اس کا فوٹو لے سکتے ہیں۔ اس لئے گویا وہ ہر وقت ساکن ہوتا ہے۔

اور اگر وہ ہر وقت ساکن ہوتا ہے تو ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کس وقت کرتا ہے۔ اس قسم کے معمول نے ہمیں یہ ثابت کر دکھانے میں بڑی مدد دی ہے کہ ساخت اور مدت دونوں کو مسلسل اور ناقابل تجزیہ تصور کرنا چاہیئے یعنی جس طرح ایک عدد اکائیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اس طرح یہ نقطوں کا مجموعہ نہیں ہوتے۔

بحث کا یہ طریقہ جس میں بحث کرنے والا یہ ثابت کرتا ہے کہ فریق مخالف کی بات کو مان لینے سے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ بعید از عقل ہیں۔ یونانیوں میں ڈائے لک ٹک (DIALECTIC) کے نام سے مشہور ہے۔ زینو اس کا موجد سمجھا جاتا تھا۔ سقراط بھی اس فن میں پورا ماہر تھا اور افلاطون تو اس کو اس قدر صحیح اور موزوں طریقہ تدلیل سمجھتا تھا۔ کہ وہ بعض اوقات وہ ڈائے لک ٹک کے لفظ کو فلسفے کے معنوں میں بھی استعمال کر لیا کرتا تھا۔

افلاطون کے قدماء میں سے انقصا غورث کا ذکر بھی یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ حکیم میلا طیسی حکماء کی طرح ایشیائے کوچک کا باشندہ تھا۔ مگر کچھ عرصے تک ایتھنز میں نامور سیاسی مدبر فرقلیس کے ساتھ بطور صلاح کار اور رفیق کے رہا۔ آخر کار جب وہ یہ کہنے کی جرأت کر بیٹھا کہ سورج اور چاند دیوتا نہیں بلکہ روحانیت سے بالکل مبرا سی مادے کے بنے ہوئے معمولی اجسام ہیں جس کی کہ ہماری پامال روندی ہوئی حقیر زمین کو نازک مزاج شاہان تاب سخن ندارد) اس نے ایتھنز کی جمہوریت کا قہر و غضب نازل ہوتے ہوئے دیکھا اور وہ اس شہر کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس زمانے میں اور سقراط کے وقت میں بھی جمہوریت حکومت کے مذہبی معاملات میں آزادی خیال کو گوارا نہ کر سکتی تھی۔ خصوصاً جب کہ انقصا غورث اور سقراط کی آزاد خیالی کا اثر اعلیٰ طبقوں پر پڑتا تھا۔ جہاں سے لوگوں کی حساس طبیعتوں کو ہر وقت سیاسی خرابی کا ڈر تھا۔

جیسا کہ ہم اس تحریر کے شروع میں بیان کر چکے ہیں۔ اولین میلا طیسی حکماء میں سے کئی ایک نے اپنے خیال کے مطابق کسی نہ کسی چیز کو کائنات کا مادۂ بنیادی قرار دیا، مگر

ان کا یہ نظریہ اس عقدے کے حل کرنے میں ناکام رہا کہ اشیاء کی کثرت اور ان کی خاصیتا میں اس قدر تباین کیوں ہے۔

انقصا غورث کا خیال تھا کہ پہلے پہل سب اقسام کی اشیاء ایک ہی غیر منفرق جمعیت کی حالت میں ہوتی ہیں۔ جہاں سے بعد میں ہر ایک کو ہمارا نفس علیحدہ کر کے سب کو نظم و ترتیب دیتا ہے اور ہر ایک کو اس کی مخصوص جگہ پر متعین کر دیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ انقصا غورث کے اس طرح نفس انسانی کو بطور ایک مرتب اور ناظم کے اہمیت دینے سے سقراط کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ ترتیب نظامِ قدرت کو سمجھنے کا یہ طریقہ اس کو اور سب حکماء کے طریقوں سے زیادہ امید دلانے والا معلوم ہوا۔ اور اس کے متذبذب دل کو اس خیال سے بہت سا اطمینان مل گیا۔ اس کو اس بات کی شکایت رہی کہ انقصا غورث نے اتنا کچھ کر کے یہ کیوں نہ بتایا کہ اس نظم و نسق کی تفریحات بحیثیت ہر ایک کے استعمالات کے کیونکر مقرر ہوتی ہیں۔ اس مسئلے پر اس نے خود اپنا دماغ لڑایا اور وہ ان پہلے شخصوں میں سے تھا جو جانداروں کے اجسام کی ترکیب اور ان کے اعضائے اور قوائے کی قابلیت کی ان کے ماحول کے ساتھ مطابقت کو اس بات کی دلیل سمجھتے تھے۔ کہ یہ دنیا کسی بڑے عقلمند اور رحیم صانع کا کام ہے اور یہ عالم عالمِ شہود ہے۔

(۳)

افلاطون کو اپنے آقا کے اس خیال کے ساتھ پورے طور پر اتفاق تھا کہ یہ دنیا عالمِ شہود ہے اور مختلف حقائقِ ابدی ایک ہی نظام کے عناصر ہیں جس میں ہر ایک حقیقت کا قیام اُن فواید پر مبنی ہے جو اس سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس کے متجسس ادراک کی تشفی صرف اسی خیال سے ہو سکتی تھی کہ تمام اشیاء ایک آسمانی ترکیب اور روحانی نظام کے ماتحت اپنا اپنا کام کرتی ہیں۔

چونکہ کسی باقاعدہ سوسائٹی کے اعمال، افعال اور اس کے افراد کے فرائض کا مناسب حل

جبھی معلوم ہو سکتا ہے جب کہ ان کا مقرر کرنے والا اس نظامِ عالم سے پوری طرح واقف ہو۔ اس لئے افلاطون کے خیال میں کسی قوم یا جماعت کے حکام ہمیشہ فلاسفر ہونے چاہئیں۔ اپنی عظیم الشان تصنیف "جمہوریت" میں اُس نے تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ سلطنت کے اُن "سرپرستوں" کو کس قسم کی تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔

افلاطون اپنی موت (۳۴۷ قبل مسیح) کے بعد ایتھنز میں اپنا بنا کر وہ ایک کالج چھوڑ گیا۔ جو بہت عرصے تک علوم اور فلسفے کا سب سے بڑا مرکز رہا۔ ۵۲۹ء میں جب شہنشاہ جسٹینین نے اس کا ذریعہ آمدنی ضبط کر لیا۔ تو اس کالج کا خاتمہ ہو گیا۔ اُن نوجوانوں میں سے جنھوں نے اس کالج میں خود اس کے بانی افلاطون سے تعلیم حاصل کی۔ ایک ارسطا طالیس بھی تھا۔ جس نے بعد میں وہ شہرت حاصل کی جو افلاطون کی شہرت سے کسی طرح کم نہ تھی۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ ہر شخص جبلی طور پر یا تو افلاطونی نقطۂ خیال کا ہوتا ہے یا ارسطا طالیسی۔ ان دو یونانی حکماء کو بلحاظ اُن کے ادراک کے رجحان اور طریقۂ فکر کی نوعیت کے قوتِ فکر کی دو متضاد اقسام کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ افلاطون کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے تخیل کی بلند پروازی کی وجہ سے حقائقِ حیات کو چشم و گوش کے معلومات سے بالاتر سمجھتا تھا۔ اُس کا توسنِ عقل و فہم اُس میدان میں جولانی کیا کرتا تھا۔ جو تجربے مشاہدے اور حواس کی حدود سے باہر ہے۔ ارسطو کی نسبت کہا جاتا ہے اُس کی طبیعت افلاطون کی طرح آزاد نہ تھی۔ وہ عرصۂ حکمت میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا تھا اور منطق کی زبردست بندشوں اور حواس اور تجربے کی مدد سے ایسے نتائج پر پہنچتا تھا۔ جن کا اثبات مشاہدے کی مدد سے ممکن تھا۔ اکثر بنظرِ غور دیکھا جائے تو دونوں فلسفیوں کی نسبت یہ رائے غلط ثابت ہوتی ہے۔ اکثر اوقات فلسفے کا طالب علم یہ محسوس کرتا ہے کہ افلاطون پکا منطقی تھا اور ارسطو اس قدر مقید اور محتاط نہ تھا جس قدر اس کو سمجھا جاتا تھا۔

ارسطو (پیدائش ۳۸۴ قبل مسیح۔ وفات ۳۲۲ برس قبل مسیح) افلاطون کے کالج کا ایک

ممبر تھا۔ مگر وہاں کا طرزِ تعلیم اُس کو پسند نہ آیا اور اُس نے اُس کالج کو چھوڑ کر خود ایک نئے کالج کی بنیاد ڈالی۔ اگرچہ وہ اپنے ساتھیوں سے اس طرح کنارہ کش ہو گیا تھا۔ مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ اپنی تصانیف میں فلسفیانہ بحث کو ہمیشہ ایک افلاطونی کی حیثیت سے شروع کرتا ہے اور آخر میں ان افلاطونی عقائد پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ جن سے اُسے اتفاق نہ تھا۔ پڑھنے والے کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ارسطو افلاطونی خیال کی ہمیشہ مخالفت کرتا رہتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ارسطو ان باتوں پر جن میں وہ اپنے استاد کا ہم خیال تھا۔ بہت کم زور دیتا ہے۔

ارسطو افلاطون کی طرح اس بات کو تسلیم کرتا تھا کہ صحیح علم صرف حقائقِ ابدی کا علم ہے۔ جن کی ہستی کی آگاہی ہمیں اپنے ادراک سے حاصل ہوتی ہے اور جن کو محسوس کرنے سے ہمارے حواس قاصر ہیں۔ مگر وہ افلاطونیوں کی طرح حقائقِ ابدی (اعراض) کو ان اشیاء (جواہر) سے جن میں وہ "منقسم" یا "منقول" ہوتے ہیں۔ علیحدہ نہیں سمجھتا۔ افلاطون کو بھی ایسا اچھا طریقہ بیان نہ سوجھا جس سے وہ جواہر کی کسی ایک نوع کا تعلق اس عرض سے ظاہر کرے جو اگرچہ اس نوع کی سب اشیاء میں پایا جاتا ہے۔ مگر پھر بھی بذاتِ خود اس نوع کے کسی ایک فرد سے علیحدہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اس تعلق کو "شرکت" کا تعلق کہا جا سکتا ہے مگر اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ ایک حقیقت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُن کو مختلف اشیاء میں منقسم کیا گیا ہے۔ بڑی چیزوں کو بڑا حصہ ملا ہے اور چھوٹی چیزوں کو چھوٹا۔ جس طرح مختلف جسامت کے چند اشخاص ایک سائبان کے نیچے آ کھڑے ہوں۔ تو ہر ایک کی جسامت کے مطابق سائبان کا تھوڑا یا بہت حصہ اُس کے اوپر ہو گا یا دوسرے پیرائے میں ہم اس تعلق کو "نقل" کہہ سکتے ہیں۔ مگر یہ فرض کرنا بھی مشکلات سے خالی نہیں۔ اگر ہم دو اشخاص کے ایک ہی نوع کے دو افراد ہونے کو اس طرح سے تعبیر کرتے ہیں۔ کہ وہ ایک ہی نمونے کی دو نقلیں ہیں تو ان دو افراد میں سے ہر ایک کی اس مفروضہ نمونے سے ہم نوع کی تعبیر کے لئے ایک او

نموتہ فرض کرنا پڑے گا اور اس طرح یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ شاید یہ کہنا سب سے بہتر ہوگا ہم اس تعلق سے اتنا سی آگاہ ہیں جتنا کہ جز و کل یا اصل و نقل کے تعلق سے ہمارے اس تعلق کو بیان کرنے کی نا بیتی یا نا اہلیت اس بات کی دلیل نہیں کہ ہم اس تعلق کو زیادہ سمجھتے ہیں۔

کئی لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ حقائق مشترکہ محض زائیدہ خیال اور ہمارے وہم و گمان کی پیدائش ہیں۔ مگر ارسطو کو اس بات سے انکار تھا۔ وہ ان کی ہستی کا بلا تعلق ذہن انسانی قائل تھا۔ وگرنہ علم طبیعی جن میں اشیاء کے چند خواص مشترکہ پر بحث کی جاتی ہے موہوم باتوں کے سوا کچھ نہیں رہتے۔ ارسطو نے مختصات کی دو قسمیں کی ہے۔ مختصات ذاتی (مثلاً انسانیت وغیرہ) اور مختصات صفاتی (مثلاً عظمت۔ سفیدی۔ عقلمندی وغیرہ)، مختصات صفاتی۔ مختصات ذاتی کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں اور مختصات ذاتی صرف کلام میں افراد موضوع سے علیحدہ شمار کی جاسکتی ہیں۔ ہر ایک فرد کی ایک مخصوص "شکل" (FORM) ہوتی ہے۔ انسان کی شکل کو دوسرے الفاظ میں "روح" کہا جاتا ہے۔ اس کا جسم جو تمام حرکات و افعال کے لئے روح کا محتاج ہے۔ روح سے بالکل متضاد ہے۔ اس کو "مادہ" کہتے ہیں۔ جب بہت سی اشیاء ایک ہی نوع یا قسم کی ہوں تو کوئی قضیہ جو اس نوع کے ایک فرد کی نسبت قائم کیا جاسکتا ہے اور جو مستقل وقعت رکھتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا جو اس نوع کے کسی اور فرد پر بھی صادق نہ آئے۔ ایسے قضایا کو "کلیات" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ارسطو کے مطابق صرف اس دنیا میں ہی بہت سی اشیاء ایک قسم کی ہوتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کی اشیاء کی ترکیب عناصر اربعہ خاک آب آتش باد سے ہے (ان چار چیزوں کو سب سے پہلے انبذاقلیس نے چوتھی صدی میں سسلی کا ایک ذی اقتدار فلاسفر تھا۔ عناصر قرار دیا۔ روایات کی رو سے اس فلاسفر نے اپنے آپ کو آتش فشاں پہاڑ

اتنا کے دہانے میں پھینک دیا تھا تاکہ اس کے اس طرح یک دم غائب ہو جانے سے وہ لوگوں میں دیوتا شمار کیا جانے۔ یہ عناصر اربعہ جو چار خواص بنیادی۔ حرارت۔ برودت رطوبت۔ یبوست سے پیدا ہوئے ہیں۔ مختلف تناسب میں ترکیب پاکر مختلف اجسام بن جاتے ہیں اور عناصر کے باہمی تضاد کی وجہ سے وہ اجسام ہمیشہ بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔ یہی افراد کی تکثیر کی وجہ ہے اور تسلسل افراد سے ہی نوع (نہ کہ فرد) بقا حاصل کر سکتی ہے۔ کائنات کے بالائی طبقوں میں ہر ایک آسمانی جسم اس مرکب مادے کا نہیں۔ بلکہ ایک اعلیٰ عنصر خاص کا بنا ہوا ہے۔ اس لئے وہ کبھی فنا نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی نوع کا ایک ہی فرد ہے اس لئے اس کی بقا کے لئے اس کی نوع کے اور افراد کا تسلسل ضروری نہیں۔

اس مختصر بحث سے یہ تو ظاہر ہو گیا ہوگا کہ ارسطو نے اس بارے میں اپنی توجہ کو زیادہ تر حیوانات اور نباتات تک ہی محدود رکھا اسی سے اس نے افلاک کی ابدی گردش کا سبب دریافت کرنے کی کوشش کی۔ غیر ذی روح اشیاء کی حرکت کسی اور متحرک شے کے تصادم کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مگر ذی روح اجسام کی حرکت اس طرح کی نہیں۔ افلاطون نے ہمیشہ متحرک رہنے والی روح کو تمام حرکت کا منبع قرار دیا تھا۔ مگر ارسطو ذی روح اشیاء کی حرکت کو خود زا نہ سمجھتا تھا۔ ذی روح اشیاء کی حرکت کی علت ہمیشہ علاوہ ازیں حرکت ہوتی ہے۔ یہ علت تصادم سے تو نہیں مگر ان اجسام کی خواہشات کو اکسانے سے اُن کی حرکت کا باعث ہوتی ہے اور اس لئے ضروری نہیں کہ وہ خود متحرک ہو۔ کیونکہ خواہش ایسی چیز کی بھی ہو سکتی ہے جس میں خود کوئی خواہش نہ ہو یا جو اس خواہش سے محض بے خبر ہو اس سے یہ ثابت ہوا کہ بالآخر تمام اشیاء کی حرکت کا ... ح ایک ایسا غیر متحرک محرک خدا ہے جو ذی روح اجسام کی خواہشات کو حرکت دے کر خود اُن کی حرکت کا باعث ہوتا ہے۔ کائنات کا یہ غیر متحرک محرک خدا ہے۔ وہ افضل خدا دنیا کو اس طرح گردش میں رکھتا ہے جس طرح کوئی محبوب اپنے عاشق کو۔ مگر جس طرح تمام اشیاء اس کی طرف کھینچ کر رہ جاتی ہیں وہ کسی

کی طرف کھنچ کر نہیں آتا۔ ایسی اکمل۔ اعلیٰ اور بے نیاز ہستی کے ساتھ اگر کوئی شغل منسوب کیا جا سکتا ہے تو وہ شغل علم ہے اور ایسی چیز جس کا علم اس کی شان کے شایان ہو اس کی اپنی ذات ہے۔ ارسطو کے خیال میں خدا دنیا کا بنانے والا نہیں۔ دنیا ازلی اور ابدی ہے نہ ہی وہ دنیا کی روح ہے وہ اکمل ذات ہے جس کے ساتھ اپنے آپ کو مطابقت دینے کے لئے تمام دنیا کوشاں ہے۔

ان اشیا کی حالت میں جو غیر ابدی ہیں اور جو ایک غیر مکمل صورت ہے۔ ایک دوسری مکمل تر صورت میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ ارسطو ان کے ارتقا کے اول ترین مدارج کا پتہ اس انتہائی صورت سے لگاتا ہے جس کی طرف اس ارتقا کا رخ ہوتا ہے۔ حیوانات اور نباتات کی علت غائی بلحاظ اپنی جنس کے تکمیل حاصل کرنا ہے۔ نہ یہ کہ وہ انسان کے لئے مفید ترین ثابت ہوں۔ ارسطو نے علل کی چار قسمیں قرار دی ہیں۔ علت مادی، علت عنصری۔ علت فاعلی اور علت غائی۔ غیاث اللغات مصنفہ محمد غیاث الدین میں لکھا ہے "علت کہ آں را سبب نیز گویند بر چہار قسم است۔ سبب در مسبب داخل بود یا خارج۔ اگر داخل بود بالقوت آں را علت مادی گویند بہ تشدید دال چوں نسبت چوب بالسریر۔ واگر داخل بود بالفعل آں را علت صوری گویند۔ چوں صورت سریر کہ مربع باشد یا مسدس۔ واگر خارج بود اگر آں سبب موجد اوست۔ آں را علت فاعلی گویند چوں بخار اگر ایجاد برائے آنست آں را علت غائی گویند۔ چوں جلوس بر سریر۔ پس علت غائی در ظہور موخر از ہمہ علت ہاست ودر ذہن وتعقل از ہمہ مقدم علت غائی غایت ومنتہائے جمیع سببہا ئے اربعہ است وبدانکہ اطلاق علت غائی در افعال حضرت حق سبحانہ، وتعالے روا ندارد۔ چرا کہ حق تعالےٰ در خلقت اشیاء محتاج بغرضے نیست۔ اگر بنظر دقیق دیکھا جائے۔ تو سوائے علت مادی کے باقی علل ثلاثہ مائل بہ انطباق معلوم ہوتی ہیں کیونکہ بخار اسی حد تک علت سریر شمار کیا جا سکتا ہے جس حد تک کہ وہ تخت کو ایک مخصوص شکل دینے کا باعث ہو۔ اور اس کی صنعت کا استعمال

(علت غائی) بھی وہی ہے جو اس شکل کی ایک لکڑی کی بنی ہوئی چیز کا ہو سکتا تھا۔ گویا علت فاعلی اور علت غائی علت صوری کے دو متشابہ پہلو ہیں۔

یہ نظام علل اربعہ پھر وہی بات ظاہر کرتا ہے کہ تمام غیر ابدی اشیا کے دو متباین پہلو ہیں۔ اول مادہ جو ایک مخصوص شکل پا کر ایک مخصوص چیز بن جاتا ہے۔ دوم صورت جس کی بدولت ہر ایک چیز اپنا جنسی یا نوعی نام پاتی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض اشیا جو خود ایک خاص شکل وصورت رکھتی ہیں (مثلاً سنگ مرمر) کسی دوسری حالت میں کسی اور چیز کا "مادہ" بن جائیں (مثلاً سنگ مرمر کا بت) مادہ بغیر شکل وصورت کے نہیں مل سکتا۔ ایسی حالت میں اس کی ہستی ہی نہیں ہو سکتی۔ برخلاف اس کے خدا (ارسطو کے خیال کے مطابق) شکل بغیر مادہ ہے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ ارسطو اگر کسی شغل کو خدا کی شان کے شایاں سمجھتا تھا تو وہ ایک شغل علم ہے۔ اسی لئے وہ انسان کے لئے اس کو اعلیٰ ترین اشتغال جانتا تھا۔ وہ اپنی تصنیف "اخلاقیات" میں کہتا ہے کہ تحصیل علم سے ہی انسان اپنی سب سے اشرف قابلیت کا فائدہ اٹھا سکتا ہے اسی بات میں اس کو دوسرے باشندگانِ زمین پر ترجیح دی جا سکتی ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی مسرتِ قلبی کا باعث ہو سکتی ہے۔ چونکہ انسان ادراک محض نہیں بلکہ ادراک اور حیوانیت کا ایک معجون مرکب ہے۔ اس لئے یہ مسرتِ قلبی تمدنی اور معاشرتی فرائض کی پابندی سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ انسان فطرتاً ایک حیوان متمدن ہے۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی طرح کی سوسائٹی میں پایا جاتا ہے۔ خواہ وہ سوسائٹی میاں بیوی اور بچوں کی ہی ہو۔ مگر ارسطو جس کو سب سے ارفع زندگی سمجھتا تھا وہ صرف آزاد اشخاص کے مہذب فرقوں میں ہی پائی جاتی ہے اور اس کا اپنے علم اور یقین کی بنا پر یہ خیال تھا کہ صرف یونانیوں کی نسل ہی آج تک ایسی مدنیت کے قابل ہوئی ہے۔

اپنی "سیاست" میں ارسطو نے اس قسم کی مدنیت کے آئین کا خاکہ کھینچا ہے۔ اگرچہ اس کے اپنے ہی ایک شاگرد سکندر اعظم کی بادشاہت میں یونانی مدنی حکومتوں کے

اتفاق اور ایک وسیع سلطنت کے قیام سے یونانی دنیا کا ایک نیا دور شروع ہوگیا۔ مگر ارسطو کو کبھی اس انقلاب کا خیال نہ آیا۔ اس کے دماغ میں ایک مہذب حکومت وہی ایک چھوٹی سی خود مختار دولت مشترکہ ہی ہوسکتی تھی۔ جس کی حدود ایک شہر اور اس کے مضافات کی حدود سے تجاوز نہ کریں۔ اور جو اتنی بڑی نہ ہو کہ اس کے تمام باشندے معاملات جمہور میں ذاتی حصّہ نہ لے سکیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ شہریوں کو اس بات کے لئے فرصت کہاں سے ملے۔ سو اس کے لئے ارسطو کہتا تھا کہ اپنا روزمرہ کا کام غلاموں کو سپرد کرکے حکومت کے لئے وقت نکالنا چاہیئے۔ طریقہ غلامی کو ارسطو جائز اور قدرتی امر سمجھتا تھا۔ کیونکہ بعض انسان قدرتی طور پر حکومت خود اختیاری کے ناقابل ہوتے ہیں۔ قومیں کی قومیں اپنی اس ناقابلیت کا اظہار بعض اوقات اس طرح سے کرتی ہیں کہ اگر ان کو اپنے آپ پر چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنے لئے ایک خود مختار حکمران انتخاب کر لیتی ہیں۔ جس کی وہ غلاموں کی طرح خدمت کرتی ہیں۔ آزاد دول مشترکہ میں سیاسی مساوات حقیقی مساوات کی بنا پر ہونی چاہیئے۔ اگر سوسائٹی کا کوئی ممبر اپنی ذاتی برتری کی وجہ سے باقی سب پر ممتاز ہو تو سب کو چاہیئے کہ اس کو اپنا قدرتی حاکم مان لیں۔ علاوہ بریں تموّل اور افلاس کی تمیز کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

افلاطون تو کہتا تھا کہ ہر ایک چیز تمام افراد جمہور کی ملکیت مشترکہ ہے اور سلطنت کے "سرپرست" (خواہ وہ مرد ہوں یا عورت) کسی چیز کو بھی اپنا نہیں کہہ سکتے۔ حتیٰ کہ وہ کسی شخص کو اپنا خاوند، اپنی بیوی۔ اپنا بچہ۔ اپنی ماں اپنا باپ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مگر ارسطو کو اس سے اتفاق نہ تھا وہ "ہر چہ از یار است از ما ست" کے اصول کو ممکن العمل نہ سمجھتا تھا۔ دو قریبی دوست ایک دوسرے کی چیز کو اپنی چیز سمجھ کر استعمال کرسکتے ہیں۔ مگر جہاں ہر ایک شخص اپنی چیز پر اپنا حق دوسروں کے برابر سمجھتا ہو وہاں بدنظمی اور بے ترتیبی کا پیدا ہونا لازمی امر ہے اور نہ ہی اس طرح سب کو حقوق مساوی

دینے سے اتحاد و موافقت کے بڑھنے کی کوئی امید ہوسکتی ہے۔ اس لئے ارسطو ایک شخص کے دوسرے شخص سے دولت مند ہونے کو اپنے آئین کے ماتحت ممکن و جائز سمجھتا تھا۔ روپیہ مالداروں کو اس حد تک حق مزید دلاتا ہے کہ اس کی بدولت وہ بھوکے ننگوں کی دستبرد سے بچے رہتے ہیں۔ مگر ان کو بالکل ہی لاچار اور بے بس نہیں بناسکتے۔

"پطرس"

کہکشاں۔ مارچ ۱۹۱۹ء

سر محمد اقبال

وہ انسان جس نے اُردو شاعری کو مردانہ پن بخشا

اقبال کی وفات سے ہندوستان ایک جلیل القدر شاعر سے کہیں زیادہ باعظمت ہستی سے محروم ہوگیا۔ وہ بطور ایک عالم متبحر اور نازنخ، فلسفہ اور مذہب کے سرگرم طالب علم کے بھی ان لوگوں کے لئے جو اپنی محدود قابلیت کے سبب اس کی اعلیٰ شاعری تک رسائی سے قاصر تھے۔ منبع فیض وجود تھا۔ بطور شاعر اگرچہ اس کا مقام نہایت بلند تھا۔ لیکن ادبی اور عمرانی دنیا میں اثر و نفوذ کے لحاظ سے اس کا مقام اس سے بھی بلند تر تھا۔ اس کی وفات سے جہاں مسلمانوں سے ایک فصیح اللسان پیغامبر اور ان کی تہذیب کا ایک بہت بڑا شارح چھن گیا ہے۔ وہاں اردو شاعری سے خدا معلوم کتنی دراز مدت کے لئے اہمیت اور منزلِ مقصود چھن گئی۔

کم و بیش چالیس سال گزرے جب اقبال کی شاعرانہ زندگی کا آغاز ہوا۔ اس وقت اردو شاعری اگرچہ لوگوں میں مقبول تھی اور ہر کس و ناکس اس سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ اس کا مقصد خود زندگی نہیں۔ بلکہ محض زندگی کے حاشیہ کی تزئین سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ مقبول عام فن تھا۔ مگر یہ فن محض فن کی خاطر اختیار کیا جاتا تھا۔ اس وقت شاعری کیا تھی؟ محض جذبات انگیز عیاشی، بزم و ناز، دل خوش کن، مزاحیہ یا ہجویہ، لیکن سراسر بے ربط۔ اسی لئے اس کے اختیار کرنے میں سنجیدگی اور متانت سے کام لینے کی ضرورت نہ سمجھی جاتی۔

لیکن مسلمانوں کے دلوں میں ایک نیا احساس کروٹیں لے رہا تھا اور لوگوں کی زبان پر تعمیراتِ ملت اور ترقی کے الفاظ آنے شروع ہو گئے تھے۔ ان میں جو زیادہ ذکی الحس واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے آرٹ کو پھر ڈھونڈ نکالا کہ یہ بھی انسان کے زیادہ اہم مشاغل میں سے ایک ہے اور اس کو اعلیٰ سنجیدگی اور مقصد و مدعا سے معمور کرنے کی کوشش کی گئی چنانچہ حالی ایسا غزل گو عہدِ شباب کی ہوس کاریوں سے تائب ہو کر مشہور زمانہ مسدس کا مصنف بن گیا۔ جس نے خوابِ غفلت کے متوالے ہندوستانی مسلمانوں کو اس طرح جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا کہ کوئی ایک نظم نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد ایسا کر سکی۔ انہی حالات میں اقبال جس نے اسی فرسودہ ڈگر پر اپنی شاعری شروع کی تھی، محسوس کرنے لگا کہ اس کا دل مسلمانوں کے احیا اور ان کی نئی زندگی کے خواب سے مضطرب اور بے قرار ہے۔

ہندوستان ہمارا

اقبال کی ابتدائی نظموں سے ہی جو اس رجحان کے ماتحت لکھی گئیں۔ اس ولولۂ عمل سے بے تاب دل اور اپنے وطن کے لئے جذباتِ محبت کا پتہ لگتا ہے۔ اس کی نظم،

"سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے"

اب تک فرقہ وارانہ اتحاد کی سب سے زیادہ پراثر اپیل ہے۔ جو کسی محب وطن کے قلم سے نکلی ہو اور اس کا شہرہ آفاق گیت "ہندوستان ہمارا" میرے خیال میں بہترین قومی گیت ہے۔ جس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا اور جس سے بہتر گیت کی شاید مدت مدید تک بننے کی امید نہیں ہو سکتی۔ لیکن مذہب اسلام کے غائر مطالعہ نے جو اقبال نے اپنی زندگی کے آخری ایام تک مسلسل جاری رکھا۔ اس کے افق خیال کو وسعت بخشی۔ وطن اور ملک کی نسبت سے قوموں کا تصور اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ اپنی شاعری اور اپنی گفتگو میں وہ ہمیشہ یورپ کی مثال دے کر انسانوں کو ملکوں اور وطنوں کے تنگ دائروں میں

تقسیم کرنے کی بے ہودگی ثابت کیا کرتا وہ ایک ایسے تمدنی نصب العین کا قائل تھا جو انسانوں کو وطنوں اور قوموں کے اختلافات کی سطح سے بلند کر دے اور جو زندگی کو ایک مقصد و مدعا بخشے کیونکہ اس کے نزدیک آرٹ کا بامقصد ہونا محض زندگی کے اصول علت العلل کا جزو لاینفک تھا۔ اسی قسم کی ہمہ گیری اور بامقصدیت انہیں نظر آئی تو اسلام میں یا چند جرمن فلسفیوں کی تعلیمات میں جن سے وہ بے دریغ اپنی شاعری میں استفادہ کرتا رہا۔

حجازی خیالی دُنیا

جس دور سے ہم ہندوستان میں گزر رہے ہیں۔ اگرچہ اس میں بڑے بڑے امکانات پوشیدہ ہیں تاہم اس میں ایک خاص غمناک کیفیت موجود ہے۔ ہم میں شاید ہی کوئی فنکار ایسا ہو جس کے فن میں گھر کے لئے اداسی بطور مرض کے موجود ہو۔ ہم دور دراز خیالی دنیاؤں کے آرزومند ہیں اور خواہ وہ دنیائیں خیالی ہوں یا حقیقی ان کی زمانی یا مکانی دوری ہی ان کے اندر ایک بے پناہ دلکشی پیدا کر دیتی ہے۔ اقبال نے اسلام کے ابتدائی زمانے پر پُرشوق نظر ڈالی۔ اس کی آرزو تھی کہ وہ اس عہد کے مسلمانوں کی سادگی، بلند ہمتی، ایمان اور عزم و استقلال کو دوبارہ پیدا کر سکے۔ ایک عالمگیر تمدن کے لئے اس کی دلی خواہش انسان کی تقدیر میں اس کا زبردست ایمان، انسان کے ارتقا میں اس کا پختہ یقین کہ وہ مقصد کی بلندیوں کو منزل بہ منزل طے کرتا ہوا کمال کی چوٹیوں پر پہنچ سکتا ہے۔ ان شرائط کے مطابق جو مسلم گھرانے میں پیدائش کے سبب اور اسلامی تعلیمات اس کے ذہن نشین ہو چکی تھیں۔ ان سب باتوں نے اس کی شاعری کو اسلامی رنگ دے دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں اس کے بعض قدردان اس سے چھن گئے۔

کسی شاعر کے کلام کی قدر اور اس کے اعتقاد کے باہمی تعلق کی بحث پرانی چیز ہے۔ اور میں اس کے متعلق یہاں کچھ نہ کہوں گا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ کچھ نہ کچھ ایسے لوگ ضرور

ہوتے ہیں، جو صرف اس لئے کہ ملٹن کی شاعری سے لطف اندوز ہوں کہ وہ اس کے مذہبی عقائد سے متفق نہیں یا جو شیکسپیئر کا کلام محض اس لئے پڑھنا گوارا نہ کریں کہ وہ اس کے شاہ پرستانہ خیالات کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن دوسرے لوگوں کے لئے جو کولرج کے لفظوں میں کسی شاعر کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت "انکار کو عمداً معطل کر دیتے ہیں،" اقبال رہتی دنیا تک مشرق کا سب سے زیادہ ولولہ خیز شاعر رہے گا۔

فارسی اور اُردو

اس کے بعض ہم وطنوں کی بدقسمتی ہے کہ اقبال کے بہترین کلام کا زیادہ حصہ فارسی میں ہے اور اس کی صرف ایک طویل نظم اسرارِ خودی کا ترجمہ جو پروفیسر نکلسن نے کیا ہے انگریزی زبان میں ملتا ہے۔ تاہم اس کا ابتدائی کلام جو اردو میں ہے وہی اس کو ہندوستانی شاعروں میں ایک بلند مقام دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن خواہ اس نے اپنی نظمیں اردو میں لکھیں خواہ فارسی میں، اس کا اردو شاعری پر گہرا اور مسلسل اثر پڑتا رہا۔ پیدائش کے لحاظ سے وہ پنجابی تھا اصل میں اقبال کشمیری اور ذات کا سپرو تھا، اسی لئے اس کے یوپی کے نکتہ چیں اس کو ہمیشہ یہ حقیقت ایسے لفظوں میں یاد دلاتے رہے جن میں انصاف کم اور تلخی زیادہ ہوتی تھی اور اس کی شاعری کی زبان کو ٹکسال باہر ہونے کا طعنہ دیتے رہے اور یہ باوجود اس حقیقت کے کہ وہ داغ کا معنوی فرزند تھا جو اردو زبان کا مسلمہ بادشاہ ہوا ہے۔ لیکن اس کی غیر معمولی قابلیت نے اس کے نکتہ چینوں کو جلدی خاموش کر دیا اور اس کی طرز شاعری کے بے شمار پہلو ملک کے طول و عرض میں پیدا ہو گئے اگر افراد کے وسیع اختلافات کا تذکرہ کرنا اندیشناک نہ ہو تو اس ضمن میں تین ہستیوں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جنھوں نے اپنے اپنے رنگ میں اردو ادب کو نئی اور مختار صورت بخشی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے زمیندار کے ابتدائی ایام میں اس میں مضمون لکھ لکھ کے اردو صحافت کو ایک ایسی زوردار اور لچکیلی زبان سے مالا مال کیا

جس سے وہ پہلے قطعاً ناواقف تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو نثر کو وہ شوکت، فراوانی اور شیرینی بخشی۔ جس کا راز انہوں نے عربی زبان کا مطالعہ کرتے وقت پا لیا تھا۔ لیکن چٹپٹے مضامین یا پُر اثر وعظوں کی نسبت شاعری لوگوں کے دلوں میں زیادہ گہرے نقوش چھوڑ جاتی ہے۔ جدید اردو کے بنانے والوں میں اقبال (اور اسی طرح اس کا پیش رو غالبؔ) ابھی تک سب سے نمایاں اور زبردست اثر ڈال رہا ہے ہزاروں ترکیبیں اور الفاظ جو ان دونوں استادانِ فن نے گھڑے یا اپنے فارسی کے پیشرو استادوں سے مستعار لئے آج بھی اردو تحریر اور تقریر میں ان کی گونج سنائی دے رہی ہے۔

(پطرس کے انگریزی مضمون کا ترجمہ از صوفی ریاض حسین)

غنچۂ تبسّم کے دیباچوں پر ایک نظر

نیاز مندانِ لاہور

حال ہی میں تمکینؔ کاظمی صاحب کے مضامین کا مجموعہ موسومہ بہ غنچۂ تبسّم حیدر آباد دکن سے شائع ہوا ہے کتاب کے شروع میں پانچ دیباچے ہیں ایک دیباچہ کاظمی صاحب کا اپنا لکھا ہوا ہے۔ باقی چار دیباچے چار دیگر مشاہیر روزگار کے قلم سے ہیں۔

کچھ عرصہ سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ دیباچوں کا مرض ہندوستان میں بڑھ رہا ہے۔ مُلّا کتاب شائع کرتا ہے تو حاجی اس پر دیباچہ لکھتا ہے۔ حاجی قلم اُٹھاتا ہے تو مُلّا اس کا تعارف کراتا ہے۔ مطلب اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ من ترا مُلّا بگویم تو مرا حاجی بگو۔ یہاں تک تو خیر کہا جا سکتا ہے کہ ملک میں ابھی تک جہلا کی کثرت ہے اور ہمارے اہلِ قلم اتنی دقیق باتیں لکھتے ہیں کہ جب تک ایک مصنف کے نکات اسی پائے کا دوسرا مصنف مجرد اشاعت لوگوں کے سامنے حل کر کے نہ رکھ دے بنی نوع انسان کی ایک بہت بڑی تعداد اس کے فیض سے محروم رہ جاتی ہے لیکن "غنچۂ تبسّم" کے ایک نسخے کے ہمراہ چار چار حکمائے زبان کا پرچۂ ترکیب ارسال کرنا زیرے کے منہ میں اونٹ کے برابر ہے۔ تمکین کاظمی صاحب کے نام اور ان کے ادبی کارناموں سے ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا آدمی کم و بیش واقف ہے کیا ان کی اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ جب تک چار آدمی انہیں کندھا نہ دیں وہ نقل و حرکت نہیں کر سکتے؟

اور پھر دیباچے بھی ایسے کہ ان سے نہ تو تمکین صاحب کی شانِ سخن طرازی میں کوئی اضافہ ہوتا ہے نہ دیباچہ نویسوں کی شانِ سخن فہمی ہی دوبالا ہوتی ہے البتہ فطرتِ انسانی کے

اس اہم اصول پر روشنی ضرور پڑتی ہے کہ "تا مرد سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد" یہ شروع شروع میں شیخ سعدی کی اٹھ ہم نے اس لیے لی کہ ہم بہر حال ناظرین و قارئین کے کثیر التعداد گروہ کے چند غیر معروف افراد ہیں اور دیباچہ نویس حضرات بہر حال اہل قلم، لہٰذا خدا کے بعض برگزیدہ بندوں میں سے ہیں ورنہ جو بات اس شعر میں شیخ سعدی کہہ گئے ہیں۔ ہم اپنے الفاظ میں زیادہ تحقیق، زیادہ زور اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرنے والے ہیں۔

پہلا دیباچہ تمکین کاظمی صاحب نے بقلم خود لکھا ہے لیکن اسے دیباچہ نہیں کہا "سر آغاز" کا لقب عطا فرمایا ہے دوسرے دیباچے کا نام "اعلام"، تیسرے کا نام "تاثر" چوتھے کا نام "تعارف" اور پانچویں کا نام "تقریب" ہے (ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ چھٹا دیباچہ نہ لکھوانے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لئے اس طرح کا مقوی نام نہ مل سکا ہوگا) یہ ثقالت الفاظ کتاب میں جا بجا پائی جاتی ہے۔ فہرست مضامین کو "مندرجات" لکھا گیا ہے کتاب کا تعبیری عنوان "مجموعہ نگارشات" لکھا ہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جدت کے پیچھے یوں ہی ہاتھ دھو کے پڑنا تھا تو صفحے کی بجائے "چہرۂ قرطاس" اور "ملنے کے پتے" کی بجائے "سبیل ہائے اصول" اور قیمت کی بجائے "نذر" یا "ہدیہ" کیوں نہ لکھ دیا۔ اگر محض الفاظ کی دہشت ناکی سے مرعوب کرنا مقصود ہو تو پھر قاموس کے بعد کسی اور کتاب کے لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے البتہ اگر ان عنوانات میں یہ خوبی ہے کہ ہر ایک کے اعداد سے کتاب کی تاریخ نکلتی ہے۔ تو مجبوری ہے۔

ہاں تو ہم تمکین صاحب کے "سر آغاز" کا ذکر کر رہے تھے چار دیباچوں میں اپنی تعریف کروانے کے بعد بھی تمکین صاحب کی تسکین نخوت نہ ہوئی تو انھوں نے خود قلم اٹھایا شروع میں تو کہہ دیا کہ "بنام خداوند بخشائش گر مہرباں" لیکن اللہ کا نام لینے کے بعد سنبھالا لیا اور تین صفحوں تک انا الحق ہی کہتے چلے گئے۔ جا بجا تاریخوں کا حوالہ ساتھ ساتھ دیا ہے تاکہ زمانہ آئندہ کے مورخ کو کوئی دقت پیش نہ آئے ۱۹۲۷ء میں میں نے یہ کیا۔ ۱۹۲۹ء میں میں نے یہ کیا ۱۹۳۰ء اور اوائل ۱۹۳۱ء میں مصروف زیادہ رہنا پڑا اور اولی اللہ "مدیران رسائل نے مضامین کے لئے

مارے تقاضوں کے نام میں دم کر دیا" آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

"بعض مضامین کی زبان پر اکثر احباب کو اعتراض ہوگا کیونکہ اکثر جگہ میں نے عمداً دکنی زبان اور محاورہ استعمال کرنے کی کوشش کی ہے اور خصوصاً ان مضامین میں زیادہ کوشش کی گئی ہے، جو حیدرآباد کے رسائل میں طبع ہوئے ہیں یا جن مضامین میں حیدرآباد کی تمدن و معاشرت کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے"

یہ جا بجا کوشش کے لفظ پر ہم نے خط اس لئے کھینچ دیئے ہیں کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ تمکین صاحب نے کتنی دفعہ اور کس خوبصورتی سے کوشش کی ہے مساعیٔ جمیلہ غالباً اسی کو کہتے ہیں۔ اگر تمکین صاحب اسی طرح کی پھسپھسی اردو لکھنے پر مصر ہیں تو ہم ان کو یہی مشورہ دیں گے کہ "تیرا ملک دکھن تو دکھنی بول" لیکن تمکین صاحب کی انانیت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ وہ اس طرح کی گل افشانی کے بعد بھی فرماتے ہیں:۔

"میری مادری زبان اردو ہے" اور میں نے اردو کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔"

نہ صرف یہ بلکہ کہتے ہیں:

"میں چاہتا تو ٹھیٹھ یوپی کے محاورات استعمال کر سکتا تھا۔"

اس تبحر علمی اور اس قادر الکلامی کے باوجود صرف ایک فقرے میں آتنی کوششیں بلکہ کاوشیں کرنے کی ضرورت پھر آخر کیوں پیش آئی؟

تمکین صاحب نے اپنی کتاب میں کئی دکنی الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ان کے متعلق دیباچے میں فرماتے ہیں:

"بعض احباب کا خیال تھا کہ آخر میں ایک فرہنگ لگائی جائے۔ مگر میں اس بدذوقی کا مخالف ہوں جنہیں ضرورت ہوگی وہ کسی حیدرآبادی سے پوچھ لیں گے یا مجھ سے دریافت کر لیں گے۔"

الحمدللہ کہ آپ کو بھی خوش مذاقی کا خیال تو آیا۔ کیوں حضرت ایک کتاب کے چار چار دیباچے بدمذاقی نہیں؟ ہر دیباچہ میں اپنی تعریف بلکہ بعض اوقات اپنی ڈائرکٹری تک چھپوا دینا بدمذاقی نہیں؟ ہر نوٹ میں بار بار اپنی طرف اشارہ کرنا بدمذاقی نہیں۔ لیکن جو الفاظ کسی لغت میں نہ پائے جاتے ہوں ان کے معنی بتا دینا بدمذاقی ہے۔ کیا آپ کو کوئی ایسا دوست نہ ملا جو یہ کام بھی کر دیتا جہاں اتنے گوناگوں و بوقلموں عنوان قائم کئے تھے وہاں دکنیات کا ایک اور عنوان بھی بڑھا دیتے۔ باقی رہی آپ کی خوش مذاقی سو اس کا ایک اور نمونہ بلا حظہ ہو اپنے کاتب کے متعلق فرماتے ہیں کہ زود نویس ہیں مگر:

"حد درجہ غلط نویس اور بے انتہا غیر پابند نہایت کم سواد ہیں۔ جنہوں نے املے کی غلطیوں کے علاوہ جملے کے جملے چھوڑ دیئے۔"

دل کی بھڑاس بھی نکالی تو بے چارے کاتب پر جسے عالم ہونے کا دعویٰ نہ فاضل ہونے کا اور خدا کے واسطے یہ تو بتایئے کہ "بہ املے کی غلطیوں" جو آپ نے لکھا ہے تو یہ کاتب نے غلط کتابت کی یا آپ نے دکنی انشے کے اصولوں کے مطابق لکھا اور کاتب صاحب کی کم سوادی کو آخر آپ کہاں کہاں پیش کرتے پھریں گے کیا ارنسٹ کے ترجمے میں "ایلجنن" کو ہر جگہ "ایلگنان" لکھنا بھی انہی کے سر تھوپئے گا؟ کم سوادی کوئی ایسی خاص صفت نہیں کہ صرف کاتبوں ہی میں پائی جاتی ہو۔

مولانا نیاز فتح پوری کے "اعلام" کے متعلق ہم حیران ہیں کہ کیا کہیں اور کیا کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھیں۔ تین مختصر صفحوں کے اندر انہوں نے اپنی کم علمی، پریشان خیالی اور غلط نگاری کی اتنی مثالیں جمع کر دی ہیں کہ اس سے بہتر جامعیت کی مثال اردو میں مشکل سے ملتی ہے۔ دیباچے کا آغاز یوں ہوتا ہے:

"غنچۂ تبسم"، جناب تمکین کاظمی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو نکاہات کے سلسلے میں انہوں نے لکھے ہیں۔ چونکہ میں طنزیات اور مزاحیات دونوں کو نکاہات

میں شامل کرتا ہوں۔ اس لئے میرا مقصود یہ ہے کہ دونوں رنگ کے مضامین اس مجموعے میں نظر آتے ہیں۔"

نیاز صاحب خود ہی بتائیں کہ "ان مضامین کا مجموعہ ہے جو نکاہات کے سلسلے میں انہوں نے لکھے ہیں"، کتنا بھونڈا فقرہ ہے "سلسلے" کا لفظ جس طرح سے انہوں نے استعمال کیا ہے۔ ہم اصلاح کے ذمہ دار نہیں لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ پہلے فقرے کو یوں لکھنا چاہیئے تھا:

"غنچۂ تبسم"، جناب تمکین کاظمی کے فکاہی مضامین کا مجموعہ ہے"،

اور یہ جو طنزیات اور مزاحیات کو فکاہات میں شامل کر کے اتنے بڑے بڑے جمادات سے ہم حیوانات کے سر پھوڑنے کی کوشش فرمائی ہے اس پر ہمیں ایک کہانی یاد آئی۔ علم ریاضی کے ایک پروفیسر اپنی ماما پر ناراض ہوئے۔ دل غصّے سے بھرا ہوا تھا چونکہ کبھی گالی دینے کی عادت نہ تھی اس لئے اظہارِ ناراضگی کے لئے موزوں الفاظ نہ ملے لیکن ماما کو ڈانٹنا بھی لازم تھا چنانچہ بھنّا کر بولے "تم بڑی مثلث متساوی اضلاع ہو۔" ماما بے چاری دبک کر رہ گئی۔ یہی حال نیاز صاحب کے اس فقرے کا ہے۔ جب انہوں نے نہایت زناٹے سے کہہ دیا کہ میں الف، بے کو جیم میں شامل کرتا ہوں، تو کسی کی اب کیا مجال کہ کچھ بولے۔ نیاز صاحب نے اپنے دماغ پر آنچ بھی نہ آنے دی اور یہاں علم و فضل کا رعب بھی پڑ گیا۔ خود ہی اصطلاحات گھڑیں۔ ان کے مفہوم کو بھی اپنے بطن کے اندر ہی رہنے دیا اور جس میں جس کو جی چاہا شامل کرتے رہے۔ اگلا فقرہ ملاحظہ ہو۔

"اس وقت یورپ کا کوئی شعبۂ علم ایسا نہیں جس میں یہ مخصوص طرزِ تحریر (یعنی ہیومر) مقبول نہ ہو، خصوصیت کے ساتھ تنقید، کہ اس کی تکمیل ہی نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس میں ظرافت کا گہرا رنگ شامل نہ ہو۔"

(کیوں حضرت یہ یورپ کا ذکر بھی اسی رعب ڈالنے کے سلسلے میں کر گئے؟) اگر علم کے لفظ کا استعمال نیاز صاحب نے غلط نہیں کیا تو یقیناً فلسفۂ ریاضی، علم حیوانات، علم نباتات، کیمیا، جغرافیہ

طبیعات، سبھی چیزیں شامل ہیں۔ خدا جانے نیاز صاحب کو ان علوم کی کونسی ایسی کتابیں دستیاب ہوئی ہیں جو لطیفوں اور چٹکلوں سے بھری پڑی ہیں؟ باقی رہی تنقید۔ نیاز صاحب کا ارشاد ہے کہ ظرافت کے بغیر اس کی تکمیل ہی ناممکن ہے گویا اگر ایک بھی قابلِ قدر نقاد ہم انہیں ایسا بتا دیں جو ظرافت سے عاری ہو تو ان کا یہ دعوےٰ لوچ ثابت ہو جائے گا۔ چونکہ نیاز صاحب کا فقرہ "اس وقت سے شروع ہوتا ہے اس لئے ہم صرف دورِ حاضرہ اور اختصار کی غرض سے صرف انگریزی کے نقادوں کو پیشِ نظر رکھیں گے ان میں سے ٹی ایس ایلیٹ، ورجینا وولف، کیتھرین منسفیلڈ، مڈلٹن مرے۔ پروفیسر گیرڈ، ولسن نائٹ، وغیرہم کی تصانیف خاص طور پر مستند مانی جاتی ہیں۔ اگر نیاز صاحب ان ناموں سے آشنا ہیں تو وہ فرمائیں کہ ان میں سے کون مزاح نگار رہے؟

یہ فہرست ادبی نقادوں کی تھی لیکن نیاز صاحب کی مراد شاید سوشل نقادوں سے ہے۔ ایچ جی ویلز نے موجودہ سوسائٹی کی تنقید میں بیسیوں کتابیں لکھ ڈالیں۔ معدودے چند کو چھوڑ کر باقی کسی میں ظرافت کا گہرا کیا ہلکا سا رنگ بھی نہیں پایا جاتا۔ ارل برٹرنڈ رسل جو دنیا کے مشہور فلاسفروں میں سے ہے اور جس نے موجودہ سوسائٹی پر کئی پہلوؤں سے نکتہ چینی کی ہے بھولے سے بھی کبھی مزاحیات میں قدم نہیں رکھا۔ نیاز صاحب نے جو اتنی بڑی بات منہ سے نکال دی اور یورپ اور یورپ کا ہر شعبہ علم اور تنقید اور تنقید کی تکمیل پر بات جس میں اپنی ٹانگ اڑا دی تو وہ کس جہاں کو اپنا مخاطب بنا رہے تھے؟ ایسی باتیں تو دوستوں کی صحبت میں کر لینی چاہئیں۔ ان کو سپردِ قلم کر کے تمام ہندوستان میں ان کی نشر و اشاعت کرنا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا ہے۔

یہ تو نیاز صاحب کے مطالعے کا حال تھا۔ اب ان کی انشا پردازی کا کمال ملاحظہ ہو، لکھتے ہیں:-

"جناب تمکین کاظمی نے حال ہی میں اس رنگ کو اختیار کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انکشاف ابھی ہوا ہے کہ وہ اس صنفِ ادب (یعنی ظرافت نگاری) پر بھی لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔"

پر "آپ نے خوب لگایا۔ مراد یہ تھی کہ تمکین صاحب ہیومر لکھتے ہیں یعنی فقرے سے بہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمکین صاحب ہیومر پر لکھتے ہیں (یعنی ہیومر پر تنقید و تبصرہ کرتے ہیں) فقرہ بہر حال بھونڈا ہے یعنی اگر نیاز صاحب کے الفاظ میں کم سے کم تغیر و تبدل کر کے اصلاح دی جائے تو یوں ہونا چاہیئے تھا

"وہ اس صنفِ ادب میں بھی لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔"

نہ یہ کہ وہ "اس صنفِ ادب پر بھی لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ اس صنفِ ادب "پر" لکھنے کی قابلیت تو خدا نے نیاز صاحب کو ہی عطا فرمائی ہے چنانچہ فرماتے ہیں:-

"فکاہی مضامین کی سب سے بڑی خوبی محاکات اور تجزیہ جذبات کہلاتی ہے۔ سوان دونوں کی اچھی اچھی مثالیں اس مجموعہ میں نظر آتی ہیں"

دوسرے فقرے میں "دونو" کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور پہلے فقرے میں واحد کا صیغہ پسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست۔ نیاز صاحب کا قول ہے کہ "جو محاورے یا اصطلاحات گوارے سے کانوں میں پڑے ہیں۔ ان کے خلاف اگر کوئی آواز کان میں آ جاتی ہے۔ تو تھوڑی دیر کے لئے سماعت مشوش ہو جاتی ہے۔" ہم نیاز صاحب کی خدمت میں درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی شیر خواری کے زمانے کو یاد کریں۔ پھر اس فقرے کو پڑھیں اور پھر ہمیں بتائیں کہ ان کی سماعت کو تشویش محسوس ہوتی ہے یا ہر طرح سے خیریت معلوم ہوتی ہے؟ کیا یہاں "خوبی" کی بجائے "خوبیاں" اور "ہے" کی بجائے "ہیں" نہ ہونا چاہیئے؟

لیکن اس بات کو جانے دیجئے۔ یہ زبان کا مسئلہ ہے اس میں اُن اہلِ زبان ہی کو آپس میں نبٹنے دیجئے جو صبح و شام اپنی زبان دانی کا ڈھول بجاتے رہتے ہیں۔ فقرے کے مفہوم پر غور کیجئے۔ نیاز صاحب نفسیات کا ایک مسئلہ بیان کر گئے ہیں اور کمال یہ ہے کہ بغیر سوچے سمجھے بیان کر گئے ہیں۔ کس بھول پن سے فرماتے ہیں کہ "فکاہی مضامین کی بڑی خوبی محاکات اور تجزیہ کہلاتی ہے" (یہ "کہلاتی ہے" کی بھی ایک ہی کہی یہ نہ بتایا کہ کون کہتا ہے بس کہہ دیا کہ کہلاتی ہے

خود بھی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے اور اس اجمال سے اثر بھی پیدا کر لیا کہ گویا ہم نے بڑے بڑے اہل الرائے کے خیالات کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ اب ہم تم اَن پڑھ لوگوں کے سامنے کس کس فلاسفر کا نام لیں تمہارے لئے اتنا کافی ہے کہ کہلاتی ہے) افسوس نیاز صاحب نے یہ نہ بتایا کہ فکا ہی مضامین کی بڑی بڑی خوبیوں کی تخصیص انہوں نے کیسے کر لی؟ نہ انہوں نے کوئی مثال پیش کی ہے نہ دلیل اور بات اس دھڑلے سے کی ہے گویا چلتے چلتے فنِ تنقید کی شاہراہ پر ایک سنگِ میل ہی تو نصب کر گئے ہیں۔ ایسی بے سر و پا بات کی تردید کوئی کس طرح کرے؟ البتہ اگر نیاز صاحب کبھی اس موضوع پر کوئی علیحدہ مضمون لکھیں اور اس میں اس دعوے کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کریں تو انشاء اللہ بشرطِ فرصت اس کا جواب ضرور لکھا جائے گا۔ اتنا ہم ان سے کہہ دیتے ہیں کہ وہ اس قسم کا مضمون لکھنے سے پیشتر برگسوں کی کتاب موسوم بہ "خندہ" یا میریڈتھ کا مضمون ضرور کسی سے پڑھ لیں۔ کہ ان سے بہتر اس موضوع پر کم لوگوں نے لکھا ہے۔

حیرت ہے کہ نیاز صاحب "یورپ کے ہر شعبۂ علم" کو جانتے ہوئے بھی ان کتابوں سے ابھی تک واقف نہیں ہیں ہم نے اس لئے فرض کر لیا کہ اگر انہوں نے ان دو مصنفوں کا مطالعہ کیا ہوتا تو کم از کم ایسی بہکی بہکی باتیں نہ کرتے۔ ہم اور ہم جیسے کئی نو مشق ابھی مدرسوں کی ابتدائی جماعتوں میں تعلیم پا رہے تھے کہ نیاز صاحب کا آفتابِ شہرت نصف النہار پر تھا لیکن افسوس کہ اس کہنہ مشقی کے مقابلے میں انہیں اپنی ذمہ داری کا احساس بہت کم ہے۔ جن موضوع پر وہ قلم اٹھاتے ہیں۔ ان کا دائرہ ماشاء اللہ روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے اگر ان کے شوقِ انشا پردازی کے ساتھ ساتھ ان کا علم بھی وسیع ہوتا رہتا یا کم از کم اگر وہ اپنے شوق کی جولانیوں کو اپنے دائرہ علم تک ہی محدود رکھتے تو بہت بہتر ہوتا۔

"تاثر" مولانا احسن مارہروی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اس دیباچے میں صرف ایک ہی خوبی ہے وہ یہ کہ مختصر ہے شروع میں علم الاصوات کے ایک نہایت ہی سہل اور پیش پا افتادہ مسئلے کو (کہ لہجہ بدلے تو معنی بھی بدل جاتے ہیں) بڑے طمطراق کے ساتھ گلے کی رگیں پھلا پھلا

کر اور ایک دو تین چار نمبر دے کر بیان کیا ہے اور سیدھی سادھی بات کو وہ اُلجھایا ہے کہ آشفتہ بیانی کو ہمیشہ کے لئے احسن مارہروی کا مرہون بنا دیا ہے (البتہ اس مسئلے سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ ہم انہیں کے الفاظ میں دہرائے دیتے ہیں (قارئین سے درخواست ہے کہ مندرجہ ذیل فقرے کو از حد غور سے پڑھیں)

"غرض یہ ہے کہ ہر زبان اپنے مراتب ترتیب میں مختلف نوعیتیں رکھتی ہے اور اس کی تمدنی حالت عام تصنیف و تالیف، سیاسی لکچر، ہندی مواعظ، اور روزمرہ بات چیت میں ایک دوسرے سے جداگانہ نظر آتی ہے۔ ان سب تنوعات کے بعد تقریر و تحریر کی متانت و ظرافت ایک نوعیت خاص ظاہر کرتی ہے جو ہر ادبی زبان میں تفنن طبع کے لئے ضروری اور جزوِ لاینفک ہیں"

احسن صاحب علی گڑھ میں پروفیسر ادبیات ہیں۔ علی گڑھ میں نکتہ رس، قابل، ذہین اور زبان دان حضرات کی کمی نہیں۔ خدا کے لئے ان میں سے کوئی صاحب اس کا غانی زبان کا اردو میں ترجمہ کر کے ہمیں اس کا مطلب سمجھا دیں۔ ان دو فقروں میں صرف اور نحو کی کئی غلطیاں ہیں کئی الفاظ کا استعمال معنوی اعتبار سے غلط ہے لیکن اس کو کنولنے سے کیا فائدہ؟ تمکین صاحب خود ہی فرمائیں کہ کیا وہ اس فقرے کا مفہوم سمجھتے ہیں اور اگر سمجھتے ہیں تو کیا انہوں نے خود ہی سمجھ لیا تھا۔ یا کسی جوتشی سے اس کے معنی پوچھے ہیں۔ کیا سلاست، شگفتگی اور روانی اسی کا نام ہے؟ بہت ممکن ہے کہ ادبیات کے پروفیسر ایسی زبان لکھتے ہوں۔ بہر حال احسن صاحب کی پروفیسریت کے سامنے اگر ہر فقرہ اس زور سے زانوئے ادب تہ کرتا ہے کہ مطلب تو پچک کر باہر نکل جاتا ہے اور لفظوں میں گٹے پڑ جاتے ہیں۔ اسی انداز کے ایک دو صفحے لکھ کر پروفیسر صاحب نے دیباچے کا خاتمہ ایک شعر پر کیا ہے۔

ہے غنچۂ تبسم تمکین کاظمی
ایسا مذاق جس میں متانت ہے لازمی

جس طرح احسن صاحب پروفیسر ادبیات کے دیباچے میں صرف ایک ہی خوبی ہے کہ مختصر ہے۔ اسی طرح احسن صاحب تلمیذ حضرتِ داغ کے شعر میں صرف ایک ہی خوبی ہے کہ تقطیع سے نہیں گرتا ورنہ کیا دیباچہ اور کیا شعر، کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست۔ احسن صاحب سے ہم اور تو کیا کہیں، صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ اگر لازمی کا لفظ آنا ایسا ہی لازمی تھا تو کاظمی کو کازمی لکھ دیا ہوتا کہ اس سے شعر کی حیثیت میں کوئی فرق نہ آتا۔

دیباچہ نمبر ۳ ملا رموزی صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ ملا رموزی بھی تمکین صاحب کی طرح اپنے نام کے ساتھ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) ضرور لکھتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ کوئی علمی سند نہیں محض چندہ دیتے رہنے کی علامت ہے یعنی اگر ہندوستان میں افلاس نہ ہو تو بھیل گونڈ تک سب ایم۔ آر۔ اے۔ ایس ہو سکتے ہیں۔ اہلِ دانش کے نزدیک اس کی وقعت تو آر۔ ایس۔ وی۔ پی سے بھی کم ہے اور پھر یہ لوگ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس کے بعد خطوط وحدانی کے اندر لندن اس التزام سے لکھتے ہیں گویا خاص جارج پنجم کے دستِ مبارک سے سند پائی ہے ان سے ہماری درخواست ہے کہ اہلِ فریبی کا یہ شیوہ ترک کر دیں اور نئے سال سے اپنے نام کے ساتھ یہ بے معنی حروف لکھنا چھوڑ دیں۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) لکھنے سے تو "بڑک (نشکار پور)" لکھنا زیادہ قدر افزائی کا موجب ہوگا۔

ملا رموزی صاحب کا دیباچہ بھی اسی بے ربطی کا آئینہ ہے جس کا اظہار انہوں نے اپنی لاہور والی تقریر میں کیا تھا نیاز صاحب کی طرح ملا رموزی صاحب نے بھی ظرافت نگاری پر افکارِ نیرہ کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"ظریف تحریر وہ جو پڑھنے والے کو اس موقع پر ہنسا دے جہاں ہنسنے کے لئے اس کا دل نہ چاہتا ہو۔ اور ظریف وہ جو حد سے سوا ہنسی پیدا کرنے والی تحریر لکھتا چلا جائے اور یہ نہ سمجھے کہ میں ظریف تحریر لکھ رہا ہوں۔"

ماشاء اللہ کیا حقائق بیان کئے جناب نے! گویا ظریف تحریر وہ ہے جو پڑھنے والے کو ہنسا دے۔

(یہ نکتہ ابتدائے آفرینش سے آج تک کتمِ عدم میں انتظار کر رہا تھا کہ بیسوی صدی میں ایک ملا رموزی پیدا ہوں گے جو اسے معرضِ ظہور میں لائیں گے) ظریف وہ ہے جس کی تحریر پر ہنسی تو آئے لیکن وہ یہ نہ سمجھے کہ میں ہنسا رہا ہوں اگر یہ صحیح ہے تو ہر بڑے سے بڑا احمق بے وقوف، ہر نادان بچہ، ہر غلط سلط اردو بولنے والا انگریز ظریف ہے کیونکہ ان لوگوں کو اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہم ہنسا رہے ہیں اور اگر ان کی باتیں بعینہٖ لکھ لی جائیں تو ہنسی کا سامان بھی فراہم ہو جاتا ہے۔ ملا رموزی دراصل کہنا کچھ چاہتے تھے منہ سے نکل کچھ گیا (بسیار نویسوں میں یہ نقص اکثر پایا جاتا ہے) مطلب ان کا یہ تھا کہ ظریف وہ ہے جس کی تحریر پر ہنسی تو آئے لیکن اس میں ہنسانے کی کوشش نمایاں طور پر ظاہر نہ ہو۔ یہ معیار ایک حد تک صحیح ہے لیکن افسوس کہ ملا رموزی خود اس معیار پر پورے نہیں اترے۔ دیباچے کا پہلا ہی فقرہ پڑھئے:

"اگر کنوئیں کے برابر گہری اور تالاب کے برابر چوڑی نظر سے دیکھا جائے تو....."

اخلاق کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اس فقرے کو ظریفانہ فقرہ سمجھ کر ایک قہقہہ لگائیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ہمارے اخلاق کی بہت بڑی آزمائش ہے۔

ملا رموزی صاحب بہت لکھنے کو انشا پردازی کا سب سے بڑا کمال سمجھتے ہیں چنانچہ اسی لئے اپنے اور تمکین صاحب اور سالک صاحب کے مداح ہیں فرماتے ہیں:۔

"ہم تو مولوی تمکین کاظمی کی مضمون نگاری کے قائل ہوئے تو اسی لئے کہ انہیں جب دیکھا یہی کہ بس لکھ رہے ہیں اور چھپوا رہے ہیں۔"

ملا رموزی صاحب نے خود بھی مدت سے یہی شیوہ اختیار کر لیا ہے کہ بس لکھ رہے ہیں۔ اور چھپوا رہے ہیں اس سے حضرت ضیاء الملک کی نظر انتخاب بہت کمزور ہو گئی ہے۔ جب مضمون نگاری کا معراج یہی فرض کر لیا جائے کہ انسان روزانہ دو تین من مضمون لکھ ڈالے تو وزن پورا کرنے کے لئے ادھر ادھر کی بے ربط باتیں کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

ملا رموزی صاحب نے اس دیباچے میں کئی جگہ بد ذوقی کا ثبوت دیا ہے لیکن چونکہ

انہوں نے دیباچہ ظریفانہ رنگ میں لکھنے کی کوشش کی ہے اس لئے ہم ایسی باتوں کو مذاق سمجھ لیں دوست درگزر کرتے ہیں۔ البتہ ایک بدذوقی ایسی ہے کہ علیٰ ظرافت بھی اسے اپنے دامن میں پناہ نہیں دے سکتا۔ انہوں نے سُہا صاحب کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے۔ حددرجہ قابلِ نفرین ہے۔ کسی شخص کے جسمانی نقائص کی ہنسی اڑانا اور وہ بھی ایک کتاب کے صفحے پر کسی مہذب طبقے میں جائز نہیں۔ یہی بات ہے تو کل کو آپ اندھوں اور کانوں اور لولوں اور لنگڑوں کی بھی ہنسی اڑائیں گے اور اپنی ظرافت نگاری پر فخر کریں گے۔ یہ ظرافت، جہلا کی ظرافت ہے۔ شرفا کے لئے اور بے شمار باتیں ہنسنے اور طنز کرنے کو موجود ہیں۔ ان پر طبع آزمائی کیجئے۔ فاضل الہیات کو کم از کم اخلاقیات سے تو واقف ہونا چاہیئے۔

چونکہ یہ دیباچہ رموزی صاحب نے ظرافت آمیز رنگ میں لکھا ہے اس لئے تمکین صاحب کو خیال ہوا کہ ہم بھی کیوں پیچھے رہ جائیں۔ جہاں جہاں رموزی صاحب نے کوئی مذاق کی بات کی وہیں آپ بھی نیچے ایک نوٹ دے کر دنیا کو یاد دلاتے چلے گئے کہ "اس ہنسی مذاق پر کہیں نہیں نہ بھول جایئے۔ ملا صاحب ظرافت نگار سہی لیکن کتاب تو بہر حال ہماری ہے"۔ ملا رموزی نے کہا ہے۔۔ "ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ تمکین صاحب کے اندر مہمان نوازی کی صفت ہے یا نہیں"۔ آپ نے اس پر نوٹ چڑھایا کہ "قطعاً صلاحیت نہیں ورنہ ضرور آپ کو حیدرآباد بلاتا۔" (سخن سنج لوٹ گئے۔ ہا ہا ہا) ملا صاحب نے کہا "آپ شیروانی کیوں پہنتے ہیں اور کوٹ سے کیوں نفرت ہے؟" آپ نے فوراً اپنی قلم سے جواب دیا کہ "کبھی کبھی کوٹ پتلون بھی پہنتا ہوں" (ہا ہا ہا) ملا صاحب نے کہا "ان مضامین کو حاصل کرکے دوزخ کی آگ سے محفوظ ہو جایئے"۔ آپ نے نوٹ ایزاد کیا کہ "مسلمانو عبرت حاصل کرو"۔ (ہا ہا ہا) ملا صاحب نے کہا "خدا نہیں منصب دار بنادے" آپ نے جھٹ تصحیح کی کہ "آپ کی دعا سے منصب تو ہمیں اب بھی ہے"۔۔ (غیر مرفہ الحال لوگ فوراً مرعوب ہو گئے) سبحان اللہ کیا ادبی پھلجھڑیاں ہیں۔

"تقریب" کے لکھنے والے مولوی عبدالمنعم صاحب سعیدی بھی تمکین صاحب اور ملا رموزی

کی طرح بیانگ دہل ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) ہیں۔ ان میں صراحتہً انانیت باقی دیباچہ نویسوں کے مقابلے میں کم ہے لیکن کنایتہً ادعائے علم میں یہ بھی ویسے ہی بلند آہنگ ہیں۔ زورِ قلم خودنمائی کی بہ نسبت دوست نوازی میں زیادہ صرف کیا ہے تاہم ایک تمکین صاحب کی عظمت ثابت کرنے کے لئے وکٹر ہیوگو، ہربرٹ اسپنسر، میتھو آرنلڈ، گارڈن رسکن، لنکن اور ایمرسن کے اقوال نقل کر کے ان مشاہیر کو مفت میں رسوا کیا اور اپنے دوست کو نہایت نیک نیتی کے ساتھ مضحکہ انگیز بنادیا۔ اقتباسات کے نقل کرنے میں سعیدی صاحب کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ میتھو آرنلڈ کا قول نقل کیا تو وہ غلط (اور اس کے معنی بھی غلط سمجھے) اور لنکن کا قول نقل کیا تو وہ غلط......

احسن مارہروی صاحب کی طرح سعیدی صاحب کا مذاقِ شعر بھی قابلِ ذکر ہے۔ غالب کا ایک مصرعہ نقل کیا کہ "ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی"، "تو حسن پرستی"، کو "عشق پرستی" بنادیا۔ اس کے علاوہ تین شعروں کو زینت کلام بنایا ہے پہلا شعر یہ ہے:۔

تو شاباش کیا کہنا ترقی اس کو کہتے ہیں
نہ ترشے تھے تو پتھر تھے جو ترشے تو خدا ٹھہرے

دوسرا مصرعہ تو خیر پھر بھی گوارا کرنے کے قابل ہے۔ لیکن پہلے مصرعے میں جیسے بلیچوں سے بھرتی کی گئی ہے دوسرا شعر ملاحظہ ہو:۔

زمانہ ایک طرح پہ کبھی نہیں رہتا
اسی کو اہلِ جہاں انقلاب کہتے ہیں

اگر سعیدی صاحب کو اسی پایے کے اشعار یاد رکھنے اور دہرانے کا شوق ہے تو مندرجہ ذیل شعر بھی نوٹ کر لیں کسی اور دیباچے میں کام آئے گا۔

ابھی سفید تھے بال اور ابھی سیاہ ہوئے
اسی کو لوگ عموماً خضاب کہتے ہیں

تیسرا شعر البتہ اچھا ہے اور اس کے اچھا ہونے کی وجہ سے سعیدی صاحب کچھ ایسے مذبذب ہیں

پڑ گئے کہ انہوں نے اس کے نیچے جھٹ قوسین میں اقبال کا نام لکھ دیا تاکہ پڑھنے والے سعیدی صاحب کو اس سے بری الذمہ سمجھیں۔

اس دیباچے کے پہلے حصے میں تمکین صاحب کے خاندانی حالات بالوضاحت بیان کئے گئے ہیں۔ ہم تمکین صاحب کے بزرگوں کو صد درجہ قابلِ احترام سمجھتے ہیں اور ان کی شان میں گستاخی کا ایک لفظ بھی منہ سے نکالنا پرلے درجے کی شقاوت۔ لیکن انہی کے احترام کی وجہ سے یہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر یہ حصہ حذف کر دیا جاتا تو بہتر تھا۔ آخر اولاد کے گناہوں کی سزا آباواجداد کیوں بھگتیں اور پھر اچھی بات بھی بے محل کی جائے تو بری معلوم ہوتی ہے تمکین صاحب آخر کہاں کے اتنے بڑے مصنف ہیں اور ان کی تحریرات ایسی بھی کیا خیال انگیز ہیں کہ پڑھنے والے ان کے خاندانی حالات بالوضاحت معلوم کرنے کے لئے بیقرار ہو جائیں۔

دوسرے حصے میں سعیدی صاحب نے اردو کے مزاحیہ نگاروں پر فرداً فرداً تنقید کی ہے۔ یا تنقید کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ سعیدی صاحب کے پاس خیالات کی قلت ہے اسی لئے بیچارے کسی کی تعریف کرتے وقت بے دست و پا ہو جاتے ہیں۔ تنقید کے تین چار نمونے ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ اس فن کو اردو میں مستقل طور پر سب سے پہلے منشی سجاد حیدر نے اختیار کیا اور عمدگی سے لکھتے رہے۔

۲۔ پطرس نے لائٹ ہیومر لکھا اور خوب لکھا۔

۳۔ فرحت اللہ بیگ نے بھی لائٹ ہیومر لکھنا شروع کیا اور خوب لکھا۔

۴۔ امتیاز علی تاج صاحب نے بھی ”چچا چھکن“ کا سلسلہ شروع کیا اور خوب لکھنے لگے۔

اس کے بعد ہم سوائے اس کے اور کیا کہیں کہ حضرت آپ نے بھی تنقید کا سلسلہ شروع کیا اور خوب لکھا لیکن باوجود اس کم مائگی کے (یا شاید اسی کم مائگی کی وجہ سے) معمولی سی بات کو بھی عالمانہ انداز میں بیان فرماتے ہیں مثلاً

”اردو ادبیات کا مطالعہ گہری نظر سے کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس فن کو اردو میں مستقل

طور پر سب سے پہلے منشی سجاد حیدر نے اختیار کیا“

اتنی ذرا سی بات کے معلوم کرنے کے لئے جس سے ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا بچہ واقف ہے۔ ”اردو ادبیات کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا“ کوہ کندن و کاہ برآوردن کے مصداق ہے۔ یہ شغل سعیدی صاحب ہی کو مبارک ہو، ایک اور جگہ حق دوستی یوں ادا کیا ہے:۔

”بہر حال میں خوش ہوں کہ آج وہ چیز پیش کر رہا ہوں جو ہر حیثیت سے کامل ہے“

ذکر تمکین صاحب کے مجموعۂ مضامین کا ہے لیکن فقرہ وہ استعمال کیا ہے جو اکثر پیغمبر بھی اپنے صحیفوں کے متعلق استعمال کرتے ہوئے متامل ہوں۔ سعیدی صاحب شاید ”کامل“ کے معنی نہیں جانتے انہوں نے اسے بھی ”خوب“ اور ”عمدہ“ کی قسم کا ایک معمولی لفظ سمجھ لیا ہے۔ — آخر میں سعیدی صاحب نے تمکین صاحب کے ساتھ حسد اور بغض رکھنے والوں کے خلاف جن کی تعداد بہ قول ان کے ”بہت کافی ہوگئی ہے“ بہت کچھ زہر اگلا ہے چونکہ ہم ان حاسدوں کے نام تک سے واقف نہیں نہ ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی تمکین صاحب کے ساتھ رشک اور حسد اور بغض رکھے تو کیوں۔ اس لئے ہمیں سعیدی صاحب کے زور دار فقروں میں بجز چڑچڑے پن اور سوئے ہضم کے اور کچھ نظر نہیں آتا مگر ہمیں سعیدی صاحب سے پورا پورا اتفاق ہے جو لوگ تمکین صاحب سے رشک کرتے ہیں ان کی دماغی حالت واقعی قابلِ افسوس ہے۔

خاتمے پر ہم نہایت واضح طور پر قارئین کے ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ ہمیں ان پانچ حضرات سے معاذ اللہ کوئی ذاتی عناد نہیں۔ عناد کیا معنی ہمیں تو افسوس ہے کہ ہمیں ملاقات تک کا شرف حاصل نہیں۔ لیکن جب یہ پانچوں سوار ایک ساتھ میدانِ ادب میں اترتے ہیں۔ اور باوجود اپنی زنگ خوردہ تلواروں اور اپنے فرسودہ ساز و سامان کے سمع خراش نعروں کے ساتھ روحِ ادب اور مذاقِ سلیم کو دعوت مبارزت دیتے ہیں تو ہر عاقل و بالغ کا فرض ہے کہ اس دعوت کا جواب دے۔ ہماری اپنی رائے ان پانچ انشا پردازوں کی تصنیفات کے متعلق یہ ہے کہ برا بھی لکھتے ہیں اچھا بھی لکھتے ہیں جب ہندوستان میں ادب و انشا کی یہ حالت ہے

کہ ہر بھلے برے کی کھپت ہو سکتی ہے تو ہم ان پر کیوں معترض ہوں؟ لیکن جب یہ لوگ تنقید کرنے بیٹھتے ہیں تو ایسی اوٹ پٹانگ باتیں اس وثوق کے ساتھ کرتے ہیں کہ ان کی نخوت کے غبارے میں چھید کرنا ان پر احسان اور اردو خوانوں کے ساتھ نیکی کرنا ہے۔ تمکین صاحب نے ایک کتاب لکھی تھی تو خاموشی، متانت اور شرافت کے ساتھ اسے بازار میں بیچ دیتے، صحیح آرا سے مستفید ہوتے غلط آرا کو نظر انداز کر دیتے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ کم از کم اخلاقاً ہی اکثر پڑھے لکھے لوگ کتاب کی تعریف نہ کرتے۔ انہوں نے کتاب کیا لکھی ہے کتاب کا جلوس نکالا ہے۔ ایک صاحب ذوق انشا پرداز کو اس قسم کی سوقیانہ حرکات سے گریز واجب ہے۔ دیباچہ نویسوں کی خدمت میں ہماری مؤدبانہ عرض ہے کہ شملہ بمقدار علم رکھیں۔ چلو بھر پانی میں گز بھر نہ اچھل پڑیں۔ عالم دہی ہے جس کا انداز عمر بھر طالب علمانہ رہے۔ بڑے بڑے دعوے کرنا اور ایک دفعہ قلم سے جو نکل جائے اسے نظر ثانی تک کا محتاج نہ سمجھنا جہالت کی نشانیاں ہیں۔ لنکن کا قول ہے۔

> "تم کچھ لوگوں کو ہمیشہ کے لئے اور سب لوگوں کو تھوڑے عرصے کے لئے دھوکہ دے سکتے ہو، لیکن سب لوگوں کو ہمیشہ کے لئے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے اس مضمون سے فضلائے زیر بحث کو تکلیف بھی ہوگی اور شرم بھی آئے گی۔ اگر شرم تکلیف پہ غالب آ گئی تو ہم ان کے جواب سے محروم رہ جائیں گے اگر تکلیف شرم پہ غالب آئی تو حیدر آباد، بھوپال، علی گڑھ اور لکھنؤ میں "لائیو تو قلم دان" کی آوازیں بلند ہوں گی گو ہمارا مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ ایسی باتیں شائع کرنے کی بجائے چپ رہنا بہتر ہے آگے آپ خود سوچ لیجئے۔ ہماری طرف سے خواہ آپ سب حضرات کسی مرکزی مقام پر سر جوڑ کر کوئی جواب مرتب کر لیجئے خواہ الگ الگ نبرد آزمائی کیجئے۔ ہم ہر طرح سے تیار ہیں۔ ہم تو بلکہ آپ سے "چھاپنے لازم" تک کے متوقع ہیں۔

باقی رہا "غنچۂ تبسم"، یہ کتاب ایک قابلِ احترام بزرگ کی تصویر سے شروع ہوتی ہے اور ایک ایسے مضمون پر ختم ہوتی ہے جو بازاری فواحشات سے پُر ہے۔ اس مضمون میں تمکین صاحب نے جس کوک شاستری ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے اس کے آثار نہ صرف ان کے باقی مضامین میں بلکہ ہندوستان کے اکثر مزاحیہ نگاروں کی تحریرات میں پائے جاتے ہیں۔ ان پر تنقید لکھنا ان کے نقش کو اور زیادہ پھیلانا ہے۔

انارکلی مخلص صاحب اور ہم نیاز مند

نیاز مندان لاہور

دسمبر ۱۹۳۲ء کے رسالہ ساقی میں "انارکلی پر ایک نظر" کے عنوان سے "ایک مخلص کے قلم سے" ایک مضمون چھپا ہے جو بوجوہ بے حد دلچسپ ہے۔ مضمون کا رقبہ ساڑھے آٹھ صفحے ہے لیکن فی مربع میل کے حساب سے خیالات کی مقدار سائبیریا کی آبادی سے زیادہ نہیں۔ جہاں تک بدگوئی کا تعلق ہے مضمون نگار صاحب ہر سطر میں گز گز بھر اچھلے پڑتے ہیں لیکن جہاں تک تنقید کا تعلق ہے وسعتِ ظرف چلو بھر سے بھی زیادہ نہیں اور چلو بھی ایسا جس میں وہ خود باوجود اپنی سبک خیالی کے ڈوب مرنے سے قاصر ہیں۔

تو پہلے بدگوئی کو لیجئے کیونکہ مخلص صاحب نے اپنا زورِ قلم زیادہ تر اسی صنفِ ادب یعنی بے ادبی پر صرف کیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انارکلی پڑھنے کے ساتھ ہی مخلص صاحب کو بدہضمی کی شکایت لاحق ہو گئی۔ چنانچہ ان کی بے قرار روح سے طرح طرح کی کریہہ آوازیں نکلتی ہیں کہتے ہیں انارکلی پڑھ کر بڑی مایوسی ہوئی۔ انارکلی کی موت سے زیادہ خود تاج صاحب کی حالت پر رونا آتا ہے وہ بجائے مبارک باد کے کسی اور بات کے مستحق ہیں۔ دل سے چاہتے ہیں کہ تاج صاحب آئندہ اس سفاکی سے لٹریچر کا خون نہ بہائیں تو بڑا احسان ہو گا۔ بلکہ بہتر تو یہی ہے کہ وہ آئندہ ذمہ دار لٹریچر سے کوئی واسطہ نہ رکھیں انارکلی کا ڈرامہ تو اتنا بھی بھاری بھرکم نہیں جو پڑھے لکھے تو درکنار معمولی واقفیت کے آدمی کو ہی بھلائے یا اس پر رعب ڈال سکے اور تاج صاحب کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ فوراً اسے دریا برد کر دیں۔

جب ہم نے یہ الفاظ پڑھے تو خیال آیا دہلی کسی دوست کو تار بھیجیں کہ کسی حکیم سے مشورہ کر کے مخلص صاحب کو ایک ہلکا سا جلاب دے دیں تاکہ یہ قراقر رفع ہو جائے اور انہیں ہدایت کریں کہ آئندہ برس دو برس تک کے لئے اپنی ادبی غذا ذرا ہلکی رکھیں مثلاً مولانا اسمٰعیل میرٹھی مرحوم کی نظمیں یا مولانا حسن نظامی کا روزنامچہ بس ایسی ایسی چیزیں پڑھ لیا کریں کیونکہ ان کا معدہ اس سے زیادہ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جب خدا بڑے ہو جائیں گے اور کچھ تھوڑا بہت پڑھ لیں گے تو پھر رڈ سیجڈی اور ٹریجڈی کی تنقید سے بھی شوق فرمالیں۔ فی الحال انہیں مولانا راشد الخیری کے ناول ہی پڑھتے رہنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ ایسے ہی نحیف دماغ کے لئے لکھے گئے ہیں۔

لیکن پھر خیال آیا کہ اس سے ہونہار بچوں کی دل شکنی ہو گی اب تو ماشاء اللہ اہلِ زبان بھی سکولوں کالجوں میں داخل ہونے لگے ہیں اور مذکر مونث کے جھگڑوں کو چھوڑ کر نقد و تبصرہ کے میدان میں زور آزمائی کرنے لگے ہیں۔ ذرا غور سے دیکھیں شاید کوئی کام کی بات کہنا سیکھ گئے ہو۔ یوں تو "اہلِ زباں" کی پت جھڑ شروع ہو کر ختم بھی ہونے کو آئی اور زبان کو ہانکتے ہانکتے ادب کی دم میں نمدہ بھی باندھ گئے لیکن شاید پھر بھی کسی ہونہار مضمون نگار کی دم میں کہیں کوئی چکنا پات لگا ہو اس خیال سے مضمون کو دوبارہ پڑھا تو معلوم ہوا کہ جہاں مخلص صاحب نے دس بارہ جگہ اپنی جہالت اور بداخلاقی کا ثبوت دیا ہے وہاں بیس تیس جگہ اپنی علمیت بھی ضرور جتائی ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کا ساختہ علم ان کی بے ساختہ جہالت سے کہیں زیادہ دلچسپ ہے۔ لیکن مخلص صاحب کی ان خصوصیات کا پیش کرنا کچھ آسان کام نہیں ان کے مضمون میں خیالات کے موتی بکھرے پڑے ہیں (زور دو بکھرے، پہ ہے موتی پر نہیں۔ دراصل موتی کی جگہ ایک اور لفظ سوچا تھا لیکن استعمال اس لئے نہیں کیا کہ "اہلِ زبان" کہیں گے محاورہ غلط ہو گیا) ان موتیوں کو چن کر یکجا کرنے کے لئے اس مضمون کی بھول بھلیاں میں کئی دفعہ گھومنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ژولیدہ بیانی ایسے نقادوں کی خاص سنت ہے مثلاً فرماتے ہیں:

"انارکلی... تین ایکٹ کا ایک موضوعی (سبجیکٹو) ڈرامہ ہے۔ جسے یہ اصطلاحی زبان میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ اس تصنیف میں تاج صاحب آنکھوں دیکھی نہیں بلکہ من مانی پدماوت سنائیں گے۔"

اب اس فقرے کو کوئی کیا کرے۔ اتنی فرصت کہاں کہ دہلی جا کر مخلص صاحب کے دارالمطالعہ کے دروازے پر دستک دیں اور وہ جھروکے سے جھانکیں تو ہم اتنا پوچھیں کہ حضرت سبجیکٹو ڈرامہ دہلی کا محاورہ ہے یا لکھنؤ کا؟ کیونکہ الفاظ تو انگریزی ہیں۔ لیکن انگریزی فن تنقید اس اصطلاح سے محض ناواقف ہے اس اصطلاح کی جو تصریح غیر اصطلاحی زبان میں مخلص صاحب نے ہم جاہلوں کے فائدے کے لئے کر رکھی ہے اس سے بھی نہ کھلا کہ یہ دریافت کیا ہے کب ہوئی اور اس کا کولمبس کون ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مخلص صاحب نے سنکارپور کے سفر کے دوران میں وہیلر کے بکسٹال سے ڈرامہ پر کوئی کتاب لے کر پڑھ لی تھی۔ جس سے ان کی جہالت میں اس قدر خوشگوار اضافہ ہوا کہ وہ اسے علم سمجھنے لگ گئے۔

غالباً اسی کتاب مستفرلال بجھکڑ سے مخلص صاحب پر یہ بھی انکشاف ہوا کہ:

"انارکلی ادب کی بنیادی تقسیم یعنی شاعری، فکشن اور ڈرامے کی آخری صنف کی حیثیت سے پیش ہوئی ہے بلکہ یہ کہیئے کہ اس صنف میں بھی غالب نسبتاً ایک ایسی اہم شق یعنی ٹریجڈی کی حامل ہے جسے انسان کی دکھیاری زندگی کا نمونۂ عبرت ہونا چاہیئے۔"

مطلب صرف اتنا ہے کہ انارکلی ایک ٹریجڈی ہے لیکن یہ ظاہر کرنا بھی مقصود تھا۔ کہ اس کے علاوہ بھی ہم بہت کچھ جانتے ہیں اور اس اظہارِ علم کے شوق میں بات ایسی فرسودہ اور بے معنی کہی کہ عطار گویدکی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔ خود اسی مضمون میں مخلص صاحب نے بڑے مربیانہ انداز میں حضرت آزاد مرحوم کی ایک تحریر کا نمونہ پیش کیا ہے اور اسے

خوب سراہا ہے ہم علامہ مخلص صاحب سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر ادب کی بنیادی تقسیم وہی ہے جسے انہوں نے مندرجہ بالا اقتباس میں یوں بھگا کر پیش کیا ہے تو وہ خود ہی بتائیں کہ آزاد کی یہ تحریر کس صنف میں شامل ہے۔ خواجہ حسن نظامی کا "سی پارہ دل" کس خانے میں ڈالئے گا۔ غالب کے "اردوئے معلیٰ" کو کیا قرار دیجئے گا۔ آپ کی پڑھی ہوئی کتابوں میں سے یہی مثالیں کافی ہیں۔

آگے چل کر اعتراف کرتے ہیں کہ انارکلی کا قصہ خود تاج صاحب کے قول کے مطابق ایک بے بنیاد چیز ہے لیکن اعتراض فرماتے ہیں کہ مصنف ڈرامہ نے سرفہرست ہی میں انارکلی کا یہ واقعہ ۱۵۹۹ء کا لکھا ہے جب کہ اکبر کی عمر چھپن سال تھی اور متحیر ہوتے ہیں کہ اکبر جس نے جوانی میں ہیموبقال کو نہ مارا وہ چھپن برس کی عمر میں انارکلی کو کیونکر مروا سکتا ہے۔ اس استدلال سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو یہی کہ قصہ بے بنیاد ہے پھر نہ معلوم مخلص صاحب تاج صاحب کی تائید کر رہے ہیں یا تردید؟

بر سبیل تذکرہ۔ ہندوستان کے تمام ججوں کو یہ بات نوٹ کر لینی چاہیئے کہ اگر ان کے سامنے کوئی چھپن برس کا شخص قتل کے الزام میں گرفتار ہو کر پیش ہو تو اس سے پہلی بات یہ پوچھیں کہ "کیوں بے تو نے جوانی میں ہیموں بقال کو مارا تھا؟" اگر جواب نفی میں ہو تو اسے رہا کر دیں۔

ان مثالوں سے میں قارئین کو اس بات کا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مخلص صاحب کے مضمون کو سمجھنے کے لئے باقاعدہ اغلاط نامہ مرتب کر کے ساتھ رکھنا پڑا۔ کئی فقروں کی نحوی ترکیب کرنی پڑی کئی پیراگرافوں کو از سر نو ترتیب دینا پڑا۔ کئی فقروں کے معنے جوتشیوں سے پوچھنے پڑے اور اس دوڑ دھوپ کے بعد مطلب یہ وصول ہوا کہ مخلص صاحب کو بہ قول ان کے "خلش" تین چیزوں سے ہوتی ہے۔

فرماتے ہیں:

"اکبر کے متعلق میں نے پہلے بھی کہا اور اب بھی کھلم کھلا کہتا ہوں (مضمون کا رقبہ اسی قسم کی تکرار کا ممنونِ احسان ہے) کہ انارکلی لکھ کر آپ نے اس کی باعظمت سیرت تباہ کی ہے۔"

اس سلسلے میں مخلص صاحب نے پھر اپنی پریشان خیالی کے کئی ثبوت دیئے ہیں۔ ایک طرف یہ فرماتے ہیں کہ:

"اکبر بادشاہ کے نام کے ساتھ ہی جو تصویر ہندوستان کے بچے بچے کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے وہ آپ کے اکبر والے کردار سے بالکل نہیں ملتی۔"

جس کا مطلب ہم یہ سمجھے کہ مخلص صاحب کے نزدیک ڈرامے کا اکبر تاریخ کے اکبر سے مختلف ہے (اس کا جواب مختصراً تو ہو سکتا تھا کہ ڈرامہ نویس یا کوئی بھی انشاپرداز اس بات کا حق رکھتا ہے کہ کسی تاریخی شخصیت کو جس طرح چاہے پیش کرے اگر وہ تاریخ کے مطابق نہ ہو تو آپ اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ایسے شخص کو مورخ کی حیثیت سے کوئی درجہ نہ ملنا چاہیئے۔ اس کی انشاپردازی پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ علم ادب کی تاریخ میں آپ کو کئی مثالیں اس بات کی ملیں گی کہ ایک ہی تاریخی شخص کو مختلف انشاپردازوں نے متباین اندازوں میں پیش کیا لیکن ان کی ادبی حیثیت کو تباین سے کوئی صدمہ نہ پہنچا لیکن یہ اصول ذرا مطالعے کے بعد سمجھ میں آتا ہے)۔

پھر آپ فرماتے ہیں:-

"ڈرامہ نگار کی تعریف یہی ہے کہ وہ جیتی جاگتی ہستیاں پیدا کرے اور کبھی بھی کوئی بات ان میں خلاف فطرت نہ ہو۔"

مخلص صاحب یہ دوسری بات کہنے کے ساتھ ہی بھول بھی گئے۔ یہ فقرہ جو کہیں سے سن پایا تھا جوں کا توں اپنے مضمون میں رکھ دیا لیکن اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اس معیار پر اکبر کے کیریکٹر کو پرکھ کر دکھاتے اور ثابت کرتے کہ فلاں بات جو اکبر نے کہی یا کی وہ انسانی فطرت

کے منافی ہے۔ اور بجز جنات کی امداد کے ظہور میں نہیں آسکتی۔ جب یہاں مخلص صاحب نے خود ہی ہتھیار ڈال دیئے تو ہم بھی ان کی جان بخشی کئے دیتے ہیں اور دنیا کو شاہد ٹھہراتے ہیں کہ ہم باوجود نوجوان ہونے کے نہتوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔

یہ خلافِ فطرت والی بات مخلص صاحب نے محض رعب گانٹھنے کو کہی تھی اصل مطلب ان کا وہی ہے کہ تاریخ کا اکبر بہت شاندار ہے اور ڈرامے کا اکبر ظالم اور سفاک سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ اس کے جواب میں ہم مخلص صاحب کی خدمت میں یہی مخلصانہ مشورہ پیش کرتے ہیں کہ وہ دس بارہ سال تک روزانہ انارکلی کی تلاوت فرماتے رہیں۔ ممکن ہے اس کے بعد موٹے موٹے نکات ان پر واضح ہو جائیں۔ اگر اسے پڑھ کر ان کی آنکھوں کے سامنے اکبر کی یہ تصویر نہیں کھنچتی تو ایک عالی وقار علم دوست روشن دماغ شہنشاہ جو ہر وقت ہندوستان کی عظمت کے خواب دیکھتا رہتا ہے اور ان خوابوں کی تعبیر کے لئے ہر وقت کوشاں رہتا ہے۔ ایک نوجوان بیٹا جو اس شاندار سلطنت کا ولی عہد ہے کمزوری یا بے راہروی کے ذرا سے آثار بھی پا کر اس قدر بیقرار و پریشان ہو جاتا ہے اور جہاں بانی کی اہم ذمہ داریوں کو اس درجہ محسوس کرتا ہے کہ اپنے پدرانہ جذبات کا خون کر لینے سے بھی نہیں ہچکچاتا اگر مخلص صاحب کی آنکھوں کے سامنے یہ تصویر نہیں کھنچتی تو چشمۂ آفتاب را چہ گناہ۔ اگر اب بھی مخلص صاحب کو ڈرامے کا اکبر محض ایک ظالم اور سفاک بادشاہ معلوم ہوتا ہے تو سوائے اس کے ان کا کیا علاج ہے کہ کوئی نیک دل انسان اپنی زندگی ان کی اصلاح کے لئے وقف کر دے خواہ مرتے وقت صرف یہ تسکین اپنے ساتھ لے جائے کہ انما الاعمال بالنیات۔ اگر ادب کا ذوق نہ ہو، استفادے کی قوت نہ ہو، احساسات میں بیداری نہ ہو، دماغ میں روشنی نہ ہو تو مبادیات ڈرامہ کے متعلق کسی سڑی بُسی کتاب میں چند فقرے پڑھ لینے سے تنقید کی قابلیت پیدا نہیں ہوتی۔

باقی اس قسم کے اعتراضات کہ فلاں باندی کی زبانی مغلِ اعظم کو صلواتیں سنوائی ہیں

فلاں کنیز کی زبانی سلیم کی مٹی پلید کرائی ہے۔ صرف ریختی لکھنے کے لئے مسالہ مہیا کر سکتے ہیں تنقید سے ان کو کوئی سروکار نہیں۔ ایسے اعتراضات نہ صرف انتہا درجے کی ادب ناشناسی بلکہ انتہا درجے کی کم فہمی کی دلیل ہیں۔ اکبر اور سلیم تو نہایت معمولی انسان ہیں اگر آپ بلا تشبیہ کسی پیغمبر کا قصہ بھی لکھیں تو اس میں بھی یہ ذکر نہ ور آئے گا کہ فلاں شخص نے ان کو پتھر مارے فلاں نے اس سے یہ بدسلوکی کی۔ حتیٰ کہ بعض نے انہیں سولی پر لٹکا دیا اور پھر بھی ان کا مضحکہ اُڑاتے رہے پھر اگر آپ پر کوئی اعتراض کرے کہ آپ نے معاذ اللہ فلاں پیغمبر کی توہین کرائی تو بتلایئے کہ آپ اس شخص کی ذہانت کے رُخِ انور پر ایک تھپڑ رسید کرنے کے سوا اور کیا کریں گے۔ مخلص صاحب کی خدمت میں صرف یہی عرض کیا جا سکتا ہے۔ کہ حضرت آپ ایک آدھ کتاب ابھی اور پڑھ لیجئے پھر تنقید نگاری بھی کر لیجئے گا آپ کا ہاتھ کس نے روکا ہے؟ لیکن اس نقادی میں بھی آپ کو یہ مزہ آئے گا کہ ہر مضمون کے بعد آپ خود ہی موضوع تنقید بن جائیں۔

ایک بات پڑھ کر ہمیں ہنسی بھی آئی اور رونا بھی آیا۔ فرماتے ہیں:۔

"میں اپنی تو یہ کہتا ہوں کہ انار کلی کا ظاہری حسن دیکھ کر بڑی امیدیں بندھی تھیں سوچتا تھا کہ واقعی یہ ڈرامہ مغلیہ شان و تجمل کا ایک سہانا خواب ہوگا جس میں شاہانِ سلف کے سبز و حسن کے حسین مناظر اس طرح دکھلائے گئے ہوں گے کہ جنت رُت ہے۔ اکبر بادشاہ سیر و شکار میں ہیں سینکڑوں ہاتھی گھوڑے اور ہزاروں خلقِ خدا کا لاؤ لشکر رکاب میں ہے گویا جنگل میں منگل ہو رہا ہے۔ دو آشیانہ منزل دجھروکہ سے لگا ہوا دیوان خاص ہے جس کے صحن کے بیچوں و بیچ (۴۰) گز طولانی ستون پر آکاش دیا رات میں دور دور روشنی پہنچاتا ہے اچھا یہ چیز تاج صاحب کی سمجھ میں نہ آئی تھی یا اس کا موقع نہ تھا تو اکبری سلطنت کا حسین بازو ہی نورتن سے ایسا سج دیتے کہ سب دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے۔ اگر اس کا اہتمام بھی تاج صاحب کے بس کا نہ تھا تو جشن نوروز

کے بیان میں کم سے کم مینا بازار کی پیاری تصویر کھینچ کے یہ رنگ تو دکھا دیا ہوتا کہ ملک تدبیر کے بادشاہ اکبر اعظم نے اپنی خداداد طبیعت سے اس میں کیا ندرت پیدا کی۔ یعنی یہی کہ بادشاہ امرا کو سلطنت کا رکن رکین جانتا تھا اور انہیں اس طرح شیر و شکر رکھنا چاہتا تھا کہ ایک دوسرے کی سنگت سے مزہ بڑھے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ خود دار امرا باہم کھٹک بھی جاتے۔ جہاں یہ صورت پیش آئی اور بادشاہ نے رشتہ ناطہ کر کے دونوں گھرانوں کو ایک کیا۔"

اب قارئین پر واضح ہو گیا ہوگا کہ مخلص صاحب ڈرامے کو سمجھنے سے کس حد تک اہل ہیں۔ تاج صاحب تو ڈرامہ انار کلی کا لکھ رہے ہیں کہ اس کنیز کا حسرت ناک انجام کیوں کر ہوا لیکن مخلص صاحب کو یہی افسوس رہا کہ تاج صاحب نے ان کو چالیس گز طولانی ستون کیوں نہیں دکھایا۔ مخلص صاحب کو خود بھی اس بات کی نامعقولیت سوجھ گئی چنانچہ دبی دبی زبان میں فرماتے ہیں:

"اچھا یہ چیز تاج صاحب کی سمجھ میں نہ آئی تھی یا اس کا موقع نہ تھا تو......"

خود دار بات یہی ہے کہ اس کا موقع نہ تھا۔ سمجھ میں تو آپ کی آ گیا لیکن ہٹ آپ کی ویسی ہی قائم ہے پھر بھی کہے جاتے ہیں کہ اچھا یہ نہیں تو نورتن ہی دکھا دیا ہوتا۔ اچھا یہ نہیں تو مینا بازار ہی دکھا دیا ہوتا۔ اب اس بچپنے کا کیا علاج مطلب مخلص صاحب کا یہ ہے۔ کہ تاج صاحب انار کلی کا قصہ تو تھوڑی دیر کو بند کر دیتے اور مخلص صاحب کو ایک ایسا سین دکھا دیتے جس میں اکبر امرا کے لڑکے لڑکیوں کے رشتے کراتے نظر آتے۔ کوئی تاج صاحب سے پوچھتا کہ حضرت یہ کیا دخل در معقولات ہے تو تاج صاحب جواب میں کہتے کہ قصہ انار کلی کا سہی لیکن اکبر کی خوبیاں اس تفصیل سے دکھانا بہرحال ثواب کا کام ہے۔ اگر ڈرامہ اسی اصول پر لکھا جاتا ہے تو تاج صاحب کو چاہیئے کہ اگلے ایڈیشن میں ایک آدھ سین غرناطہ

کا بھی دکھا دیں کیونکہ اس کی داستان بھی تو آخر اسلامی کلچر کی علمبردار ہے اگر غرناطہ بہت دور ہے تو کم از کم تُوزکِ بابری کا ذکر ضرور ہونا چاہیئے کیونکہ بابر بہر حال اکبر کا رشتہ دار تھا اور بقول مخلص صاحب وہ "سبزۂ رفتگاں" میں سے تھا۔ آخر میں ایک سین آل انڈیا مغل کانفرنس کا بھی دکھا دیا جائے جو حال ہی میں قائم ہوئی ہے تو اور بھی چار چاند لگ جائیں گے مخلص صاحب کو "تاریخی کلچر" کا درد تو بہت ہے۔ لیکن ان کا مذاق ایگریکلچر سے آگے بڑھنے نہیں پاتا۔

(۲) دوسرا اعتراض مخلص صاحب کا یہ ہے کہ تاج صاحب کی قوت مشاہدہ بہت کمزور ہے۔ علامت کے طور پر آپ نے تاج صاحب کا ایک فقرہ نقل کیا ہے۔

"موسم بہار کی ایک، دوپہر ظہر کی نماز ادا ہوئے ڈیڑھ گھنٹہ کے قریب وقت ہو چکا ہے۔"

اور اعتراض فرماتے ہیں۔ کہ اس فقرے میں بے ضرورت لفاظی ہے۔ فقرہ یوں ہونا چاہیئے تھا:

"بہار کا موسم سہ پہر کا وقت ہے۔"

دوپہر کے لفظ سے جو دھوپ کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور ظہر کی نماز کے ذکر سے جو ایک مسلمان گھرانے کی مسوفیات کی طرف ضمناً اشارہ ہے وہ آپ نے بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ وہ چیز جسے انگریزی میں ATMOSPHERE کہتے ہیں (معنی کسی پڑھے لکھے سے پوچھیے۔ ڈکشنری میں دیکھیے۔ اور شاید واضح طور پر سمجھ میں نہ آئیں) اس کی طرف سے تو مخلص صاحب آپ نے دماغ کے دروازے بالکل بند کر رکھے ہیں۔

مگر جس فقرے کو وہ بقول خود ابھار کے دکھانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے:

"ستونوں اور محرابوں کے سائے طویل ہونے شروع ہو گئے۔"

فرماتے ہیں:

"یہ ایک کھلی بات ہے کہ زوال کے بعد سایہ ڈھلنے لگتا ہے اور ظہر کی نماز ایک حد تک سایہ طویل ہونے پر ہی ہوتی ہے لیکن آپ کا جدید مشاہدہ بتاتا ہے کہ نماز ظہر کے بعد ڈیڑھ گھنٹہ ہو جاتے تو سائے طویل ہونے شروع ہوتے ہیں۔"

سایہ ڈھلنے اور سائے کے طویل ہونے میں جو فرق ہے وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ جس ستون پر دھوپ پڑ رہی ہے جب اس کا سایہ ستون کی لمبائی سے بھی بڑھ جائے تو اس کو سائے کا طویل ہونا کہتے ہیں دھوپ کے متعلق جس قدر مشاہدہ آپ کا ثابت ہوتا ہے وہ تو بجز بال سفید کرنے کے اور کسی کام نہ آئے گا۔

(۳) تیسرا اعتراض زبان کے متعلق ہے۔ اعتراض اوّل تو ایسے فقرے پر ہے کہ "تم غلیل ہو بشیخو؟" "تو مضائقہ کیا ہے حضور؟" وغیرہ وغیرہ۔ جو شخص "اہلِ زبان" ہو کر بھی نہ سمجھے کہ مخاطب کے نام کو فقرے کے آخر میں رکھ دینے سے فقرے کا تیور کس حد تک بدل جاتا ہے۔ اس کو کوئی غیر اہلِ زبان۔ بذریعہ تحریر تین سو میل کے فاصلے سے کیا سکھائے اور کس طرح سکھائے اور اہلِ زبان کو یہ کس طرح بتائے کہ اہلِ زبان ہونا اور بات ہے۔ زبان دان ہونا اور بات ہے۔ اے کاش کوئی قادر الکلام شخص بلند آواز سے ان فقروں کو مخلص صاحب کے سامنے پڑھے اور مخلص صاحب کے چہرے کا مطالعہ کرتا جائے اور جب آٹھ دس دفعہ پڑھنے کے بعد اسے مخلص صاحب کے چہرے پر انشراح کی کوئی جھلک نظر آئے تو ہمیں فوراً اطلاع دے تاکہ ہم شکرانے کے دو نفل پڑھیں حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ پرانی وضع کے ہندوستانی کھیلوں کے عادی ہو چکے ہیں۔ وہ ان کی مصنوعی زبان اور مصنوعی طرزِ تحریر سے اس قدر مانوس ہیں کہ اس قسم کی جیتی جاگتی زبان انہیں تکلیف دہ طور پر انوکھی معلوم ہوتی ہے۔ شیکسپیر نے بھی جب اس طرح کی جدت کی تھی۔ تو لوگ اس پر یونہی معترض ہوتے تھے۔ ادھر ایک بہت بڑے نقاد نے اس کے متعلق یہ کہا تھا کہ چھچھوری اور مبتذل

ایسے الفاظ کو ڈرامے میں استعمال نہ کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ لوگوں کو "خنجر اور دار" اور اسی سنف کے بلند آہنگ الفاظ کا چسکا پڑ گیا تھا اور جو مصنف اس تصنع سے گریز کرتا تھا وہ بہت بڑے گناہ کا مرتکب سمجھا جاتا ہے۔ مخلص صاحب تاریخ ادب سے واقف ہوتے تو عبرت پکڑتے لیکن دامن از کجا آرد کہ جامہ ندارد۔

"پختہ حسن" اور "پھیکا آسمان" وغیرہ کے متعلق مخلص صاحب نے صرف اتنا فرما دیا ۔ ئی ترکیبیں ہیں لیکن یہ نہ فرمایا کہ ان میں نقص کیا ہے کوئی اعتراض کرتے تو جواب کی تکلیف بھی گوارا کر لی جاتی۔ فی الحال تو اتنا ہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ بجا ہے حضور یہ نئی ترکیبیں ہیں اور ان میں سے بعض مثلاً پختہ حسن صرف بتدیوں کے لئے نئی ہیں۔

دو محاوروں کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ ان کا محل استعمال غلط ہے آخر مخلص صاحب اپنی حرکتوں پر اُتر آئے۔ ہم بھی متعجب تھے کہ "اہل زبان کی لکھی ہوئی تنقید ہو اور اس ملدی کی گرہ یعنی "محاورے" کا تذکرہ نہ ہو جس کی بدولت یوپی کے کئی حضرات پنساری بن بیٹھے ہیں۔ تاج صاحب کا فقرہ ہے "دنیا کی تو انار کلی انار کلی کہتے زبان خشک ہوئی جاتی ہے۔ اور تجھے اتنی توفیق نہیں کہ جھوٹے منہ سے دو بول شکریے ہی کے کہہ دے"

مخلص صاحب کہتے ہیں "جھوٹے منہ" کا یہ محل استعمال نہیں یہاں "جھوٹے منہ" چاہیئے۔

اگر جناب مخلص صاحب نور اللغات کی ورق گردانی کی زحمت گوارا فرمائیں تو انہیں معلوم ہو گا کہ جھوٹے منہ کے معنی ہیں۔ ظاہرداری سے اور نمائش سے۔ ڈرامے کا جو فقرہ اوپر نقل کیا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا تو تیری تعریفیں کر رہی ہے اور تجھے اتنی بھی توفیق نہیں کہ ظاہرداری یا نمائش ہی کے طور پر دو بول شکریے کے کہہ دے۔

"پھوٹے منہ" کے معنی نور اللغات میں یوں لکھے ہیں "(تحقیر سے) خراب منہ سے" بڑے منہ بد دلی کے ساتھ" تو جن میں جو "تحقیر سے" لکھا ہے اس سے مراد ہے کہ یہ محاورہ

جس کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے اس کی تحقیر بھی مراد ہوتی ہے گویا مخلص صاحب کا اعتراض یہ ہے۔ کہ انار کلی کی ماں اس موقعہ پر ایسا فقرہ کیوں نہیں کہتی جس سے انار کلی کی تحقیر کا پہلو بھی نکلے! یہ اعتراض محاورے کا اعتراض نہیں۔

"دوسرا اعتراض سیخچوں دار روزن" پر ہے "سیخچہ" کے معنی نور اللغات میں یہ لکھے ہیں۔ "چھوٹی سیخ" لوہے کی چھوٹی سلاخ "سیخچوں دار روزن" لکھنے سے مصنف کی مراد یہی ہے کہ ایسا روزن جس میں لوہے کی چھوٹی سلاخیں لگی ہیں۔ اس لفظ کے استعمال سے روزن کے متعلق بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر بڑا تھا۔ اگر کسی بہت ہی چھوٹے روزن مثلاً کسی گڑیا کے گھر کے روزن کا ذکر ہو تو ممکن ہے وہاں سیخچہ کی بجائے سلائی کا لفظ استعمال کیا جائے اس وقت مخلص صاحب فرمائیں گے کہ سلائی سے تو سرمہ لگایا جاتا ہے۔ خدا کے لئے مخلص صاحب کے کوئی دوست انہیں سمجھائیں۔

باقی الفاظ کے متعلق اطلاعاً عرض ہے کہ آپ کو شاید معلوم نہ ہو دہلی کے ایک مصنف منشی فیض الدین گزرے ہیں جو لال قلعے کی زبان لکھنے کے لئے مشہور تھے انہی کی ایک کتاب ہے بزم آخر، پچھلے دنوں تو نایاب تھی اب چاندنی چوک کی کسی دکان سے ضرور مل جائے گی۔ کبھی شام کو ایڈورڈ پارک سے فراغت پا کر ادھر سے گزریئے تو ایک نسخہ خریدتے لائیے اس میں آپ کو گنگا جل کپڑا اور گوش پیچ کی گوٹ اور اسی قسم کے کئی اور الفاظ مل جائیں گے جن پہ آپ یوں جاہلانہ معترض ہوتے ہیں۔ جو الفاظ وہاں نہ ملیں ان کے متعلق ابو الفضل کے آئین اکبری کا مطالعہ فرمایئے وہاں مل جائیں گے جو مغلیہ ڈرامہ لکھنے بیٹھتا ہے وہ ایسی مستند کتابوں ضرور دیکھ لیتا ہے۔ اے کاش جو لوگ تنقید لکھنے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ بھی اتنی تکلیف گوارا کر لیا کریں۔

اب آپ کے پاس صرف ایک ہی جواب رہ گیا ہے وہ یہ کہ ہم نور اللغات کو مستند مانتے ہیں۔ نہ بزم آخر کو اگر یہ واقعہ ہے تو مخلص صاحب کو چاہیئے پہلے اہل زبان آپس میں نپٹ لیں

جب خود ان کا ایمان درست ہو جائے تو پھر باقی صوبوں میں بھی تبلیغ شروع کریں۔

تو درونِ در چہ کردی کہ بروں خانہ آئی

یہ تمام ہست و بود ہے اس تنقید کی قارئین نے دیکھ لیا کہ اس تنقیدی مضمون میں انارکلی کے اصل موضوع کو مخلص صاحب نے چھوا تک نہیں محض ضمنی اور فروعی باتوں ہی میں اُلجھے رہے خود انارکلی کے کیریکٹر کے متعلق کچھ نہ فرمایا جو ڈرامے کی جان ہے اور جس کے اردگرد تمام واقعات و کوائف کی تنظیم کی گئی ہے۔ مناظر کی تقسیم کے متعلق کچھ نہ لکھا، واقعات کے تناسب کے متعلق کچھ نہ فرمایا۔ ٹریجڈی کی مختلف کیفیات کے زیر و بم کے بارے میں خاموش رہے۔ اردو ڈرامہ کی تاریخ کو پیشِ نظر رکھ کر یہ نہ فرمایا کہ انارکلی کا ڈرامہ کہاں تک رسمی ڈرامے کا نمونہ ہے اور کہاں پرانی قیود کو توڑتا ہوا نظر آتا ہے اس بات پر بحث نہ کی۔ اگر یہ ڈرامہ سٹیج پر دکھایا جائے تو کیا دقتیں پیش آئیں گی۔ پیشہ ور سٹیج اس کو کہاں تک قبول کر سکتی ہے اور کیوں؟ کسی اور ٹریجڈی سے مقابلہ نہ کیا۔ یہ نہ ارشاد کیا کہ اردو ڈرامے کی موجودہ حالت کیا ہے۔ اور اس میں انارکلی کس حد تک ترقی یا تنزل کا موجب ہو گا کہا تو یہ کہا کہ اکبر مہمت ! بہا آدمی تھا۔ سائے دوپہر کے بعد ہی ڈھلنے لگ جاتے ہیں اور ہمارے ہاں سینچ نہیں فلاں بچہ ہو گئے اور اپنے زعم میں سمجھ رہے ہوں گے کہ ارسطو کے بعد اگر کسی نے ڈرامے کی تنقید لکھی ہے تو ہمیں نے لکھی ہے۔

اب صرف ایک بات کا ذکر باقی رہ گیا ہے اور چونکہ میں اس بات کو محض کنایتہً بیان کرنا چاہتا ہوں اس لئے ڈر ہے کہ مخلص صاحب کے پلے شاید نہ پڑے۔ تاج صاحب نے انارکلی کو مس حجاب اسمٰعیل کے نام ڈیڈیکیٹ کیا چغتائی صاحب نے اپنی قلم کاری سے اس ڈرامے کی طباعت کو رونق بخشی۔ تاج صاحب اور مس حجاب یا تاج صاحب اور چغتائی صاحب کے باہمی مراسم مخلص صاحب کو معرضِ بحث میں نہ لانے چاہیئے تھے۔ مخلص صاحب اور مخلص صاحب کی قماش کے نقادوں،، کو ذہنی اعتبار سے ابھی ہجو نویسی کے درجے

سے بالاتر ہونے کی توفیق نصیب نہ ہوئی اور ابھی انہیں یہ محسوس نہیں ہوا کہ اس طرح کا واسوختانہ چرچا پن خود نقاد کے سفلہ پن کی دلیل ہوتا ہے۔ خصوصاً خواتین کا ذکر انہیں اس بے تکلفی سے نہ کرنا چاہیئے جس سے شہدے پن کی بُو آئے۔ یہ مس حجاب اسمٰعیل کی بدقسمتی ہے کہ وہ اپنی انشا پردازی کی وجہ سے اس زمرے میں شامل ہیں جس میں اصطلاحاً مخلص صاحب بھی قدم رکھتے ہیں لیکن مخلص صاحب کو اس پر فخر کرنا چاہیئے اسے اپنے عدم تربیت کے اظہار کے لئے ایک بہانہ نہ بنا لینا چاہیئے۔

مخلص صاحب کے مضمون کے ساتھ رسالہ ساقی کے ایڈیٹر نے ایک نوٹ لکھ کر چار دانگِ عالم میں اس بات کا اعلان کر دیا ہے کہ "مضمون نگار کی رائے سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے،، اور یوں سمجھ لیا ہے کہ وہ تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئے لیکن شاہد جیسے تربیت یافتہ نوجوان کو اس امر کا احساس ہونا چاہیئے کہ جس بد اخلاقی کی طرف ہم نے آخری پیراگراف میں اشارہ کیا ہے۔ اس کی اشاعت ایک دودمان عالیہ کے سپوت کو نہ کرنی چاہیئے تھی۔ مخلص صاحب کی نقادانہ بدتمیزیوں سے ہم شاہد صاحب کو بری الذمہ سمجھنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن مخلص صاحب کا "ذاتی کلچر" شاہد صاحب کے دامن پر چند ایسے بدنما دھبے چھوڑ گیا ہے جو بے تعلقی کا ایک نوٹ لکھ دینے سے نہیں دھل سکتے۔

ہم اس مضمون کے کسی کھیلنے سے جواب کے لئے چشم براہ ہیں خواہ وہ جواب مخلص صاحب لکھیں یا شاہد صاحب یا دونوں میں سے کسی ایک کے کوئی ایک یا ایک سے زیادہ گمنام یا نامدار، استاد، شاگرد یا ہمنوا۔

ایک غیر مطبوعہ کتاب کا دیباچہ

یہ کتاب ساٹھ مضامین کا مجموعہ ہے جو ۲۹ پاکستانی اور ۳۱ غیر پاکستانی (بیشتر امریکن) اکابر و مشاہیر کے خیالات و مشاہدات کے آئینہ دار ہیں۔ ہر حصّے کے پہلے مضمون کو چھوڑ کر باقی مضامین کی ترتیب بلحاظ ابجد ہے۔ ورنہ حفظ مراتب میں نہ معلوم کیا لغزشیں سرزد ہوتیں۔ پاکستانی مضامین چند ایک اور دیگر مضامین تمام تر انگریزی سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔ مترجمین کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ یہ کام انہوں نے خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

مجموعے کا خیال ایڈورڈ۔ آر۔ مرو (EDWARD R MURROW) کی ایک تالیف دِس آئی بلیو (THIS I BELIEVE) سے پیدا ہوا۔ مرو صاحب امریکن ریڈیو اور ٹیلیویژن کے مشاہیر میں سے ہیں کولمبیا براڈ کاسٹنگ سسٹم کے وائس پریذیڈنٹ ہیں۔ حالاتِ حاضرہ خصوصاً خارجی اور بین الاقوامی معاملات کے ماہرین میں ان کا رتبہ بلند سمجھا جاتا ہے اور تعلیمی مسائل سے بھی ان کو بہت دلچسپی ہے لاکھوں لوگ ان کے ترتیب دیئے ہوئے پروگرام کو غور سے سنتے اور دیکھتے ہیں اور ان سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔

مرو صاحب اس سے بے حد متاثر ہوئے کہ پچھلی جنگِ عظیم میں اہلِ انگلستان نے بہت ثابت قدمی دکھائی اور باوجود بے سروسامانی کے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور یہی نہیں کہ تیغ و تفنگ کے جوہر دکھائے بلکہ اپنے قدیم اصولوں اور روایتوں کی پابندی میں بھی کہیں خم نہیں کھایا۔ چنانچہ حب وطن عدل و انصاف، جمہوریت، ملت کا خیال، غرضیکہ ان

کے امتحان کی نوبت آئی ہر انگریز نے بلا سوچے سمجھے اپنے قدیم اصولوں کی پیروی کی اور خطرے کے زمانے میں بھی جب کہ دل یہی چاہتا ہے کہ کسی بات میں بہت مین میخ نہ نکالی جائے اپنی روایات کو پسِ پشت نہ ڈالا۔ اس سے مرو صاحب نے یہ نتیجہ نکالا کہ کسی قوم کا عمل دراصل اس کے عمیق عقائد پر مبنی ہوتا ہے اور وہی کسی بحران کے زمانے میں بروئے کار آتے ہیں۔ یہاں سے انہیں تلاش ہوئی کہ امریکیوں کے عقائد کیا ہیں؟ اور اس غرض کے لئے انہوں نے بڑے بڑے لوگوں کی طرف رجوع کیا اور ان سے کہا کہ آپ اپنے عقائد اور خیالات کا مختصر سا خاکہ کھینچ دیجئے۔ اس کے جواب میں جو مضامین وصول ہوئے انہیں پہلے ایک اور پھر ایک دوسری کتاب میں شائع کیا —— دونوں کتابیں غور سے پڑھی گئیں۔ چند مضامین ان میں سے اس کتاب میں بھی شامل ہیں اور امید ہے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

مکتبہ فرنیکلن نے ایسا ہی سوال میری وساطت سے پاکستان کے مشاہیر کے سامنے پیش کیا۔ جن مہربانوں نے اس کے جواب میں مضمون عطا فرمایا میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔

پاکستانی اور امریکی مضامین یکجا شائع ہوں تو دل ان کا مقابلہ کرنے کو چاہتا ہے دونوں ملکوں کا آپس میں جو تفاوت ہے وہ ظاہر ہے ایک امیر ملک، ایک غریب ملک —— ایک آزادی کا عادی، دوسرے کا تعارف آزادی سے بالکل ہی نیا —— ایک بیشتر مسیحیوں کا ملک دوسرا مسلموں کا —— ایک کی تاریخ یورپ سے وابستہ، دوسرے کا ماضی یورپ کی مخالفت سے لبریز —— ایک یوروپین ڈھانچے کا ملک، دوسرا ایشیائی ڈھانچے کا۔ اس لئے حیرت ہوتی ہے کہ دونوں ممالک کے مشاہیر کے خیالات میں جس قدر بھی ہم آہنگی ہے وہ کس قدر زیادہ ہے۔ دونوں قنوطیت سے دستبردار، دونوں ایمان کے قائل، جدوجہد کے قائل، عزم و خدمت کے قائل، دونوں کے نزدیک معاشری خدمت اہم ترین ضروریات ہی میں سے ہے۔ البتہ امریکہ میں ان خیالات کو بہت کچھ سہولتیں اور گنجائشِ عمل کی نصیب ہو چکی ہیں اور ہمارے ہاں ابھی بہت کچھ بطن مستقبل میں ہے۔ لیکن فخر و مسرت کا مقام ہے

ہمارے ہاں جو لوگ برسرِ کار ہیں یا جن کا معاشرے میں حصّہ لینا لابد ہے یا جو ایسے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو بہت عرصہ تک سربرآوردہ نمایانِ قوم مہیا کرتا رہے گا۔ ان کے خیالات اولوالعزمانہ ہیں وہ بلندی کے خواہاں ہیں ملّت کا احساس رکھتے ہیں۔ معاشری خدمت کی اہمیت کو پہچانتے ہیں۔ ایمان کو پاکیزہ زندگی کا جزوِ عظیم سمجھتے ہیں اور منزل سے دور سہی لیکن ترقی کی سمت انہیں درجہ اپنی پسماندگی کے ایسی ہی صاف دکھائی دے رہی ہے۔ جیسے امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک کو ــــ

جب میں اس مجموعہ کو اس نظر سے دیکھتا ہوں تو اس کی قدر بڑھ جاتی ہے اگر میری قوم فی الواقع مجموعی طور پر ان خیالات کی علم بردار ہے جو فرداً فرداً مشاہیر نے اپنے مضامین میں واضح کئے ہیں تو ہمارا مستقبل ایسا نہیں کہ ہم گھبرا جائیں آپ بھی اس کتاب کو اسی نظر سے پڑھیے۔ تو دلجمعی کا باعث ہو گی۔

(بشکریہ مکتبہ فرینکلن)

چُھپے چوری

ہاجرہ مسرور کی کتاب "چُھپے چوری" کا دیباچہ

جب بیسویں صدی پروان چڑھی اور ادیبوں کی فہرست میں کئی عورتوں کے نام چمکنے لگے تو بعض یورپین نقادوں کو جن میں خواتین بھی شامل تھیں۔ اس سوال نے گدگدایا کہ کیا عورتوں کا ادب مردوں سے جدا ہوتا ہے؟

انسان ہمیشہ سے یہی پوچھتا چلا آیا ہے کہ عورت اور مرد میں کیا فرق ہے؟ جو فرق آنکھوں کو نظر آیا اس سے مطمئن نہ ہوا بلکہ اس سے تو اُلجھن اور بھی بڑھی کہ ظاہر کا یہ حال ہے تو باطن میں خدا جانے کتنے فاصلے ہوں گے۔

عورت مرد نہیں بن سکی۔ مرد عورت نہیں ہو سکا۔ آدھی دنیا آدھی دنیا سے اجنبی۔ اندھیرے میں ایک دوسرے کو چھوتی اور ٹٹولتی چلی آئی ہے لیکن جب عورتیں بھی ادب کی دنیا میں مردوں کی ہمسایہ بن کر رہنے لگیں تو اندھیرا کچھ کم ہوا کیونکہ ادب سے بڑھ کر ادیب کی فطرت کا غمّاز اور عمّاز کوئی نہیں۔ یہ تو بچے جننے سے بھی زیادہ پردہ در ہے۔ پہلے پہل تو ادیب عورتوں نے مردوں کی نقل کی۔ گویا اپنے روپ میں سامنے نہ آئیں یا ادب کے کسی روائتی مسلک پر ادروں کے ساتھ ہو لیں۔ جہاں سب ہم سفروں کا بھیس ایک سا ہوتا ہے اور ایک سے دوسرا پہچانا نہیں جاتا لیکن جب خود اعتمادی بڑھی اور سچی سچی باتیں کہنے لگیں تو مردوں سے الگ نظر آنے لگیں۔

ایک جدید انگریزی ناول کی ہیروئن کہتی ہے "میں ایک عورت ہوں میری زندگی کیا ہے ایک لمبی مضبوط سی رسی جو کئی شخصی اور ذاتی رشتوں کے دھاگوں سے بنی ہوئی ہے۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں" عورتوں کے ادب کو غور سے دیکھئے تو یہ کچھ ایسا غلط معلوم نہیں ہوتا۔ ادیبوں کی فہرست میں کئی مرد آپ کو ایسے ملیں گے جن کی روح کائنات کے جنگل میں آسودگی ڈھونڈتی پھرتی ہے یا انسانی رشتوں کو توڑ کر منہ زور گھوڑے کی طرح سب کچھ پھاند جانا چاہتی ہے لیکن عورتوں کی جذباتی دنیا شخصی اور ذاتی ماحول تک ہی محدود رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادیب عورتوں نے جو رتبہ افسانہ اور ناول میں حاصل کیا ہے۔ کسی اور صنف ادب میں نہیں کر سکیں۔ معلوم ہوتا ہے فطرتِ نسوانی شخصی اور ذاتی رشتوں کے جال ہی میں الجھی رہتی ہے اور یہ جال سب سے زیادہ دلجمعی اور فراغت کے ساتھ ناول اور افسانے ہی میں بُنا جا سکتا ہے۔

شخصی رشتوں کی دنیا محدود سہی لیکن پایاب نہیں۔ اس کی گہرائیاں آفاق کی وسعتوں سے کم نہیں اس لیے یہ نہ سمجھئے کہ عورتوں کا ادب مردوں کے مقابلے میں ہمیشہ دبا دبا رہے گا۔ فطرتِ نسوانی نے پہنائی اور وسعت کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہو، عمق کو اپنے اوپر حرام نہیں کر سکتی۔

یہ خصوصیت یعنی شخصی رشتوں میں انہماک۔ آپ کو ہماری اکثر ادیب عورتوں میں ملے گی۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنی فطرت کو جھٹلاتی نہیں۔ بلکہ خلوص اور دیانتداری سے لکھتی ہے، سچ پوچھئے تو اس معاملے میں ان کا نامۂ اعمال مردوں سے زیادہ روشن ہے۔ ہمارے ہاں ادیب عورتوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں۔ لیکن شخصی اور ذاتی رشتوں کی روئداد جس جرات اور بے ساختگی کے ساتھ انہوں نے پیش کی ہے اس سے ہمارے مردانہ ادب کو بھی ریاکاری کے گھونگٹ الٹنے پڑے ہیں اور سب اردو ادب کو ان کی بدولت تازہ ہوا نصیب ہوئی ہے۔

ہاجرہ مسرور کا یہ مجموعہ تازہ ہوا کا ایک اور جھونکا ہے۔ پہلے مجموعوں میں بھی انہوں نے اپنی نسوانی فطرت ہی کو نبھایا ہے۔ یہاں بھی وہ اپنی فطرت ہی کو نبھا رہی ہیں ان کی نظر پہلے سے کہیں زیادہ بلند اور گہری ہے لیکن شخصی اور ذاتی رشتوں کے جال وہ یہاں بھی بُن رہی ہیں۔ انوکھے اور پُر اسرار جال۔

ان رشتوں کی دنیا بھی ایک حیرت انگیز دنیا ہے۔ ان میں انسان ایک دوسرے کو کھینچتے بھی ہیں اور دھکیلتے بھی ہیں اور یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک ہاتھ سے کھینچتے اور دوسرے سے دھکیلتے ہیں اور زندگی اس جال میں تنی تنی سی رہتی ہے۔ شوپن ہاور کا قول ہے کہ "انسانوں کی مثال ان خارپشتوں کی سی ہے جنہیں سردی لگ رہی، ٹھٹھرنے لگتے ہیں تو گرم ہونے کو ایک دوسرے کے قریب سرک آتے ہیں۔ کانٹے چبھتے ہیں تو ایک دوسرے سے پرے ہٹ جاتے ہیں اور پھر ٹھٹھرنے لگتے ہیں۔"

کیا آپ کو یہی نقشہ "آپ ہی کی دنیا کا ذکر ہے کہ۔۔۔۔" میں نظر نہیں آتا: اس میں شوہر اور بیوی کے درمیان ایک تناؤ اور ایک قُرب ——— ایک بَیر اور ایک کشش ہے جسے ہاجرہ نے بہت نزاکت سے بیان کیا ہے۔ اس کہانی میں ہاجرہ چھوٹے چھوٹے بے وجہ جلاپوں کو اس بے تکلفی سے جمع کرتی چلی گئی ہیں کہ تھوڑی دیر کے بعد منافرت کے اس رینگتے ہوئے سائے سے ڈر آنے لگتا ہے جس فریب خوردگی کو وہ بیان کرنے چلی تھیں۔ وہ شاید کہانی کے آخر میں ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن کوئی پڑھنے والا اس کہانی کی اٹھان ہی کو دیکھ کر افسانہ نویس کے فن کا قائل ہو جائے (کہانی کا انجام خواہ کچھ ہی ہو) تو ہاجرہ کو اس پر برہم نہ ہونا چاہیئے بلکہ اسے بھی قدر دان ہی سمجھنا چاہیئے۔

"کاروبار" بھی ایک شوہر اور بیوی کی کہانی ہے یہاں بھی بیوی کے دل میں احتجاج اور تسلیم، ملے جلے پائے جاتے ہیں اور اگر فریب خوردگی نہیں تو ایک بے بسی ضرور ہے۔ لیکن بیوی اسے ظاہر نہیں کر سکتی کیونکہ اسے ظاہر کرنا آتا بھی تو نہیں اس اُلجھاؤ کو میاں بیوی۔۔۔۔ذل

ں سے کوئی بھی ٹھیک طرح نہیں سمجھ سکتا۔ شوہر کبھی چٹکیاں لے گا کبھی بیوی کی خاموشی سے اکتا جائے گا۔ بیوی کبھی ہنس دے گی کبھی اس کے آنسو نکل آئیں گے اور ان دو ہم بستر اجنبیوں کی عمر یوں ہی ایک دوسرے سے بے خبر گزرتی چلی جائے گی۔

"ایک بچی"، کو آپ محروم ممتا کا افسانہ کہنا چاہیں تو نہ افسانہ کو اس سے انکار ہوگا نہ افسانہ نگار کو، لیکن یہاں بھی اس کے علاوہ تعلقات اور رشتوں اور ماحول کی کئی اُلجھنیں ہیں۔ جن کا حال نا بدہ (ہاجرہ سے پوچھے بغیر) ہمیں سناتی چلی جاتی ہے:

مجھے جانے کیوں دبی دبی کیفیتوں سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ گلی کے اس مکان میں رہ کر تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی کہانیوں والی شہزادی ہوں جسے اس کے باپ نے ناراض ہو کر جنگل کے قلعے میں قید کروا دیا تھا۔ میرے اندر ہی اندر کوئی اُلجھ کر جھکنے لگا۔ میری جوان جوان بہنیں اور بوڑھی ماں۔ جی میں آیا کہ سب کے پلنگ گھسیٹ کر گڈمڈ کر دوں۔ گلی میں جیسے کوئی نشے میں بہکتا ہوا گزر رہا، مست اور بے پروا، اور مجھے ایک دم احساس ہوا کہ میری بانہیں بھی تھک گئی ہیں، پانی بھرتے بھرتے نہیں، سینے پر بے کار پڑے پڑے پہلو میں بے قدری سے رکھے رکھے اور سر پہ ہالہ بناتے بناتے۔"

ایسے جال ہاجرہ بہت ہی پھرتی اور بے تکلفی سے بُن لیتی ہیں تار تار کھول کے دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے، کتنی گتھیاں تھیں اس جال میں، نہ معلوم ہاجرہ نے بُننے سے پہلے انہیں اپنے دماغ میں کیوں کر سلجھایا ہوگا۔ اور دھاگوں کے سب پیچ کیوں کر یاد رہے ہوں گے۔ اس سلیقے کی اصل قدر کوئی مشاق افسانہ نگار ہی کر سکتا ہے وہی آپ کو بتائے گا کہ یہ کام کتنا مشکل ہے اور ہاجرہ نے اپنے تخلیقی جذبے کی بدولت اسے اپنے لئے کتنا سہل بنا لیا ہے۔

اس مجموعے میں کم از کم دو کہانیاں ــــ "سرگوشیاں" اور "لا علاج" ــــ ایسی ہیں کہ ہمارے جدید ادب کو ان پر فخر کرنا چاہیئے۔ دونوں کا اسلوب ایک دوسرے سے جدا ہے۔

"سرگوشیاں"، ایک کردار کی مسلسل تقریر ہے جو اپنی تیز رو میں ماضی کی باتیں بہا بہا کر ہمارے سامنے لاتی چلی جاتی ہے۔ بخار کی سی تیز گفتاری نے کہانی میں ایک بے پناہ قوت، شدت اور حرارت پیدا کر دی ہے۔ جو ہر پیراگراف کے ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ کہانی کا خطیبانہ انداز شروع میں کھلتا ہے۔ جیسے کوئی "شیر آیا شیر آیا دوڑنا" پکار کر ہمیں ڈرانے کی کوشش کر رہا ہو لیکن جب گیتا کی گزشتہ زندگی کے اوراق ایک ایک کر کے الٹنے لگتے ہیں۔ تو گہرائیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں اور رقت بسا اوقات دہشت کے کنارے تک جا پہنچتی ہے۔ یہ خطابت کا انداز خطرات سے پُر ہے لیکن آفریں کہ ہاجرہ نے باوجود ڈرامائی طمطراق کے کہانی میں کہیں بھی کھوٹ نہیں آنے دی۔ "لا علاج" میں ایک دادی ہے ایک پوتی۔ دونوں میں سے جسے چاہیں آپ کہانی کا محور سمجھ لیں۔ بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاجرہ نے یہ کہانی پوتی کو سامنے بٹھا کر لکھی ہے لیکن مجھے تو پوتی بھی دادی ہی کی طویل اُلجھی ہوئی زندگی میں ایک اُلجھن معلوم ہوتی ہے۔ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کے بکھرے ہوئے زندگی کے ٹکڑوں کو ہاجرہ نے ایک مختصر افسانے کی حدود کے اندر اس خوبی اور حسنِ انتخاب سے سمیٹا ہے کہ اس کی مثال اردو میں مشکل سے ملے گی۔ اگر اُردو میں کوئی کہانی اپنی تکمیل، اصلیت اور حساسی کے اعتبار سے اس رتبے کو پہنچتی ہے تو وہ کم از کم میری نظر سے اب تک نہیں گزری۔ اس افسانے میں بڑھیا کریمن کی بھائیں بھائیں کرتی تنہائی کو دیکھ کر مجھے ایک اور ناول نگار عورت کا ایک کردار یاد آیا جو کریمن ہی کی طرح عمر بھر انسانی رشتوں کا محتاج رہا اور یہی رشتے ایک ایک کر کے اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چلے گئے:۔

"اس کی روح ایسی ویران اور اجاڑ تھی، کہ اس ویرانی کے مقابلے میں بیرونی ماحول کی کوئی حقیقت ہی معلوم نہ ہوتی تھی۔ تنہائی نے دل میں اپنے پنجے گاڑ دیئے اور ایسے معلوم ہوا جیسے سن وسال کی ایک منہ زور ندی ہے کہ بہے چلی جاتی ہے اور یہ اس کی سطح پر جڑ سے اکھڑے ہوئے درخت

کی مانند ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ جڑ اکھڑ چکی اور زندگی کو نہ جانے کس وقت کوئی پھونک مار کر بجھا دے سکنے کو زندہ ہے لیکن ایک طوفانی سطح پر بے اختیار بہے چلی جاتی ہے آس پاس کوئی ایسی چیز نہیں جسے کمزور انگلیاں پکڑ سکیں۔ پیشتر اس کے کہ منہ پھاڑتی ہوئی لہریں اسے نگل جائیں۔۔۔۔۔"

ہاجرہ ہمارے کئی افسانہ نگاروں سے زیادہ حساس اور نازک ہیں ہیں ان کی نظر دور تک پہنچتی ہے اور ان کے افسانوں میں اکثر گہرائیاں ایسی آجاتی ہیں جو اور افسانہ نگاروں میں نہیں ملتیں۔ ان کی یہ ادا بھی حساسی سے خالی نہیں کہ ان کے کم از کم تین افسانے حال سے ماضی کی طرف چلتے ہیں۔ جب کوئی انسانی الجھاؤ انہیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ تو ان کا ذہن ٹٹولنا شروع ہوا۔ یہ تجسس حساسی کی ہی ایک انوٹ کا نام ہے۔ یہی انہیں ماضی کی طرف لے جاتا ہے کیونکہ الجھے ہوئے دھاگوں کے سرے تو اکثر ماضی ہی میں ملتے ہیں ذاتی رشتوں میں جنس کا رشتہ سب سے زیادہ پیچدار ہوتا ہے۔ جنس کا پیڑ ایک ایسا پیڑ ہے۔ جس میں لاکھوں قسم کے کڑوے، میٹھے، کھٹے پھل لگتے ہیں اور کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ جو لسے بوئے گا وہ کیا کاٹے گا۔ اس کی جڑیں دل اور دماغ اور اعصاب. ورگوشت میں نہ معلوم کہاں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جس نے جہاں تک چیر کر دیکھا۔ نئی سے نئی جڑ نظر آئی۔ ہاجرہ کے کرداروں کا جنسی شعور جسمانی مظاہر سے بہت آگے نکل جاتا ہے۔ اور ہاجرہ کے احساس میں کئی نزاکتیں اور پیچیدگیاں ہیں۔ جن کی وجہ سے ان کے جنسی افسانے اوروں سے زیادہ دقیق اور عمیق معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے جنسی تعلقات میں تنوع اوروں سے زیادہ ہے اور ان تعلقات کی رنگینیں بھی زیادہ لطیف اور نگاہ فریب ہیں۔

ہماری عورتیں اپنی خلوت شعاری کی وجہ سے روایتی اور مصنوعی "ادبی" زبان سے بہت حد تک مامون رہی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے جب لکھنا شروع کیا تو بلتے جاگتے الفاظ

کے سوا ان کے قلم سے کچھ نہ نکلا۔ ہاجرہ کی زبان بھی جیتی جاگتی زبان ہے جو سیدھی مطلب کی طرف لپکتی ہے بے ساختہ پن اکر اپنی طرف دیکھتی نہیں رہتی اور اس الھڑپن کی وجہ سے بے تکان وہ باتیں کہہ جاتی ہے جو مصنوعی ادبی زبان سے منشیانہ گلے میں اٹک کر رہ جائیں یا بڑے تکلف سے ادا ہوئیں۔

لیکن الفاظ کا ذخیرہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو کہنے کی باتیں بہرحال ان گنت ہوتی ہیں۔ اور لفظ اکثر ہار ہار کر بیٹھ جاتے ہیں اسی لئے ادیبوں کو بار بار استعاروں اور تشبیہوں سے کام لینا پڑتا ہے اور بالخصوص ان کی ژرف نگاہی کا پتہ ان کی تشبیہوں ہی سے چلتا ہے کہئے تو ہاجرہ کی تشبیہوں پر ایک نظر ڈال لیں؛

"کوئی ساتھ رونے والا ہو تو اپنے آنسو گالوں پہ چنگاری بن کہ نہیں ڈھلکتے"

"لگاوٹ بھی کہیں چھپتی ہے؟ جامن چاہے کہیں بھی چھپا کہ کھائی جائے۔ کم بخت منہ کی اودراہٹ چغلی کھا دیتی ہے"

"آپا کی آنکھیں کیا تھیں۔ بس ڈگڈگی تھیں کہ سب بندر کی طرح اس کے گرد ناچتے۔"

"سبھی نقطے مطلب کے نہیں ہوتے۔ قلم روشنائی میں ڈبو کر لکھنے بیٹھو اور سخت نب پہ زور دے کر کھینچو تو یونہی کتنے ہی بے معنی نقطے کاغذ پہ پھیل جاتے ہیں۔"

"محبت مکڑی کا ایک ایسا جالا ہے جو اگر کونوں کھدروں میں گھسنے پہ جسم سے لپٹ جائے تو چھڑانے کے باوجود کہیں نہ کہیں ذرا بہت چپکا ہی رہ جاتا ہے۔"

"تم کہنا چاہتی تھی کہ تمہیں جو کچھ دیا گیا ہے یہ تو صرف اتنا ہے جیسے کسی کو تحفہ میں بغیر دینے کی کاٹھ پکڑا دی جائے۔"

"تم تو ایسی ٹھنڈی نظر آ رہی ہو جیسے کسی بنگالی قحط زدہ کا چولہا۔"

"اس کے احسات پر جیسے سڑا ہوا آم نچڑ رہا تھا۔ گھناؤنا اور کڑوا رس ٹپ ٹپ گر رہا تھا۔ وہ کوئی بڑا زہریلا جواب دینا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے ذہن کے سیّال زہر کا کھولاؤ ہر ڈھلتے ہوئے فقروں کو بھنور میں پڑی ہوئی سیپ کی طرح نچا ڈالتا۔۔۔۔"

"یہ کتنے مزے کی بات ہے کہ جن لڑکیوں کے لئے فساد ہوتے ہیں۔ وہی چند روز بعد ایسی فضول ہو جاتی ہیں جیسے ناراضگی کا چھلکا۔۔۔۔"

"کتنی مشکل سے تو انہیں بات کرنے کا ایک موضوع ملا تھا۔ لیکن انہوں نے ایک دوسرے پر تیزاب پھینکنے کی کوشش میں اسے بھی ختم کر دیا۔۔۔۔"

"مگر وہ دونوں اس سے محفوظ ہونے کا خیال نہیں کر سکتے تھے۔ جیسے دونوں کی زندگی میں سوائے نیم کے کچھ پھولتا ہی نہ ہو۔۔۔۔"

"وہ اس کی نظر سے دور ہوتے ہی اپنی ہستی کو ایسا بے بس اور دردناک محسوس کرنے لگی۔ جیسے جیٹھ بیساکھ میں ریت کے پہلوؤں میں دبی ہوئی گنگا۔۔۔"

"شادی کے بعد ایک سال ایسا گزرا جیسے کوئی ننھی چڑیا چہکتے چہکتے ایک درخت سے دوسرے پر جا بیٹھے۔"

"جتنی لمبی عمر ہو، اتنی ہی لمبی الجھنیں۔ سوئی میں لمبا تاگا ڈال کر سینے بیٹھو تو بار بار گتھیاں پڑ جاتی ہیں۔۔۔۔"

ماننا پڑے گا کہ ہاجرہ کی تشبیہیں بیشتر انوکھی اور جذبے یا خیال کے ساتھ ہی بے تکلف ان کے ذہن میں چلی آئی ہیں۔ جس ادیب کو اپنی سوچی ہوئی، اپنی دیکھی ہوئی، اپنی بیتی ہوئی کہنی ہو اس کا کام گھڑی گھڑائی تشبیہوں سے کیوں کر چل سکتا ہے اور جو گھڑی گھڑائی استعمال کرتے ہیں وہ اپنے دل کی بات کیونکر کہہ پاتے ہوں گے۔

اس مجموعے میں ایک آدھ مضمون ایسا بھی ہے جسے شاید افسانہ نہ کہہ سکیں۔ میرا بس چلتا تو اس کی جگہ بھی ہاجرہ کو افسانہ ہی لکھنے پر مجبور کرتا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ایسے جبر کی ضرورت آئندہ کبھی پیش نہ آئے گی ان کی طبیعت کا اصلی جوہر جو ان کے تین مجموعوں میں چمکا ہے۔ انہیں خود افسانہ لکھنے پر مجبور کرے گا اور انہیں افسانہ لکھے بغیر چین نہ آئے گا۔

جب تک ان کا چوتھا مجموعہ نہ چھپے، ہمیں بھی چین نہ آئے گا۔

"پطرس"

چمپا اور دوسرے افسانے

دیباچہ

(مولانا عبدالمجید خاں) سالک (بٹالوی) کے ہاتھ آج ہتھکڑی میں بند ہیں اور صفحۂ قرطاس اس کی سحر نگاری سے محروم۔ لیکن چہرہ فطرت کے جو خال اس کی قلم طرازی کے ممنون احسان ہیں وہ ہمیشہ چشم امتیاز کی پتلی بنے رہیں گے۔

یہ انتخاب بہت عجلت سے مرتب کیا گیا ہے کہ جب تک زندان کی چار دیواری سالک کو اہلِ نظر سے پوشیدہ رکھے۔ سالک کے شیدائی اس کے روشن دل کی ضیا پاشی سے محروم نہ رہیں۔ اگر وہ "گمنام" گمنامی کا شیدا۔ وہ عزلت نشینِ محشر۔ وہ انجمنِ خلوت، اس وقت حراست و بند سے آزاد ہوتا۔ تو یقین نہیں کہ وہ اپنی "گمنامی" کے نقاب کو یوں چاک چاک دیکھنا گوارا کر سکتا۔ کیونکہ اس کی نقادانہ نظر اور نگاہ انتخاب کچھ بین اور نکتہ چیں ثابت ہوتی — ایک وقت اور صرف ایک وقت — جب وہ اپنی بیش بہا تصنیفات کو کھول کر اپنے سامنے میز پر رکھ لیتا۔

وہ شخص جو ادبِ لطیف کے خیاباں سے منہ موڑ کر صحافت کی سنگلاخ زمین اور سیاسیات کے خارزار میں گامزن ہوا۔ جذبۂ وفا کو ہمیشہ اپنے سینے میں لئے پھرا۔ گلزار و گل گشت میں بھی رنگ و بو تھا۔ بادیۂ دشت میں آج بھی اس کی آبلہ پائی ہے اس سے اہلِ مذاق برسوں لطف اندوز ہوتے رہے اور اس سے اہلِ درد آج اشک ریز و غمزدہ ہیں۔

افسانہ نگاری میں وفا کو وہ ہمیشہ عشق کی دلہن، سمجھتا رہا اور عورت کے دل کو خواہ وہ "فلورا پارکنسن" ہی کیوں نہ ہو، اس کا حجلۂ عروسی۔ اس کی "چمپا" نے اپنے سوامی کے قدموں میں جان دی۔ اس کی "عذرا" کی وفا حسد اور رشک کو پامال کر گئی "بھولا" کی آہ و زاری نے دیوتاؤں کے دل ہلا دیئے اور "موہنی" کے عشق کا شعلہ اب تک رات کی ہیبت اور تاریکی میں ہمالہ کی برفانی چوٹیوں پر روشن نظر آتا ہے۔

ہمارے شعر و سخن کے آئینے میں عشق کو اپنا چہرہ اکثر دیوانوں کا سا نظر آتا ہے یہاں تک کہ عشق جنون کو اپنا ایک دوسرا نام سمجھتا ہے "سدا بہار ٹاپو کا ہندی" میں عکس در معکوس۔ اسم اور مسمیٰ دونوں سامنے کھڑے ہیں اور جو نظر فریب نظارہ ہمارے پیش نگاہ ہے وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم ماتھے پر تیوری چڑھائے ایک نقادانہ اور مربیانہ انداز میں کھڑے ہو کر اس پر تبصرہ کریں۔ ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اپنے حواس کو محویت میں گم کر دیں اور کتاب کو اپنے بے جان ہاتھ سے گر پڑنے دیں۔

سالک کی تحریر سازِ دل میں ضرور کوئی نہ کوئی تار ایسا چھیڑ جاتی ہے جو نغمے کے خاموش ہو جانے کے بعد بھی تھرتھراتا رہتا ہے اور بارہا میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ایسے تار بھی ہیں جن کو مضراب نے نہیں چھوا۔ پھر بھی ہم آہنگ ہیں اور کانپ رہے ہیں "بھولا" ایک چھوٹا سا قصہ ہے لیکن "بھولا" کو جیسے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو سالک نے مجھ سے کبھی نہیں کہا۔ لیکن مجھے اس وفا شعار ہندو دوشیزہ اس عصمت و عفت کی دیوی کے ماتھے پر تلک کا ٹیکہ نظر آتا رہتا ہے "ارشاد" کی کشتی "دیکھتے ہی دیکھتے نیلے افق میں غائب ہو گئی" ہے لیکن اس کے چہرے پر عشق کی دل دوز وحشت اب تک ہنس رہی ہے۔

سالک کو انتہائی جذبات کا بہت شوق ہے۔ تہذیب و تمدن کے دائرے کے اندر، لاہور اور بمبئی کے خوشنما بنگلوں میں اس نے جذبات کو پا بجولاں دیکھا تو انہیں "سدا بہار ٹاپو" میں دلدلوں اور سرکنڈے کے جھنڈوں کے بیچ میں لے کر ان کی عریانی، مستی اور پاکیزگی کو آزاد

چھوڑ دیا۔ جہاں مرد صرف مرد اور عورت صرف عورت ہوتی ہے۔ جہاں کے طوفان سخت بلاخیز ہیں اور درندے سخت خونخوار۔

لیکن سالک کا دل حیات کی نزاکتوں اور جذبات کی لطافتوں سے ناآشنا نہیں۔ اس کے سینے میں بے شمار ہلکے ہلکے درد اور ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھتی ہیں۔ مگر غضب یہ ہے کہ وہ آفات و مصائب کو دلیرانہ برداشت کرنے والا جوانمرد اس شعریت کو اپنی فطرت کی کمزوری سمجھتا ہے "ہلال عید" جو اس کے قلم کی بے ساختگی اور بے تکلفی اور اس کی طبیعت کی نازکی کا بہترین نمونہ ہے۔ ایک سرگوشی ہے جو کبھی بلند آہنگ نہیں ہوئی۔

میں یہ کہہ دیتا کہ سالک بارہا ایک لفظ سے وہ کام لیتا ہے جس کے سرانجام دینے میں ہندوستان کے اکثر انشاپردازوں کے لمبے لمبے فقرے ناکام رہے ہیں۔ الفاظ میں وہ موسیقی اور شیرینی بھر دیتا ہے جو صورت کو معنی سے زیادہ دلاویز بنا دیتی ہے لیکن مجھے اس کے لئے سالک کی "پھترا" کا ذکر کرنا پڑے گا اور وہ اس ادیب سحر طراز اس شاعر شیریں مقال، اس آئینہ دار تگیو کے ذوق سخن کا ایک دوسرا پہلو ہے۔

میری یہ ہذیان تحریری سالک کی کافرماجرائی کے ہم کاب ہے۔ اس لئے میں محسوس کرتا ہوں کہ حیات ابدی کا دامن میرے ہاتھوں میں ہے مجھے اس کی کبھی جرات نہ ہوتی اگر مجھے فخر حاصل نہ ہوتا کہ میرے نیاز مخلصانہ نے تبسم حوصلہ افزا کو اکثر سالک کے لبوں پر کھیلتے ہوئے دیکھا ہے۔

آج وہ حراست میں ہے اور شاید اب بھی مسکرا رہا ہے۔ خدا کرے آنکھیں پھر اس مسکراہٹ کو دیکھیں۔

"پطرس"   ۱۹۲۲ء

جھولنے

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کی کتاب کا دیباچہ

ایسی ہلکی پھلکی کتاب پر جو چھوٹے بچوں کے لئے لکھی گئی ہے دیباچہ کا بوجھ نہ پڑنا چاہیئے تھا۔ لیکن بچوں کے ساتھ قدرت نے والدین کی اور انسان نے استاد کی بیخ بھی لگا رکھی ہے۔ صوفی تبسم کو جو مصنف کتاب ہونے کے علاوہ "والدین" بھی ہیں اور "استاد" بھی، یہ گوارا نہ ہوا کہ بچوں کو تو بہلا جائے اور والدین اور استادوں کی پروا نہ کی جائے اس لئے قرار پایا کہ وہ بچوں کو نظمیں سنائیں اور میں والدین وغیرہ کو باتوں میں لگائے رکھوں۔

بچوں کا بہلانا سہل ہے۔ بڑوں کا بہلانا سہل نہیں۔ بچوں نے تو یہ پڑھا کہ "چیچوں چیچوں چاچا گھڑی پہ چوہا ناچا" اور خوش ہوئے۔ بڑے کہیں گے چیچوں ہم نے تو کسی لغت میں دیکھا نہیں۔ اور اگر چاچا سے مراد چچا ہے تو یہ شائستہ لوگوں کی زبان نہیں اور یہ جو گھڑی پہ چوہا ناچا تو آخر کیوں؟ اور بہرحال اس تک بندی کا نتیجہ کیا؟ اس سے بچوں کو کون سا سبق حاصل ہوا؟

یہ سب سوال نہایت ہی ذمہ دارانہ سوال ہیں۔ بالفاظ دیگر ان لوگوں کے سوال ہیں جو اپنا بچپن بھلا بیٹھے ہیں۔ یا جو یہ تہیہ کئے بیٹھے ہیں کہ جن باتوں سے ان کا بچپن رنگین ہوا تھا۔ وہ اس دنیا میں اب نہ دہرائی جائیں گی۔ تک بندی ملانا بے فائدہ بات ہے بوجھوں مانا چاہیئے۔

خدا کا شکر ہے، صوفی تبسم کو ایک ایسی دانائی عطا ہوئی ہے کہ نادانی کی لذت سے ابھی محروم نہیں ہوئے وہ جانتے ہیں کہ بچوں کا ذہن وہ عجیب و غریب دنیا ہے جن میں پڑوں

پر ناگ ناچتے ہیں اور ملیاں پیر کھاتی ہیں اور بڑے موٹے چھم چھم ٹم ٹم میں آہنگ اور لے کی وہ تمام لذتیں سما جاتی ہیں جو بڑے ہو کر تان سین کی کرامات سے بھی حاصل نہیں ہوتیں یہ وہ دنیا ہے۔ جس میں گڑیاں اور جانور اور پرندے اور انسان سب ایک دوسرے کے دوست ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ گویا سب مخلوق ایک ہی خدا کی مخلوق ہوتی ہے بڑے ہو کر ذہن انسانی ہزار فلسفیانہ کشمکش اور خیال آفرینی کے بعد بھی مشکل سے اس سطح پہ پہنچتا ہے۔

اس لئے قابلِ رشک ہیں صوفی تبسم کہ بلا تکلف اس رنگین دنیا میں چہچہا رہے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ صوفی تبسم ایک خوش ذوقِ سخن سنج اور سخن گو ہیں۔ اردو فارسی غزل استادانہ کہتے ہیں۔ اور جذبے اور ادا کی باریکیوں کو خوب سمجھتے ہیں یہ مجموعہ ان کی شاعری میں اتوار کا دن ہے اور یوں اتوار منانے میں انہوں نے بڑے بڑے اساتذہ تتبع کیا ہے لیکن یہ نہ سمجھئے کہ اس دن وہ بالکل ہی خالی الذہن ہو کر بیٹھتے ہیں اور جو منہ میں آئے کہہ ڈالتے ہیں۔ غور سے دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ یہ تمام قافیے اور وزن اور آہنگ اور الفاظ کی نزاکتوں پہ قادر ہوئے بغیر ممکن نہ تھا۔ اس لئے صوفی تبسم کی پختہ کاری اور طباعی کے شواہد اس میں بار بار آپ کو نظر آئیں گے۔ ایسے کلام کا درجہ سہل ممتنع کا درجہ ہے۔ جیسے سہل ممتنع سہل نہیں ہوتا۔ اسی طرح سہل ممتنع بھی سہل نہیں ہوتا دعا ہے کہ صوفی تبسم کا یہ بچپن ہمیشہ قائم رہے اور ان کے قدردان ہمیشہ انہیں یہ کہنے کے قابل ہوں کہ

چہل سال عمرِ عزیزت گذشت
مزاجِ تو از حالِ طفلی نگشت

"پطرس"

دہلی ۵ رجون ۱۹۴۶ء

ایران میں اجنبی

ن۔ م۔ راشد کی نظموں کے دوسرے مجموعہ کی تمہید

راشد صاحب! یہ مجموعہ جب چھپ جائے گا تو آپ ایک نسخہ مجھے مفت بھیجیں گے۔ بلکہ اس پہ میرا نام بھی اپنے قلم سے لکھ دیں گے اور میں فخر سے لوگوں کو دکھاتا پھروں گا اور اسے بلا وجہ اپنا ہی کمال سمجھوں گا کہ میرا ایک شاگرد اردو کے دورِ حاضر کا بہت بڑا شاعر ہوا اور میری اس کمزوری پر کہ خواہ مخواہ آپ کی شاعری پہ اپنا حق جتا رہا ہوں ہنسیں گے بھی اور اسے ضعف المدرسین سمجھ کر معاف بھی کر دیں گے لیکن یہ تو آپ نے مجھ پہ بہت بڑا احسان کیا کہ قبل از وقت اس کتاب کے پروف مجھے پڑھنے کو دیئے آپ کو معلوم ہے کہ میں انہیں کس شوق کے ساتھ یو۔ این کی غلام گردشوں میں اٹھائے اٹھائے پھرا ہوں کہ ع

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

اور ان کو بیچ میں لا کر دزدیدہ اوقات میں آپ سے کیسی مزے مزے کی بحثیں یو۔ این کے کیفے ٹیریا میں ہوئی ہیں اور ہم آپ نے آپ کی شاعری کو سمجھانے سمجھنے کے بہانے سے اردو سے کتنی عشق بازی کی ہے۔ اجازت ہو تو آپ کے نام ایک مکتوب بھی اس عاشقی میں لکھ ڈالوں اور آپ سے مجھے جو محبت ہے اس کا عیب پوش رنگین پردہ اپنی بے سود نقادی پہ ڈال لوں۔ تاکہ کوئی بات میرے پاس کہنے کے قابل نہ ہو اسے لوگ سننے کے قابل ضرور سمجھیں۔

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

راشد صاحب! وہ دن آپ کو یاد ہے جب آپ کی نظم "اتفاقات" شائع ہوئی تھی۔ اور میں آپ کے گھر پر قلعہ گوجر سنگھ میں والہانہ آپ کو مبارک باد دینے آیا تھا۔ ان دنوں ابھی جدید شعراء پر لعن طعن برابر ہو رہی تھی اور ان کی "قافیہ آزادی اور عروض کی بے راہ روی" پر پھبتیاں کسی جاتی تھیں۔ لیکن آج یہ کیفیت ہے کہ لوگ پرانی وضع کی شاعری سے اکتاتے جا رہے ہیں۔ حتٰی کہ غزل بھی جب تک نئے شباب، نئی نظر اور نئے اسلوب کی حامل نہ ہو بزم میں توقیر نہیں پاتی۔

اس انقلاب میں کئی قوتوں کا ہاتھ ہے جسے مورخ اپنے مقام پر بیان کرے گا۔ لیکن جن لوگوں کو آپ کے ہم عصر ہونے کا فخر حاصل ہے وہ جانتے ہیں کہ دورِ جدید کے اکثر شعراء نے آپ اور فیض اور آپ ہی جیسے معدودے چند باغیوں سے ہدایت پائی ہے۔ ورنہ نہ معلوم ہماری شاعری کی کشتی اور کتنا عرصہ دلدل میں پھنسی رہتی۔ جیساکہ آپ نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے آپ لوگوں کی تربیت میں نئے نئے علوم کو دخل تھا جس سے متقدمین بے بہرہ تھے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ دورِ جدید کے ذہنی اور معاشرتی طوفانوں اور زلزلوں کی بدولت آپ کو ایک نئی بینش نصیب ہوئی اور آپ لوگوں نے وہ افق دیکھے جو اس سے قبل نظروں سے اوجھل تھے۔ ناممکن تھا کہ آپ کی شاعری ایک نیا اندازِ فکر اور نئی زبان بلکہ نیا لہجہ (بقول آپ کے نئی ہیئت) اپنے ساتھ نہ لاتی۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی طفیل کتنے نوخیز شاعروں کی ہمت بڑھی بلکہ راشد کے اسلوب بیان میں تو کچھ ایسا نشہ ہے کہ ان کے بعض معتقدین کچھ زیادہ ہی پی گئے۔ یہ جاذبیت بلکہ جادو فیض میں بھی ہے۔ لیکن فیض کی کئی ادائیں فضائے تغزل میں حلول کر جاتی ہیں۔ ہر پتے اور ہر پھول میں نظر نہیں آتیں۔ اس کے مقابلے میں آپ کا چسکا نوجوان شاعر کو بہت جلد پڑ جاتا ہے اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بزم میں شمع پہلے کس کے سامنے

رکھی جائے۔ اس قسم کا سابقہ ہی مقصود تھا۔ اس سے تو محض یہ واضح کرنا تھا کہ آپ سے جدید شعراء جو اثر پذیر ہوئے تو ان کے اور آپ کے تصرفاتِ نظر کے مابین کیا علاقہ تھا۔

ایران میں اجنبی کا عنوان ایک دلچسپ فریب ہے جس کے آپ خود بھی شکار ہوئے۔ اس عنوان کے تحت میں جو تیرہ قطعے آپ نے یک جا کر دیئے ہیں۔ ان میں اس جذبے کا سراغ کہیں نہیں ملتا جسے عزیز لکھنوی نے ایک مطلع میں یوں بیان کیا ہے ؎

دیکھ کر ہر در و دیوار کا حیراں ہونا
وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا

(داخلِ ایراں ہونا؟) ہر چند کہ ایران آپ کا جغرافیائی وطن نہیں اور تہران اور لاہور کا فرق و بُعد ظاہر ہے تاہم جس ذہنی اور جذباتی دنیا میں آپ کی شاعری باغ لگاتی ہے اور ایران سے دور نہیں بلکہ وہ تو ہندوستان سے دور تر ہوگی۔ سعدی اور حافظ اور خیام اور رومی اور نظیری کی دنیا میں آپ اجنبی کیوں کر ہو سکتے ہیں؟ ایران تو ہمارے شعراء کا رضاعی وطن ہے۔ ہندوستان میں جو پردیسیوں کی سی اداسی ذہن پر چھائی رہتی ہے وہ اسے ایران (اور عربستان) کی ذہنی یا جسمانی سیاحت سے دور کرتے تھے۔ آپ کے قطعات اس بات کے گواہ ہیں کہ آپ کو ایران میں بیگانگی کا نہیں بلکہ ایک نئی یگانگت کا احساس ہوا۔ "من و سلوے" میں تو آپ ایران سے در پردہ یہی کہہ رہے ہیں کہ میں اجنبی نظر آتا ہوں اجنبی ہوں نہیں ؎

بس ایک ہی عنکبوت کا جال ہے کہ جس میں
ہم ایشیائی اسیر ہو کر تڑپ رہے ہیں

اور پھر زبان بھی آپ کے رضاعی بھائی کی زبان ہے اجنبی کی نہیں —

خدائے برتر
یہ داریوشِ بزرگ کی سرزمیں

یہ نوشیروانِ عادل کی دادگاہیں
تصوّف و حکمت و ادب کے نگارخانے

آپ کے قلم نے تو آپ کے لئے ایران میں اجنبی کا لقب انتخاب کیا لیکن آپ کا دل پکار پکار کر یہی کہہ رہا ہے کہ میں ایک عجمی ہوں اور "جانِ عجم" سے ملنے آیا ہوں۔

یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ جب آپ انگریز کی وردی پہن کر ایران پہنچے تو ماحول نے کچھ اس طرح آپ کا دامن کھینچا اور ماضی کی یادوں نے آپ کے دل پر کچھ ایسی دستک دی کہ آپ ہندوستان اور انگریز دونوں کو بھول گئے اور آپ کے "سیاہ فام" جسم میں ایشیائی روح بیدار ہوئی۔ وہ احساسِ مظلومیت جس سے کم ہی کوئی ہندی ناآشنا تھا اس میں ایک نئی کسک پیدا ہوئی اور غیر کے بے پناہ بھرے ہوئے "ستم" نے ایک نئے انداز سے آپ کو بھر ادیا۔ ایشیائیوں کو آپ نے دیکھا کہ ——

قدیم خواجہ سراؤں کی اک نژادِ کاہل ہیں
اور اپنی اجل کی راہوں پہ تیز گامی سے جا رہے ہیں

تو آپ بےقرار ہو کر للکارے ——

ان اونچے درخشندہ شہروں کی
کوتہ فصیلوں کو مضبوط کر لو!
ہر اک برج و بارو پر اپنے نگہبان چڑھا دو!
گھروں میں ہوا کے سوا
سب صداؤں کی شمعیں بجھا دو!
کہ باہر فصیلوں کے نیچے
کئی دن سے رہزن ہیں خیمہ فگن

ایسے چونکا دینے والے اشعار آپ کے مجموعہ میں کتنی جگہ ملتے ہیں۔ ہمارے ہاں وطنی

شاعر بھی ہوئے ہیں اور قومی شاعر بھی، اخلاقی بھی، اور اشتراکی بھی لیکن جہاں تک میری نگاہ پہنچتی ہے ایشیائی شاعر آپ کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔

کیا یہ احساس ایک قسم کا سیاسی احساس ہے؟ کیا یہ کہنا کافی ہے کہ اس دور میں راشدؔ نے سیاسیات کا رُخ کیا؟ کیا آپ کی اس نوع کی نظمیں سیاسی کہلائیں گی؟ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا تسمیہ قوالِ مکتب کے سوا کسی کو پسند نہ آئے گا۔ آپ کا شمار "سیاسی شاعروں" میں کرنا کور ذوقی معلوم ہوتی ہے کسی نازک مزاج کی اس سے تشفی ہرگز نہ ہوگی کیونکہ اکثر مقام ایسے ہیں جہاں ہر چند کہ آپ سیاست کے نردبان پر کھڑے دکھائی دیتے ہیں لیکن آپ کی نظر اونچی بلندیوں پر پڑ رہی ہے اور روح کی بعض گہرائیاں آپ کو ایسی نظر آتی ہیں، جو محض سیاسیات کی نسبت سے عمیق تر ہیں۔ مثال کے طور پر "کیمیاگر" کو لیجئے جو بظاہر ایرانی سیاست کے ایک دور کا مرقع ہے۔ شروع شروع میں تو اس نظم کا منظر واضح اور سطحی معلوم ہوتا ہے لیکن پارہ بہ پارہ نظم کی حرارت بڑھتی جاتی ہے۔ بات آمریت اور آمر سے شروع ہوئی تھی لیکن ذیل کے اشعار ایسی خود بینی کا المیہ ہیں جو اپنی سزا اپنے ساتھ لاتی ہے اور جس کی گرفت جنوں کی سی گرفت ہے ——

مگر وہ تیری حد سے گزری ہوئی رازداری
کہ جس نے تجھے
اپنے افکار کے قید خانے میں
محصور سا کر دیا تھا
وہ زنداں جہاں گھوم پھر کر نگاہیں
فقط اپنا چہرہ دکھاتی تھیں تجھ کو
جہاں ہر عقیدے کو تو
اپنے الہام کے شیشہ گر میں دیکھتا ہے۔

جہاں ایک چھوٹا سا روزن بھی ایسا نہ تھا

جس میں ملتن کے افکار کی اک کرن کا گزر ہو

اسی کا نتیجہ کہ اک روز

کہنے کو باتیں بہت تھیں

مگر سننے والے کہیں بھی نہ تھے

اور تم بھی تو کر ہو گئے تھے

اس نظم کو سیاسی کہہ کے ٹال دینا محض کسلِ مذاق ہے یہ تو ایک مرثیہ ہے جو آپ نے خود پسند انسانوں پر لکھا ہے جو خود ہی اپنے زندانی ہو جاتے ہیں۔ اس ہول کا نقشہ جو انتہائی نخوت کی انتہائی سزا ہے۔

آپ کے نیاز مند پہلے بھی اس بات سے بے خبر نہ تھے اور اب تو اس مجموعے نے دوبارہ اس کی تصدیق کر دی۔ کہ آپ کا مزاج شاعری بہت حد تک شوکت و شدت سے رنگ پکڑتا ہے ایک کو الفاظ پر محمول سمجھیے دوسری کو جذبات پر۔ گو الفاظ و جذبات کی یہ تمیز محض بغرض سہولت ہے اس پر بہت بوجھ ڈالنا نہ چاہیے۔ پہلے شوکت کو لیجیے۔ ان اساتذہ کو چھوڑ کر جو علم زبان کے ماہر بھی تھے اور شعر میں اس سے گریز بھی نہ کرتے تھے (بلکہ افسوس کہ بعض اوقات اسی کو شاعری کے لئے کافی سمجھتے تھے) ہمارے بیشتر شعراء خصوصاً پنجاب کے اردو شعراء کے ہاں میلکین اور گھریلو الفاظ ملتے ہیں، وہ شعر کہتے نہیں سجاتے ہیں اور اس مقصد کے لئے اکثر اپنے لغت کو ایران اور عربستان کا جبۂ و دستار پہنا دیتے ہیں۔ سرنگوں بات بھی ہو تو اسے "سرنگوں" لکھ کر اس میں کر و فر پیدا کر لیتے ہیں۔ سالہا سال میں یہ شعر جھوم جھوم کے پڑھتا رہا ہے

کبھی قبلہ رو جو کھڑا ہوا تو حرم سے آنے لگی صدا

ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

مگر ڈھونڈتا رہا کہ اس میں عجز و ندامت کہاں ہے۔ رفتہ رفتہ احساس ہوا کہ عجز جتنا بھی تھا اس سے لغت کا طنطنہ کہیں بڑھ کر ہے الفاظ ایسے دل کش ہیں کہ معنی تک نہیں پہنچنے دیتے۔ ہمارے جدید شعراء اس بارے میں اکثر قدامت پسند ہیں۔ لغت میں کوئی جدت دکھانے بھی ہیں تو بس اتنی کہ ولایتِ ایران سے چند اور الفاظ بطور سوغات کے لے آتے ہیں یا اگلے سال کے فارسی الفاظ کو نئی ترکیب سے شعر میں جڑ دیتے ہیں۔ الفاظ کے بارے میں وہ ابھی تک ذات پات کے قائل ہیں کہ جو شودر ہوا وہ کبھی برہمن کی برابری نہیں کر سکتا اور جس لفظ کی قسمت میں نثر کی خدمت لکھا ہے اس کی رسائی آستانِ شعر تک کبھی نہ ہو گی اس سے ہماری شاعری پر کئی راہیں مسدود ہو گئی ہیں۔ جنہیں کھولنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ نہ معلوم فارسی اور عربی کتب کب تک ہماری شاعری کو اپنے کندھے پر اٹھائے پھریں گی اور وہ دن کب آئے گا۔ جب ہمارے شعراء اپنی زبان کو نوازیں گے اور قیام پاکستان کے بعد کہ وہ لوگ جن کی مادری زبان اردو ہے اگر پاکستان میں ہیں تو اقلیت میں ہیں اور اگر ہندوستان میں ہیں تو ان سے رشتہ ٹوٹ چکا۔ نہ معلوم "ہماری اپنی زبان" آئندہ کیا شکل اختیار کرے گی۔ خیر میں ایک آپ ہی کو ہدف کیوں بنالوں اس حمام میں ہم سبھی ننگے ہیں۔ غنیمت بلکہ شکر ہے کہ آپ پڑھنے والوں کو محض بوجھوں تو نہیں مارتے بلکہ جہاں بے اعتدالی بھی کرتے ہیں۔ وہاں بھی خون کو گرما ہی دیتے ہیں۔ چنانچہ مجھے آپ کے "دار پوش" اور "دلاک" اور "لباس کبودی" اور "لہستان" اور "کور وادی"۔ واللہ سب گوارا ہیں بلکہ میں آپ کی قوت کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے بڑے کونے کافی الفاظ کو بھی ایسا مطیع کر لیا ہے کہ خانہ زاد معلوم ہوتے ہیں آپ جب بھی انہیں بلائیں حاضر ہو جاتے ہیں اور ہر خدمت بجا لاتے ہیں ——

شکر اور قہوے کے مغلوفِ انبان

جو بازار میں انتہائی گراں تھے۔

اس لئے گوارا ہے کہ انہی بلند آہنگوں کی بدولت آپ یہ بھی عطا فرما سکتے ہیں ——

منو کے آئین کا ظلم سہتے ہوئے ہریجن
کہ جن کا سایہ بھی برہمن کے لئے
ہے دزدِ شبِ زمستاں
وہ سوچتے ہیں
کہیں یہ ممکن ہے
بیچ ڈالے گا
ہم کو بردہ فروشِ افرنگ
اب اسی برہمن کے ہاتھوں
کہ جس کے صدیوں پرانے سیسے سے
آج بھی کورد کر ہیں ہم سب
جو اب بھی چاہے
تو روک لے ہم سے نورِ عرفاں

ایسے شعروں سے محروم رہ جانا کسے منظور ہوگا۔

باقی رہی شدت تو اس کی رمق آپ میں آغاز ہی سے پائی جاتی ہے اس کے لئے ہماری تنقیدی زبان میں کوئی مناسب لفظ نہیں ملتا۔ سیاق وسباق کے اعتبار سے کبھی اسے جوش کہہ لیتے ہیں کبھی جذبہ۔ لیکن مجھے تلاش ایسے لفظ کی ہے جس میں جوش اور جذبے کے علاوہ کچھ درشتی بھی پائی جاتی جیسے کوئی کسی سے انتقام لے رہا ہو۔ جب شدت اس حد تک پہنچے تو مزا کچھ تلخ ہو جاتا ہے۔ شاعری اپنی ہی کیاریوں کو روند ڈالتا ہے جیسے بچہ ضد میں آکر چیزیں توڑ ڈالے۔ شروع شروع میں یہ منہ زوری غالباً آپ کے شباب کا تقاضا تھی اور چونکہ ہمارے بیشتر جدید شعراء جوان ہیں یا جوانی کے دنوں میں

انہوں نے نام پیدا کیا اور علاوہ بریں آزادی (سیاسی یا معاشی یا فنی) کی پیاس سے ہمیشہ ان پر ایک اضطراب طاری رہتا ہے اس لئے اس معاملے میں آپ تنہا نہیں مگر آپ کی محبوب نظمیں وہی ہیں جن میں اس شدت پر شاعری غالب آئی اور اسے اپنے پیمانے سے بڑھنے نہ دیا۔ مثلاً میں سمجھتا ہوں کہ تہمت میں آپ اس شدت پر وہ قابو نہ پا سکے جن کا "درویش" اور "نیل کے سوداگر" میں قائل ہونا پڑتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی شاعری پختگی کے اس درجہ تک جا پہنچی ہے۔ جہاں درشتی سے آپ کا قلم نا آشنا ہوا جاتا ہے "درویش" اور "سوداگر" جیسی نظمیں دیر تک دلوں میں گونجتی رہیں گی کیونکہ کنایہ جو شاعری کی جان ہے ان نظموں میں باوجود جوش اور جذبے کے شدت کے ہاتھوں کند ہونے نہیں پایا۔

مرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو
مرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو
کہ دیکھی ہیں میں نے ہمالہ والوند کی چوٹیوں پر شعاعیں

یہ معنی کی دو تین تہیں ہیں جنہیں شاعر نے جیسے بے ساختگی کے ساتھ دو تین مصرعوں میں لپیٹ کے رکھ دیا ہے اور "درویش" کا یہ پارہ بھی آپ کو یاد ہوگا ——

یہ درویش
جن کے اب وجد
وہ صحرا کے دیواز کی ریت پر
تھک کے مرجانے والے
اسی کی طرح تھے
تہی دست اور خاکِ تیرہ میں غلطاں
جو تسلیم کو بے نیازی بنا کہ

ہمیشہ کی محرومیوں ہی کو اپنے لئے
بال و پر جانتے تھے
جنہیں بھی فروغِ گدائی کی خاطر
جلال شہی کی بقا بھی گوارا
جو لاشوں میں چلتے تھے
کہتے تھے لاشوں سے
"سوتے رہو
صبحِ فردا کہیں بھی نہیں ہے"
وہ جن کے لئے حریت کی نہایت یہی تھی
کہ شاہوں کا اظہارِ شاہنشہی حد سے بڑھنے نہ پائے
بھلا حد کی کس کو خبر ہے؟

"لاشوں" کا ذکر آیا تو میں نے سمجھا کہ آپ پھر بپھرنے لگے۔ نہ معلوم کیا درشت کلامی کریں گے لیکن ضبط ہاتھ سے نہ چھوٹا اور آخری جملے نے اپنی ملائمت سے وہ تاثیر پیدا کی جو شدت سے نہ ہو سکتا۔ اس مجموعے میں "درویش" کیا بہ اعتبار لغت اور کیا بہ اعتبار واردات قلب اور مزاج شاعری کے حاصل کلام ہے۔

آپ نے بجا فرمایا کہ

"بعض قطعے محض منظوم مختصر افسانہ ہیں جن میں زیادہ زور کسی تصویر کشی پر ہے یا کسی واقعے کو بیان کرنا ہے تاکہ اس سے وہ تاثر پیدا ہو سکے جو شاعر کے دل پر ہوا تھا۔ بعض نظموں کی حیثیت اسکیچ یا انکارے کی سی ہے بعض خود کلامی سے زیادہ نہیں۔"

یہ ہمہ گیری بھی جدید شاعری کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ آپ نے اس نئے اسلوب کو جن

کے آپ بانیوں میں سے ہیں ہر طرح آزمایا ہے جس کی مثالیں اس مجموعہ میں جا بجا پائی جاتی ہیں آپ نے مکالمے کو جس بے تکلفی سے اپنی نظموں میں نبھایا ہے وہ یقیناً پڑھنے والوں کی نظر سے چھپی نہ رہے گی۔ ہماری شاعری میں داستان گوئی نئی چیز نہیں اور جہاں داستان یا افسانہ ہو وہاں مکالمے سے مفر نہیں۔ لیکن قدما کے مکالمے الف بے الف بے .... کی ترتیب سے سیدھی سڑک پر ڈھکتے چلے جاتے تھے —

ایک لڑکی بگھارتی تھی دال
دال کرتی تھی عرض یوں احوال

وقس علیٰ ہذا۔ لیکن جدید شاعری میں مکالمہ ایک پیچدار معاملہ ہے جہاں متکلم کے جذبات کے ساتھ لہجے کا نشیب و فراز، شاعر کے خیالات، کرداروں کی آپس میں الجھن سب کو ایک ساتھ بننا پڑتا ہے۔ یہ وہ آپ کو اس مجموعے میں جا بجا پیش آئی اور آپ نے اسے جا بجا چابک دستی سے سر کیا ہے۔ آپ وسعتِ مضامین میں قدرتی مناظر کا ذکر کرنا بھول گئے۔ حالانکہ یہ خوبی آپ کی نظموں میں بہت نمایاں ہے —

زمستاں کے دن تھے
لگاتار ہوتی رہی تھی سرِ شام سے برف باری
دریچے کے باہر سپیدے کے انبار سے لگ گئے تھے۔
مگر برف کا رقص پیہم تھا جاری

......

مگر رات ہوتے ہی چاروں طرف بے کراں خامشی چھا گئی
خیاباں کے دو رویہ سرو و صنوبر کی شاخوں پہ
یخ کے گلولے پرندے سے بن کر لٹکنے لگے تھے
زمیں ان کے بکھرے ہوئے بال و پر سے

کف آلود ساحل سا بنتی چلی جا رہی تھی

ہماری شاعری ـــــ

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی

بن گیا روئے آب پہ کائی!

سے کتنی دور نکل گئی ہے۔

آپ نے یاد دلایا کہ آپ کی نظمیں قسم قسم کے نقوش کا مجموعہ ہیں تو لامحالہ براؤننگ یاد آیا۔ اس کی نظموں میں بھی افسانے، اسکیچ، خود کلامی، مکالمے کہانیاں غرضیکہ ایک فراوانی پائی جاتی ہے اسے بھی وہی مشکلات پیش آئی تھیں جو غالباً آپ کو بھی پیش آئی ہوں گی اس کے کلام کو بھی بعض اوقات ایسا اختصار اختیار کرنا پڑتا تھا کہ معنی کا سمجھنا قدرے مشکل ہو جاتا ہے لیکن اس کی قوتِ تخلیق بھی ایسی تھی کہ ابلتے چشمے کے پانی کی طرح ہر چھوٹے پتھر کو درانہ دھکیلتی چلی جاتی تھی۔

نیویارک

۵؍ اکتوبر ۱۹۵۵ء

"پطرس"

نغمہ زار

ابوالاثر حفیظ جالندھری کی کتاب کا دیباچہ

جالندھر کے نغمہ پرور شہر نے حفیظ نامی ایک ساحر پیدا کیا ہے جو کچھ عرصہ سے لاہور کے مشاعروں اور ہندوستان کے ادبی حلقوں کو مبہوت کر رہا ہے جس کے قلم کی ایک بے پروا جنبش سے موسیقی کی روح کانپ کر بیدار ہو جاتی ہے۔ قدرت کی رنگینیاں تصویریں بن بن کر آنکھوں کے سامنے آتی ہیں اور غائب ہو جاتی ہیں اور لطافت اور نزاکت شاعری کا جھلملاتا ہوا لباس پہن کر رقص کرنے لگ جاتی ہیں۔

ساون رُت، گھنگھور گھٹاؤں میں کھیلتی ہوئی بجلی، موروں کی جھنکار، پپیہوں کی جھنکار پپیہوں کی پکار، برسات کی ٹھنڈی ہوا، ہواؤں میں اڑتے ہوئے آنچل، آنکھوں میں تمنائے دید اور فراق کے آنسو، دل کو انتظار کی دھڑکن، یہ ایک مستِ کیف شاعر کی وہ دنیا ہے جس میں حفیظ گاتا پھرتا ہے۔ جب اس کا دل بھر آتا ہے۔ تو وہ آنسو بہا دیتا ہے، جب اس کے دل میں ایک ہوک اٹھتی ہے تو وہ اونچے سروں میں الاپتا ہے اور سننے والوں کا کلیجہ مسل دیتا ہے۔

یہ اس کے کلام کا مجموعہ ہے۔ چند ورق ہیں۔ خشک طبیعتوں کو جا بجا اس میں "فن" کے نقائص اور بے عنائیاں نظر آئیں گی۔ اہلِ ذوق دیکھیں گے اور جانیں گے کہ ایک وارفتہ عاشق مزاج عشق کے اتاہ سمندر میں خود بھی کس طرح ڈگمگاتا ہے اور دوسروں کے دل بھی کس طرح ہلاتا ہے۔ حفیظ ایک ایسا شاعر ہے جس کے قدم پامال رستے سے ادھر اُدھر جا پڑتے

ہیں۔ لیکن یہ ایک راہ گم کردہ کی آوارگی نہیں۔ ایک مست کی لغزشیں ہیں۔ نشے میں چور، کیف میں سرشار جو پیتا ہے اور پلاتا بھی ہے۔ پیالے میں بھی بھر کر دیتا ہے اور یوں بھی لنڈھاتا ہے۔ ایک آزاد جوگا تا ہے اور الفاظ اس کی زبان پر مچلتے ہیں۔

ہمارے شاعر برسوں سے ترک شیرازی پرست ہیں۔ ایک ایسی شراب طہور سے بے خود ہونے کا بہانہ کر رہے ہیں جو نہ خود پی سکتے ہیں نہ اوروں کو پلا سکتے ہیں۔ شاعری ایک فریب ہے لیکن اس تصنع کا کیا نام ہے جو کسی کو دھوکہ نہ دے سکے؟

حفیظ کی نظر ہندوستان کی دلہن پر ہے اور وہ اس جھلک پر فدا ہے جو باریک آنچل میں سے دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ابھی وہ ترک شیرازی کی غلامی سے بالکل آزاد نہیں ہوا اور اس کو کنکھیوں سے کبھی کبھی دیکھ لیتا ہے۔ یہ بے وفائی آخر کب تک؟ عاشق کہ نظر باز؟

۱۹۲۵ء
"پطرس"

نقشِ گم گشتگی

شدی تا باعثِ آرام جاں آرام جاں گم شد
حدیثِ نام تو بر زباں آمد زباں گم شد

مپرس از جستجو و نارسائی ہائے مجنونے
چو آوازِ جرس ہر سُود دیدو ہر زباں گم شد

نشانِ سجدہ ام اہلِ نظر را آستاں باشد
کہ زیرِ سجدہ ہائے شوق من آستاں گم شد

مرا جز خامشی محرم نبود و وائے ناکامی
بہ اظہار سخن چوں لب کشودم رازداں گم شد

نگہ آوارگی آرد سوئے منزل بخاری را
کہ از گمراہی خودہم زراہ گمرہاں گم شد

مخزن۔ نومبر، دسمبر ۱۹۲۱ء

غزل

هم آں داغے که بر دل از تو دارم حرزِ جانم شد
هم آں چشمے که نامندش سخنگو رازدارم شد

دلے بود و در آغوشم نگنجید و جهانم شد
خیالے داشتم از سرگزشت و آسمانم شد

بپرس اے داورِ محشر چه مے پرسی نمی پرسی
نگاهِ حسرت آلایم که مے بینی بیانم شد

نگه دزدیده افگندی بدل چوں رازِ جاں دارم
نظر کردی به بیباکی و فصلِ داستانم شد

دگر قدحِ جنوں در ده که هم در منزلِ اول
خیالِ وحشتم وا ماند و گردِ کاروانم شد

هزار داستان، ستمبر ۱۹[illegible]

فرمودهٔ پطرس

اے حسنِ تو زیادہ تماشا کنم ترا
محرم من [illegible] یادِ تمنّا کنم ترا
بر هستم نظر بحسنِ من ناکرده کاندرو
گر بے تماشے بودنے بے جا کنم ترا

به نسبتم چه تسلی به نگاہے چه قرار
لشکرِ آرزوئے از لبم انگیختنه
بر سرِ خاکِ من تشنه لبے ریخته باد
قطرهٔ مے که تو از لغزشِ پا ریخته

وراثہ

یہ میں نے کہہ تو دیا تجھ سے عشق ہے مجھ کو
ترا ہی درد میری آوارگی کا محور ہے
تجھی سے رات کی مستی تجھی سے دن کا خمار
تجھی سے میری رگ و پے میں زہرِ احمر ہے
تجھی کو میں نے دیا اختیار گریے پر
یہ چشم خشک اگر ہے۔ یہ چشم اگر تر ہے
ترا ہی جسم چمن ہے ترا ہی جسم بہار
تری ہی زلف سے ہر آرزو معطر ہے
ترا ہی حسن ہے فطرت کا آخری شاہکار
کہ جو ادا ہے وہ تیری ادا سے کمتر ہے
یہ میں نے کہہ تو دیا تجھ سے عشق ہے لیکن
مرے بیان میں اک لرزشِ خفی بھی ہے
تو میرے دعوئے الفت کی آن پر مت جا
کہ اس میں ایک ندامت دبی دبی بھی ہے
وفا طلب ہے ترا عشق اور مرے دل میں
تری لگن کے سوا اور بے کلی بھی ہے
تجھی سے دل کا تلاطم ہے اور نگہ کا قرار
اسی قرار و تلاطم سے زندگی بھی ہے
مگر ہیں اور بھی طوفان اس زمانے میں
کہ جن میں عشق کی ناؤ شکستنی بھی ہے
مری نگاہ کے ایسے بھی ہوں گے چند انداز
کہ تو کہے کہ یہ محرم ہے اجنبی بھی ہے
شبِ وصال کے اس مخملیں اندھیرے میں
مری تلاش میں فردا کی روشنی بھی ہے
مجھے تو آکے ملی وقت کے دوراہے پر
کہ صبحِ زیست بھی ہے۔ موت کی گھڑی بھی ہے

میکدے میں

جو تو کہے تو کسی میکدے میں چل بیٹھیں
جو دل کی بات ہے دل میں وہ دل کی بات کریں

بس خم کے سائے میں سرگوشیاں کچھ ایسی
کہ تیرے لب مری ہر بات کو نبات کریں

جو بے ثبات ہے دنیا تو بے ثبات سہی
فریبِ مے سے اسے اور بے ثبات کریں

اگر منارۂ کسریٰ پہ دن نکل آئے
تو چشم وا نہ کریں اور دن کو رات کریں

(سویرا)

دو شعر

اُٹھ گیا اپنے یہاں سے ٹیلی فون
اب کہیں جا کے ملے گا اگلی جون

اس کے ہونے سے رہا کرتی تھی بیچ
یہ چمن یونہی رہے گا اور ——— الخ

یہ دو شعر پطرس نے شملہ سے (حکومت ہند کے دیگر دفاتر کے واپسی کوچ کے ساتھ) رخصت ہوتے ہوئے کہے تھے۔ چونکہ ہر دو معنی کی رعایت بھی خوب ہے لیکن الخ کا قافیہ یوں اور کون لا سکتا ہے۔

دہلی کی سیر

ایک چھوٹا سا لڑکا الہ آباد کا
اپنے گھر سے چلا اور دہلی گیا

واں جو پہنچا تو دیکھا
کہ اس جا کے لڑکے ہیں ویسے ہی ننھے
اور اس جا کے گنّے ہیں ویسے ہی لمبے
اور اس جا کی برفی ہے ویسی ہی میٹھی
اور اس جا کی بلّی ہے ویسی ہی موٹی
اور اس جا کی چڑیاں ہیں ویسی ہی چھوٹی
اور اس جا کے چالیس ہیں بیس اور بیس
اس نے یہ کچھ جو دیکھا
تو حیراں ہوا اور تکتا رہا
اور تکتا رہا اور حیراں ہوا

(پھول)